براہِ راست

بشریٰ رحمٰن

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اِٹلی اٹل ہے

لیونارڈی وِنچی ایئرپورٹ کے اندر ہم یوں مٹرگشت کر رہے تھے جیسے.....
"اک کُونج وچھڑ کے ڈاروں تے لبھ دی سجناں نوں۔۔"

یکایک ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم اکیلے مٹرگشت نہیں کر رہے، ہمارے ساتھ ایک سایہ بھی ہے.... بات یوں ہوئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم روم کے اِس بین الاقوامی ہوائی اڈے پر عید کے چاند کی طرح طلوع ہوئے تھے۔ وارد ہونا ہمارا بالکل "امریکن ایکسپریس" والوں کے کھاتے میں جا رہا تھا۔ لاہور چھوڑنے سے پہلے اِن کے ساتھ طے ہوا تھا کہ وہ سعودی عرب سے ہماری بکنگ "السعودیہ" میں کر دیں گے۔ ٹرانزٹ میں جب جدّہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو پتہ چلا.... آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق انھوں نے ایسی ذمہ دارانہ حرکت ہرگز نہیں کی تھی۔ السعودیہ ائرلائن کا طیارہ پیرس کے لیے پرواز کر چکا تھا اور ہم چراغِ رُخِ زیبا لے کر اسے اِدھر اُدھر تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ پھر حسبِ توفیق ہر ائرلائن کے دروازے پر دستک دی اور دست سوال دراز کیا.... بالآخر الطالیہ کو ہماری غریب الوطنی پر ترس آگیا اور اس نے ازراہِ مروّت ہمیں روم تک پہنچانا گوارا کر لیا اور صاف کہہ دیا کہ...." آگے آپ

کے نصیب“

نصیب کے ہم دھنی تو ہیں۔ مگر روم جانا ہمارے پروگرام میں کہیں درج نہیں تھا۔ دانہ پانی اور الاطالیہ ایر لائن ہمیں وہاں لیے جاتے تھے... اور ہم اُف بھی نہ کر سکتے تھے۔

سفر صعوبت کا نام ہے اور صعوبت ایک تجربہ ہے۔ انجام کار جس کا مستقل عنوان خوش گوار ماضی بن جاتا ہے۔ ہم اللہ کا نام لے کر الاطالیہ میں سوار ہو گئے... جہاز میں بیٹھے تو مختلف اندیشوں کے باعث بھوک اُڑ چکی تھی۔ کم و بیش جہازوں کا اندرونی ماحول ایک سا ہوتا ہے۔ وہی تنبیہیں، وہی تائیدیں بناوٹی مسکراہٹیں اور خریدشدہ نوازشیں البتہ ایئر ہوسٹس نہ صرف صحت مند تھی بلکہ خوب صورت بھی تھی۔ ہر ملک کی ایئر ہوسٹس درپردہ اس ملک کی نمایندہ خاتون ہوتی ہے۔ ہمیں سُنے سنائے قصّوں پر یقین کرنا پڑا کہ اٹلی کی عورت بلا ہوتی ہے۔ گورے شہابی رنگ پہ کالے گیسوؤں کے سائے اور کالی پلکوں کے سائبان واقعی خرمن ہستی پھونک سکتی تھی۔ لیکن وہ ایمان شکن جب پھلوں کی ٹوکری اٹھا کر لائی تو بے اختیار مُنہ سے واہ نکل گئی۔ یوں تو دیدہ زیب باسکٹ میں سارے پھل اتنے خوش نما اور صحت مند نظر آ رہے تھے جیسے اصلی نہ ہوں بلکہ ان کی تصویریں ہوں مگر آڑو نے ہمارا دل لوٹ لیا۔ ایئر ہوسٹس کی مانند خوش شکل اور رس سے بھرا بھرا تھا۔ رنگت ایسی جیسے اُنگلی ڈبونے سے خون نکل آئے گا۔

تھوڑی دیر کے لیے ہمیں خیال ضرور آیا کہ ایئر ہوسٹسوں کے معاملے میں کیا پی آئی اے کے اربابِ اقتدار کی نظر کمزور ہے۔ حالانکہ ہمارا ملک اللہ کے فضل سے نسوانی حُسن میں خود کفیل ہے۔ ایک بار ہم نے یہ سوال کسی ہوائی دانشور سے کیا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر ہماری زبان بند کر دی تھی کہ ایسی سب بھرتیاں سفارشات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بھئی ہمیں

گہرائی میں جانے کی کیا ضرورت ہے....

ہم خوش ذوق مسافر ہیں۔ بس ذرا کی ذرا بانکی بی بی کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہیں....

دوپہر کے بارہ بجے ہم روم پہنچ چکے تھے مگر ہمیں علم نہ تھا کہ ہماری اگلی منزل کون سی ہوگی۔ قاعدے کی رُو سے آج ہمیں پیرس جانا تھا۔ ہمارے لیے وہاں ہوٹل میں بکنگ ہو چکی تھی۔ اسی لیے روم کے ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی پھر سوالی بن گئے۔ مختلف ہوائی کمپنیوں کے گھروندوں کے آگے کھڑے ہو کر صدا لگائی: ؎

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
”اب فقیروں کو رخصت کرو اور دُعائیں لو....“

یہ ذرا سی بات معلوم کرنے کے لیے ایئر پورٹ کے اندر اتنا چلنا پڑا کہ پاؤں جلنے لگے.... بالآخر الاطالیہ نے ہی دوبارہ یہ اعزاز حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہمیں نوید دی کہ اڑھائی بجے والی فلائٹ سے وہ ہمیں پیرس پہنچا دیں گے۔

جزاک اللہ..... کہہ کر باہر نکلے تو پہلی بار احساس ہوا شدید بھوک لگی ہے... انجان بنے پردیسیوں کی طرح مارے مارے پھر رہے تھے۔ معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ دو گھنٹے تو صرف ایئر پورٹ کی حدود سے باہر نکلنے میں لگ جائیں گے۔ چنانچہ ہم نے ایک بصیرت افروز فیصلہ کیا.... کہ آج ہم ایئر پورٹ کی عمارت کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اپنی قوتِ باصرہ اور قوتِ مشاہدہ کو کام میں لاتے ہیں اور ایئر پورٹ کی گول عمارت کو جامِ جم بنا کر پورا روم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کوشش کرنے میں ہم بہت تیز ہیں۔
اِس سے پہلے چندرے پیٹ کی آگ بجھانا ضروری تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایک ریستوران سے پنیر کا سینڈوچ اور کوکا کولا خریدا.... یاد رہے کہ یہ سینڈوچ برگر میکڈانلڈ اور کوکا کولا عالمگیر علتیں ہیں۔ ہر زمین پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ الحمدللہ کہ اب پاکستان میں بھی برگر کھانے کا رواج زور پکڑ رہا ہے۔

سینڈوچ منہ میں ڈالا تو یوں لگا لکس صابن کی ٹکیہ دانتوں تلے آ گئی۔ اس وقت ہمیں اپنے ملکی ٹی وی پر چلنے والا لکس صابن کا اشتہار بے طرح یاد آنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ بے شمار حسینائیں بھی جو آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر کی طرح باری باری "میرے حسن کا سنگھار لکس ٹائیلٹ سوپ" کہہ کر حافظے سے ہٹ گئی تھیں مجبوراً ادھر اُدھر دیکھ کر کوڑے کا ڈرم ڈھونڈا۔ ہم دوسرے ملکوں میں جاتے ہی انتہائی مہذب بن جاتے ہیں۔ گندگی اِدھر اُدھر نہیں پھیلاتے۔ دکان کا دروازہ نزاکت سے کھول کے خود ہی آہستہ سے بند کر دیتے ہیں۔ راستہ مانگنے کے لیے بے اختیار ایکسکیوزمی کہہ دیتے ہیں۔ کسی کو انجانے میں کہنی لگ جائے تو "آئی ایم سوری" کہنے سے گریز نہیں کرتے اور خوش ادا سیلز گرل سے پیکٹ لیتے وقت تھینک یو کہنا نہیں بھولتے۔

ڈرم ڈھونڈ کے اس میں سینڈوچ ڈال دیا اور کوک منہ سے لگا لیا۔ اسی وقت ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ ایک سایہ سا ہمارے پیچھے ہے۔ جیمز بانڈ کی طرح اچانک گھوم کر دیکھا تو وہ ایک اطالوی بزرگ تھے۔ بزرگ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے وجود کی عمارت ستر سال پرانی لگتی تھی۔ سر کے بال کم گرے کھردرے اور کھڑے کھڑے تھے آنکھیں کثرتِ استعمال سے سکڑ کر مختصر ہو چکی تھیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو وہ مسکرائے۔ مسکراتے وقت ان کی ایک آنکھ آپ ہی آپ بند ہو گئی۔ ہمیں ان پر بڑا ترس آیا۔ اس عمر میں واقعی بینائی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

ہم نے سوچا یوں آوارگی کرنے سے وقت نہیں گزرے گا۔ ذرا ڈیوٹی فری قسم کی دکانوں پر چلتے ہیں اور اپنی صنف کی لاج رکھتے ہوئے کوئی چیز خرید کر لے چلتے ہیں۔

جو لوگوں کو یہ کہہ کر عمر بھر دکھاتے رہیں گے کہ "ہم نے روم سے خریدی تھی" اور کون مائی کا لال پوچھنے والا ہے کہ بھئی آپ نے روم میں کتنا عرصہ قیام کیا تھا...."

جب دو کانوں پر جا کر قیمتیں پوچھیں تو.... ساقی کے ہوش اُڑ گئے۔

اٹلی کے جوتے ہمیں بہت پسند ہیں۔ اطالوی عورتوں کی طرح نازک سبک پتلی کمروں اور لمبی گردنوں والے.... ہم نے جوتوں کی ایک دکان پر رک کر صراحی دار سر اپے والی خواتین سے ان کی قیمت پوچھی تو ان میں سے ایک نوکیلی نوک نے ہمیں قیمت بتا کر اس طرح سر سے لے کر پیر تک دیکھا جیسے کہہ رہی ہو:

"آپ تو ایک جوتا بھی نہیں سہہ سکتیں۔"

ہم کو بہر حال قیمتیں پوچھ کر مڑنا تھا۔ مڑتے ہی پھر کسی سے ٹکرا گئے۔

وہی اطالوی بزرگ پیچھے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں پھڑک رہی تھیں۔ اور چہرے کے سارے نقوش تھرتھرا رہے تھے۔ ہاں ضعیفی میں رعشہ بھی تو ہو جاتا ہے۔

سوچا چل کے جہاز کی آمد کا پتہ کرتے ہیں۔ انکوائری سے پتہ چلا کہ ہمارا جہاز مزید دو گھنٹے لیٹ ہو گیا ہے۔ خوشی تو ہوئی کہ یہ ادائے بے نیازی صرف پی آئی اے کا وطیرہ ہی نہیں۔ اور بھی ہوائی کمپنیاں اس کا شکار ہیں۔ رنج اس بات کا ہوا کہ مزید دو گھنٹے کیسے گزریں گے۔ ہوائی اڈہ نوردی تو ہم پہلے دو گھنٹوں میں کر چکے تھے۔ سر پکڑ کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ آج صبح سے غیر متوقع واقعات پیش آ رہے تھے۔ پتہ نہیں اب قسمت کو کیا منظور تھا؟

بین الاقوامی ہوائی اڈوں کے اندر ایک مکمل دنیا ہوتی ہے۔ یوں تو یہاں ہر شخص پابہ رکاب ہوتا ہے۔ مگر بظاہر یوں لگتا ہے وہ یہاں زندگی گزارنے آیا ہے۔ بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد اس کے چہرے پر اطمینان کا اُجالا پھیل جاتا ہے۔ پھر مزے سے کسی سجے سجائے لاؤنج یا ریستوران میں جا بیٹھتا ہے۔ کھاتا ہے۔ پیتا ہے۔ اس دُنیا میں پینے کی مکمل آزادی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہوتی ہے اور میخانوں کے در ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ ڈیوٹی فری قسم کی فریب دہ دکانوں کے فریب کھائے یا آنے جانے والوں کو مسلسل گھورتا رہے۔

کشتگانِ روزگار کے پڑاؤ ہوتے ہیں یہ بین الاقوامی ہوائی اڈے۔

پچھلی دنیا سے ان کا رابطہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور اگلی دنیا کے بارے میں ساری سردردی وہ فرشتوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پچھلی دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان یہ ہوائی اڈے "برزخ" کا کام کرتے ہیں۔ سامنے دیکھا۔ ایک سارنگی کی شکل کی گوری اپنا گول مٹول کتّا لیے اندر آگئی تھی گویا اس ایئرپورٹ پر کتوں کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔ لوگ گوری کو کم اور اس کے پھولے پھولے کتے کو زیادہ دیکھ رہے تھے۔ مگر جونہی گوری کا گورا عاشق اچانک نمودار ہو کر ہم گلو ہوا، بلکہ ہم دہن ہوا تو کمزور دل کتے سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ جوشِ رقابت میں اچھل اچھل کر غرّانے لگا اور مچل مچل کر بھونکنے لگا۔ خواہ مخواہ ساری بزم اس جوڑی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

کہیں یہ بھی پبلسٹی سٹنٹ تو نہیں؟ ہم نے ایک لمحے کو سوچا اور کتے کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا او کتے کمینے! انسانوں والی تھڑدلی مت دکھا اور کتوں کی وفا کو بدنام نہ کر۔ عاشق تو زندگی میں کئی آتے جاتے ہیں مگر کتا ایک ہی ملتا ہے۔"

جنھوں کا عشق صادق ہے وہ کب فریاد کرتے ہیں

مگر اس کشتۂ ستم نے ہماری نصیحت پر بالکل کان نہیں دھرا۔ بالآخر طالب و مطلوب زنجبیری بنے ایک ریستوران کے اندر داخل ہو گئے۔ اور کتا رقیب روسیاہ بنا کہ منہ بھی اس کا کالا تھا، گالی گلوچ کرتا ہوا ان کے پیچھے ریستوران میں چلا گیا۔ اتنے میں ایک اور صاحب تشریف لائے۔ لیجیے انھوں نے اپنی دُلہن کی پالکی اٹھا رکھی ہے۔ خوب صورت ریشمی جھالروں والی ٹوکری میں سفید دہن اور کالے کانوں والی کتیا یوں بیٹھی ہے جیسے گوری ناری ساجن کے دل میں جا بیٹھتی ہے۔ بنجدا کتوں پر بے تحاشا رشک آنے لگا۔ دھیرے دھیرے لوگ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف آنے لگے۔ غالباً کسی پرواز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ پرواز سے

کچھ دیر پہلے خلقت اِس طرح ڈیپارچر لاؤنج میں اکٹھا ہونا شروع ہو جاتی ہے جیسے برسات کے موسم میں بتیاں جلتے ہی پتنگے آجاتے ہیں۔ ابھی ہم صوفے پر بیٹھے بے ثباتیِ جہاں پر غور فرما رہے تھے کہ ایک گرم جوش سی ہیلو نے ہمیں چونکا دیا "کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟" وہی اطالوی حضرت کھڑے بڑی اپنائیت سے پوچھ رہے تھے۔

"ضرور۔ ضرور" ہم نے انکساری سے کہا اور کھسک کر ذرا پرے ہو گئے۔ مرزا حادث بیگ کہا کرتے تھے۔ ضعیف العمر مرد بے ضرر مخلوق ہوتی ہے۔ کھسکنا تو بس عادتاً ہو گیا۔ وہ اس طرح بیٹھے جیسے کہہ رہے ہوں۔ کیا ضرورت تھی دُور جانے کی؟ بیٹھ کر مسکراتے اور بولے:

"آپ بھی غالباً اسی فلائٹ سے پیرس جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں!" ہم نے ایشیائی نیاز مندی سے کہا۔

پھر شرارت کی سُرخی اپنی جھرّیوں میں سمو کر بولے۔

"یہ جہاز کہیں آپ کی وجہ سے تو لیٹ نہیں ہوا؟" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی بائیں آنکھ بند کر لی۔

"کیا مطلب؟" ہماری ازلی بدحواسی ہمارے چہرے پر عیاں ہو گئی اور ہم ان کی اس آنکھ کو بغور دیکھنے لگے جو ذرا دیر کو بند ہوئی تھی۔

وہ پھڑ پھڑا کر ہنسنے لگے۔ پھر اپنے ایک ایک عضو کو حرکت میں لا کر اطالویوں کے مخصوص انداز میں بولے۔

"سنا ہے یہ جہاز "لائٹنگ سٹرائیک" کی وجہ سے لیٹ ہوا ہے۔ مگر دو گھنٹے کی یہ سٹرائیک محض ایک بہانہ ہے۔"

"کیسا بہانہ؟"

"آپ کو یہاں روک لینے کا بہانہ۔ ہم اطالوی بڑے خوش ذوق ہیں۔" انھوں نے اب دوسری آنکھ بند کی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ اس بات کا کیا جواب دینا چاہیے۔ اس لیے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

زیرِ لب مسکرا کر رہ گئے۔ وہ منتظر رہے۔ پھر خود ہی کہنے لگے :

"آپ کے ملک کی خواتین صرف مسکراتی ہیں یا بات بھی کرتی ہیں ؟"

"انھوں نے جتنی باتیں کرنی ہوں وہ شادی سے پہلے کر لیتی ہیں "

"اور شادی کے بعد....

سہتی ہیں اور مسکراتی ہیں....

خیر مسکرانا بھی صحت کے لیے اچھا ہے "۔

انھوں نے دل کھول کر قہقہے لگائے پھر اپنی آنکھیں ہاتھوں سے صاف کر کے گویا ہوئے "آئیں نا ؟ کسی ریستوران میں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے ہیں "

ہم پاکستانی خواتین عمر بھر جس بات سے اجتناب کرتی ہیں۔ وہ کسی نامحرم کے ساتھ کسی ریستوران یا ہوٹل میں جانا ہے۔ حالانکہ یہاں تو کوئی جاننے یا نام دھرنے والا نہیں تھا مگر ہم نے بڑی شائستگی سے انکار کر دیا۔ وہ کھڑے ہو گئے اور اپنے چہرے کا ایک ایک نقش ہلا کر بولے۔

"یہیں بیٹھی رہیئے گا۔ میں دوبارہ ضرور آؤں گا۔"

اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرزا حوادث بیگ کو، وہ مردوں کی اقسام اس طرح بیان کیا کرتے تھے۔

عیار مرد ـــــ ایسے مرد ہمیشہ اپنے اوپر شرافت اور کم سخنی کا ماسک چڑھائے رہتے ہیں۔ اُن کے متعلق پاس پڑوس اور رشتے برادری میں یہ مشہور ہو جاتا ہے۔ کہ "بڑا بیبا منڈا اے۔ شرماں تے کرماں والا اے۔ ست دیہاں جیہا اِک پُتر اے"۔

(بڑا شریف اور شرم و حیا والا لڑکا ہے۔ سات لڑکیوں جیسا ایک لڑکا ہے)

لیکن الاماں کارگزاری کا پتہ نہیں لگنے دیتے۔

"بے مہار مرد" ـــــ ان کا کام اوائل نوجوانی سے ہی ہر خاتون کے پیچھے دُور تک جانا ہوتا ہے۔ یہ چاہتے ہیں۔ بھیڑ، ہنگامہ یا شادی بیاہ کا فائدہ اُٹھا کے کسی خاتون کو صرف ہاتھ لگا لیں۔ خواہ ہاتھ کچھ نہ آئے"۔

"طرحدار مرد" ـــــ سنگھار کے شوقین ہوتے ہیں۔ اچھا لباس پہنتے ہیں۔ امپورٹڈ سگریٹ پیتے ہیں۔ مہنگی موٹر کی مچان پر بیٹھ کر عورت کا شکار کرتے ہیں۔

"مُردار مرد" ـــــ انہیں رشتوں ناطوں کا احترام نہیں ہوتا۔ دوست کی بیٹی ہمسائے کی لڑکی، شاگرد، دُور پار کی بھانجی بھتیجی، آیا ـــــ نوکرانی سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔

"بیمار مرد" ـــــ مردوں کی یہ قسم بڑی بدبُو دار ہوتی ہے۔ عورت کا صرف ایک ہی مصرف سمجھتے ہیں۔

"لالہ زار مرد" ـــــ یہ طبعاً معصوم ہوتے ہیں۔ بس ارد گرد کسی جوان عورت کو دیکھ کر کھل اٹھتے ہیں۔ جوان عورت کو سامنے بٹھا کر ان سے کچھ بھی منوا لیں۔

"وفادار مرد" ـــــ یہ عام طور پر عورتوں کے لکھے ہوئے ناولوں اور رومانوی فلموں میں پائے جاتے ہیں۔

"خوشبودار مرد" ـــــ انٹیلکچوئیل بن کے پیش آتے ہیں۔ صاف ستھرے۔ خوش طبع اور چمکیلے مرد ہوتے ہیں۔ صاف باطن اتنے کہ کوئی پسندیدہ عورت نظر آجائے اعتراف کر کے اس کے سامنے آ بیٹھتے ہیں۔ اس کے ساتھ گپ لگا کے خوش ہوتے ہیں۔ چونکہ نیت میں کھوٹ نہیں ہوتا اس لئے جاتے جاتے اپنی شخصیت کی خوشبو چھوڑ جاتے ہیں۔

(مرزا حوادث بیگ نے خواتین کی جو اقسام بیان کی تھیں۔ وہ ہم کسی اور وقت

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کے لئے اٹھا چھوڑتے ہیں)

اور ہاں مرزا حوادث بیگ یہ بھی کہا کرتے تھے۔ کہ مرد کی کوئی بھی قسم ہو۔ باریاب نہ ہو تو دوبارہ ضرور آتا ہے۔ ابھی ہم مرزا حوادث بیگ کی رُوح کو ثواب بھیج رہے تھے۔ کہ وہی اطالوی بُزرگ پنیر کے سینڈوچ اور کوکا کولا کے دو ڈبے پکڑے ہوئے آ گئے۔

ایک کوک اور ایک سینڈوچ انھوں نے ہماری طرف بڑھایا۔ ہم نے مارے مروّت کے شکریہ کہہ کر لے لیا۔

"کوئی بات ہی سُنائیں۔" وہ سینڈوچ ختم کر کے پھر بولے "عورتیں جب بات کرتی ہیں تو ان کے مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔"

"رہنے دیجیے محترم۔"

ہم نے جل کر جواب دیا۔۔۔ ہمارے اردو شاعروں نے عارض کو گلاب، ہونٹوں کو پنکھڑیاں، آنکھوں کو ستارے، دانتوں کو موتی اور چال کو ندی سے تشبیہہ دے دے کر ویسے بھی ہماری عورت کی عاقبت خراب کر دی ہے۔ اگر ان کے ہر "دیوان" میں سے عورت کے کوائف اکٹھے کئے جائیں تو گوشت پوست کی جگہ پھل پھول ہی نظر آئیں گے اسی تصوّر کے بل بوتے پر آج کا ہر نوجوان کوئی نہ کوئی "حُسن پری" ڈھونڈتا پھرتا ہے اب اس بے چاری کو بخش دیں اور اس صدی میں انسان ہی رہنے دیں۔

ان کو ہماری اتنی لمبی چوڑی تمہید پسند نہیں آئی۔ اس لیے ہر بات کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگے:

"آپ کو لطیفے آتے ہیں؟"

ہم نے کہا "آتے تو ہیں مگر پتہ نہیں وہ مردانہ لطیفے ہیں یا بچگانہ۔۔۔ کیونکہ زنانہ لطیفے کوئی نہیں ہوتے۔"

عورت کے منہ سے تو گالیاں بھی لطیفے کا مزہ ہی دیں گی۔ کوئی سا لطیفہ سُنائیں۔"

"پھر وہی بات۔" ہمارے اندر ابھی زہر تھا۔ ہم نے کہا "آپ کی اس تمنّا کو ہمارے ایک شاعر نے پچھلی صدی میں یوں باندھا ہے ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہُوا

جب ہم نے ترجمہ کر کے سنایا تو نہال ہو گئے۔ کہنے لگے "بیچارہ میری طرح کا ہوگا۔"

"ایک بار ایک بحری جہاز طوفان کی زد میں آ گیا۔" ہم نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کر دیا۔

"جہاز کے کچھ شکستہ حصّے ایک جزیرے کے قریب پہنچ گئے۔ ان میں سے صرف تین آدمی زندہ بچے تھے دو مرد اور ایک عورت۔۔۔۔ کسی دانشور سے پوچھا گیا کہ وہ تینوں اس جزیرے میں کہ دُور دُور تک آدم نہ آدم زاد۔ کس طرح بسر کریں گے؟"

دانشور نے جواب دیا:

"اگر دونوں مرد برطانوی ہیں تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ مدتوں ایک دوسرے کے ساتھ تعارف کا مسئلہ طے نہ ہوگا۔۔۔

"اگر دونوں مرد سپین کے ہیں تو طاقت ور کمزور کو مار ڈالے گا۔۔۔۔

"اگر دونوں مرد فرانسیسی ہیں تو جھگڑا ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسے ہی چلے گا۔ لیکن اگر عورت اطالوی ہے۔۔۔۔۔"

(یہاں پر ہم نے رُک کر دم لیا اور معنی خیز انداز میں ان کی طرف دیکھا)

"تو وہ اُس مرد کو ختم کر دے گی جیسے کباب میں ہڈی جانتی ہے۔"

لطیفہ سُن کر وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگے۔ ان کی پھڑپھڑاہٹ پر ارد گرد کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لوگ ہمیں بھی دیکھنے لگے۔

"یہ تو بتائیں جناب والا" ہم نے ان کی ہنسی کو بریک لگانے کے لیے ایک سوال داغا۔۔۔۔ "اطالوی عورت کی جاں نثاری مشہور ہے جبکہ اطالوی مرد۔۔۔۔"

(یہاں پر ہم دانستہ رُک گئے)

"ہاں کہیئے۔ رُک کیوں گئیں" انھوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔

"حسن پرست، عاشق مزاج اور دل پھینک ہوتے ہیں۔"

"بات دراصل یہ ہے" وہ سنجیدہ شکل بنا کر بولے "ہر سرزمین کا مرد حُسن پرست عاشق مزاج اور دل پھینک ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم منافق نہیں ہیں۔ ہم کسی خوب صورت عورت کو دیکھ لیں تو دل پر جبر نہیں کر سکتے۔ بڑھ کر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ بھیڑ زیادہ ہو تو کولھے پر چٹکی لے لیتے ہیں۔

(خیر یہ کام تو اکثر ہمارے انارکلی بازار میں بھی ہوتے ہیں)

"آپ پیرس کس سلسلے میں جا رہے ہیں؟"

ہم نے گفتگو کی مہار موڑ دی۔

"پیرس تو صرف پیاس بجھانے کے لیے جاتے ہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے (اور کیا کرتی بے چاری) میرے سات بچے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھر راضی خوشی ہیں۔ روم کے نواح میں میرے باغات ہیں۔ اب بھی محنت کرتا ہوں مگر پسینہ خشک کرنے کے لیے گرمیوں میں پیرس ضرور جاتا ہوں۔"

"کافی افاقہ ہوتا ہوگا؟"

"جی ہاں۔ سال بھر کے لیے تازہ دم ہو جاتا ہوں۔" پھر بولے "آپ پیرس میں کہاں ٹھہریں گی؟"

"ہوٹل میں۔۔۔۔"

"کیا وہاں آپ سے ملاقات کی امید ہے؟"

"بالکل نہیں ہے۔"

"کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں۔"

"اس میں خطرہ ہے کہ آپ جلدی نہ گزر جائیں۔"

وہ پھر اپنے سارے نقوش اور اعضا ہلا ہلا کر ہنسنے لگے:

"اگر آپ سے دوبارہ ملاقات کو دل چاہے تو۔۔۔۔"

"اللہ چاہے گا تو پیرس پہنچ کر کافی افاقہ ہوگا۔"

وہ پھر مسکرائے۔

"آپ دلچسپ خاتون ہیں۔"

"شکریہ جناب۔"

"آپ پھر کب اٹلی آئیں گی؟"

"آج تو اتفاقاً اس کوچے سے گزر ہو گیا ورنہ ہمارے خدائے مجاز نے اور بہت سی ہدایات کے ساتھ اٹلی کے بارے میں کہا تھا۔

طوطیا من موتیا توں ایس گلی نہ جائیں!
ایس گلی دے جٹنے ڈاہڈے لیندے پھایاں پا[1]"

------ ہماری یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور اس بار ہمیں سمجھانا مشکل ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ سامنے بورڈ پر جلتی بجھتی روشنیوں کے ساتھ پیرس کی فلائٹ کا وقت اور نمبر آ رہا تھا۔ کبھی یہ وقت پندرہ منٹ پیچھے ہو جاتا، کبھی آدھا گھنٹہ آگے۔ سارے مسافر بے چینی اور شوق سے اسی بورڈ کی جانب بار بار دیکھنے لگے۔

[1] اے پیارے طوطے اس گلی میں نہ جانا۔ وہ تجھے اسیر کر کے پنجرے میں ڈال دینگے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہماری فلائٹ کی فائنل انفرمیشن بورڈ پر آ گئی۔ تو ہم نے اٹھ کر بورڈنگ کارڈ لیئے اور سب مسافروں کی طرح اپنی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ تب وہ بولے :

"آپ اگلے سال اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ روم دیکھنے کا پروگرام بنائیں اور آ کر میرے ہاں مہمان رہیں۔ میرے پاس پھولوں سے بھری ہٹ ہے۔ وہ میں اپنے معزز مہمانوں کو دیتا ہوں۔" پھر ان کی فطری شوخی بوڑھی آنکھوں سے نکلی اور بولے "بخدا میں آپ کے شوہر کو گوارا کر لوں گا۔"

(چودہ سال پہلے ایک پھولوں بھری ہٹ کا وعدہ اس ستم گر نے بھی کیا تھا مگر اب اپنی ہٹ نہیں چھوڑتا)

ہم صاحب عالم کی جانبازی کے قصے سنا کر انھیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان کی خستہ گردن صاحب عالم کے آہنی پنجوں سے دُور رکھنا چاہتے تھے اس لیے ٹال مٹول کے سے انداز میں بولے :

"ہاں ہاں، ضرور سوچیں گے اس بارے میں"

"ٹالنے والی بات مت کریں۔" انھوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "سیدھے سیدھے وعدہ کیجیے۔ سنا ہے آپ کے ملک کی عورتیں تو وعدے پر جان دے دیتی ہیں ؟"

(جان تو ایک بار دی جاتی ہے)

ہمیں تذبذب میں دیکھ کر انھوں نے ہاتھ ذرا اور آگے بڑھایا اور لجاجت سے بولے :

"وعدہ کیجیے۔"

ہم نے کہا "وعدہ نہیں کریں گے۔"

بولے "کیوں ؟"

ہم نے کہا "ایک بار وعدہ کیا تھا اور پھنس گئے تھے۔"

"کب کیا تھا ؟"

"یہی کوئی پندرہ سال پہلے ..."

"پھر کیا ہوا ؟"

"پھر بچے ہونے لگے"

"اچھا تو بچے ہونے لگے بھلا وعدے کے بعد بچے کیسے ہونے لگتے ہیں ؟"

"جی وعدہ وفا کرنے کے بعد عورت کے مقدر میں گھر داری اور بچے ہی رہ جاتے ہیں۔"

"اچھا۔ اچھا۔۔۔ وہ بولے "آپ کے شوہر کہاں ہوتے ہیں ؟"

"وہ ہمارے دل میں ہوتے ہیں۔"

"نہیں ... میرا مطلب ہے کہاں ؟ ... کس جگہ جگہ سمجھتی ہیں ؟"

"جی عرض کیا نا ؟ وہ دنیا کے نقشے پر ٹک کر ایک جگہ کہیں نہیں رہ سکتے اگر ان کا کوئی مستقل ٹھکانا ہے تو وہ ہمارا دل ہے۔ مگر ایک قباحت ہے۔ دل کے پتے پر آپ انھیں خط نہیں لکھ سکتے کیونکہ آپ خط میں بھی ڈنڈی مار جائیں گے، جو سیدھی ہمارے کلیجے میں لگے گی۔"

بولے "اچھا تو پھر یہ بتا دیں کہ آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں ؟"

"محبّت کرتے ہیں۔" ہم نے برجستہ کہا۔

بولے "نہیں جی، میرا مطلب تھا۔ محبت کے علاوہ کیا کام کرتے ہیں ؟"

"ہم نے کہا "محبت کے ضمن میں بھی کئی کام کرنے کے ہوتے ہیں۔ ویسے آپ نہیں سمجھتے تو بتائے دیتے ہیں۔ وہ بنجارے ہیں۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"بنجارے ہیں؟... اچھا اچھا..." وہ چونک چونک کر اور غور کر کے بار بار اچھا اچھا کہنے لگے اور کافی دیر کے بعد پلکیں جھپک جھپک کر بولے:

"اچھا وہ بنجارے ہیں جو رُوئی دھنکتے ہیں۔"

ہم نے سوچا یہ اہلِ دل، اہلِ زباں نہیں۔ ان سے کیا کہیں۔ چپ ہی رہے۔

"یعنی کہ... یعنی کہ.... وہ کیا دھنکتے ہیں؟"

"ابھی تک تو انھوں نے صرف ہمیں ہی دھنک کر رکھ دیا ہے۔" ہم نے جل کر جواب دیا۔

"اچھا...." وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگے"اچھا۔"

انھوں نے سہ بارہ اچھی طرح ہمارا یوں جائزہ لیا جیسے دوربین سے چیونٹی کو دیکھتے ہیں۔ پھر مسکرا کے بولے:

"بھئی بڑے اچھے بنجارے ہیں..."

لیلائے افریقہ

اِس بار جہاز میں ہماری ہم نشیں ایک کالی میم تھی.... جی ہاں.... لیلیٰ جیسی کالی... رسّی جیسے بالوں والی.... اسی طرح موٹی خربوزہ.... اُنگلیاں جیسے مجنوں کی پسلیاں....

ہر چند کہ ہم میں گوریوں والا احساسِ برتری نہیں ہے۔ کالی میم کو منہ لگانا ہمیں ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ اس لیے اس کو لوحِ جہاں پر حرفِ مکرّر سمجھتے ہوئے سراسر نظر انداز کر دیا اور ڈائری نکال کر سفر کی رُوداد لکھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں طریق آشنائی اور رسوم جام و بادہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایئر ہوسٹس اب کے بھی بڑی چھیل چھبیلی تھی۔ آنکھ کے رنگ کا مشروب اور ننھے ننھے جام اٹھائے ہماری سمت میں آ گئی کہ ابتدا ادھر ہی سے ہوتی تھی۔

ہمارے قریب آئی اور کورنش بجالانے والے انداز میں عرض کیا:

"آپ کیا پیتی ہیں؟"

"ہم صبر کے گھونٹ پیتے ہیں۔" ہم نے شانِ دلربائی سے کہا۔ "ہمارے ہاں عورتوں کے لیے یہ سب سے اچھا اور صحت افزا مشروب ہے۔ اسے مشروبِ مشرق

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بھی کہتے ہیں۔ اس میں تمام تر شرعی لوازمات ہوتے ہیں اور سستا مل جاتا ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، مرنے کے بعد اس کا اجر ضرور ملتا ہے۔"

اس نے ہماری لایعنی تفصیل سے اکتا کر مسکراہٹ کا تیر کالی میم کی طرف پھینکا۔

کالی نے اپنی پسند کا گلاس یوں لپک کر پکڑا۔ جیسے آج ساقی گری کی شرم وہی رکھے گی۔

ہم نے کنکھیوں سے اسے گھونٹ گھونٹ نگلتے دیکھا اور ڈائری میں پناہ لی۔ کالی میم چونکہ کھڑکی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لیے جب بھی اس کا دستِ گستاخ، جرأتِ رندانہ کے ساتھ بوتل کی طرف بڑھتا۔ ہماری حدود میں سے ہو کر گزرتا۔ اس نے دوسرا جام لیا، تیسرا اور پھر چوتھا۔ چوتھی بار جب ایئر ہوسٹس لال پیلے گلاس بھر کر لائی تو بالکل ہمارے کان کے قریب گرم نرم چہرہ کر کے بولی:

"پلیز آپ کچھ تو پئیں نا..."

ہائے ظالم نے اس ادا سے کہا کہ ہر قسم توڑ دینے کو دل چاہا۔

"کوک۔"

یہ کہہ کر ہم نے نظریں جھکا لیں۔ کیا کریں۔ ہم نے زندگی میں صرف شرمانا ہی سیکھا ہے۔ وہ گلاس میں ننھی ننھی برف کی سلیں ڈالے کوک لے آئی اور ہمیں یوں دیکھا جیسے کسی جدید میوزیم میں آثارِ قدیمہ کی نئی دریافت کو دیکھتے ہیں۔

کوک پیتے ہوئے احساس ہوا کہ ہم تو صبح سے بھوکے ہیں۔ بدمزہ سی چیزیں کھا کھا کر اپنے معدے کو یوں پرچا لیا تھا جیسے چھوٹے بچے کو کڑوی دوا پلا پلا کر اس کی بھوک مار دیتے ہیں

کالی میم کے ڈکاروں سے انگور کی بیٹی نکل رہی تھی اور ہمارا دم ہوا ہو رہا تھا۔ شکر ہے کھانے کی سروس شروع ہو گئی۔ دیکھنے میں کھانے کی سجاوٹ خوب صورت

بھی تھی اور اشتہا انگیز بھی۔ جہازی ٹرے کی تو پھبن ہی ایسی ہوتی ہے کہ پورا ٹرے نگل جانے کو جی چاہتا ہے۔ ہم نے اس سجے سجائے زرق برق کھانے کو "مشکوک نگاہ" سے دیکھا ہمیں یہ شک سفر سے پہلے زادِ راہ کے طور پر ملا تھا اور پورے سفر میں ہم نے اس کو استعمال میں لانا تھا۔ ہم نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بے بسی سے کالی میم کی طرف دیکھا۔ وہ کانٹا چھری پکڑے تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔ ہم نے اپنے معدے پر صبر کی ننھی سی سل رکھی اور ایئر ہوسٹس کو بلا کر پوچھا:

"یہ کیا ہے؟"

"بیف۔"

"اور یہ کیا ہے؟"

"تلی ہوئی مچھلی۔"..

"شکریہ...."

بخدا ہم نے ایسا صحت مند گلابی گلگوں بیف اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے اپنے ملک کی دکانوں پر لٹکا ہوا جو بیف دیکھا ہے اس کی رنگت اُس سے قطعی مختلف تھی۔ ہم بڑی خدا ترس قوم ہیں۔ ہم نوجوان نوعمر کٹریوں اور بچھڑوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ نوجوان کٹریاں اور بچھڑیاں ٹی وی کی نذر کرتے ہیں۔ اکثر بیمار اور ضعیف گائیں وبھینسیں خلق کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو بیماریاں پھیلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرے بیمار اور ضعیف جانور احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے۔

ہمارے معدے میں پہلا نوالہ گیا تو الاطالیہ کا جہاز دنیا کا حسین ترین جزیرہ نظر آنے لگا۔ دوسرے نوالے پر ایئر ہوسٹس جنت کی پری لگی اور تیسرے نوالے پر ہم نے مسکرا کر کالی میم کو دیکھا۔ کچھ ایسی بُری بھی نہ تھی بلکہ وہ تو پورا ٹرے چٹ کر چکی تھی

FUTURISTAN.BLOGSPOT.COM

اور اب ایئر ہوسٹس کو بُلا کر کچھ اور لانے کی فرمائش کر رہی تھی۔ اس نے ایک صحت مند سا ڈکار دا غا تو ہم نے دُعا دی:

اللہ کرے زورِ خوراک اور زیادہ

کھانے کے دوران اس نے دو بار شیمپین مانگی۔ پینے کا سلسلہ اس کا زلفِ یار کی مانند کافی دراز رہا۔ سُرخ سیال مادّے سے شروع کر کے آنکھ کے رنگ کی بوتل پر اس نے ختم کیا۔

اچھی طرح سیر اور دلیر ہو چکنے کے بعد ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی:

"کیا آپ پیرس جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

ہم بھی اپنے جبڑوں کو کھینچ کر زبردستی مسکرائے۔ اصل میں اس کی سانس میں سے اُٹھنے والی بو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن اسی بو میں اس کی زندگی کی حرارت مضمر تھی مگر ہمیں فوراً ایک فرق کا پتہ چل گیا۔ کالی میم گفتگو میں خود ابتدا کرتی ہے جبکہ گوریاں ہمیں یوں دیکھتی ہیں جیسے ہم کالے ہوں۔

عورتیں کسی سرزمین کی ہوں، جب ان کی گفتگو چل نکلتی ہے تو تان شوہر اور بچوں پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ کالی افریقہ سے آ رہی تھی۔ وہاں پر وہ نرس تھی۔ اس کے آٹھ بچے تھے اور اب ایک مہینے کی چھٹیاں گزارنے پیرس جا رہی تھی۔

ہم نے ڈرتے جھجکتے پوچھا:

"آپ نے بچے کس کے پاس چھوڑے ہیں؟"

"اپنے شوہر کے پاس۔"

تب اچانک ہمیں صاحب عالم کا خیال آ گیا اور ہم نے بے اختیار کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ یاد رہے کہ ہم بیرونی ملکوں میں سفر کے دوران اپنی گھڑی کا وقت

نہیں بدلا کرتے اور جب دل گھبرائے تو گھڑی دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ اب وطنِ عزیز میں کیا وقت ہوگا۔

گو وطنِ عزیز میں تو وقت ضائع کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ مگر کوئی کیا جانے....؟ کہ یہ "وقت" دوسرے ملکوں میں کس قدر یاد آتا ہے۔

ہم نے گھڑی کو دیکھ کر سوچا اس وقت "صاحبِ عالم" بچوں کو سینے سے لگائے سو رہے ہوں گے۔ ویسے تو انھیں تکیہ سینے سے لگا کر سونے کی عادت ہے ممکن ہے ہماری عدم موجودگی میں بچوں کو ترجیح دیں۔

زندگی میں پہلی بار ہم نے بچوں کو چھوڑا تھا۔ یعنی ہماری قید باشریعت کو پورے چودہ سال ہو گئے تھے۔ اسی لیے تو کھلی فضا میں ایک آزاد پرواز کی اجازت ملی تھی۔

ہم نے شکر گزاری کے طور پر سر جھکایا اور کہا ؎

صیاد تیرے حکمِ رہائی کا شکریہ
ہم تو قفس میں کاٹ چکے دن بہار کے

جانے کالی میم مسکرا مسکرا کر ہم سے کیا کہہ رہی تھی۔ ہم تو جہانِ وہم و گماں میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں یوں یادوں کے سمندر میں غلطاں و پیچاں دیکھ کر اس نے ایک دم تیز تیز جاتی ہوئی ایئر ہوسٹس کا دامن پکڑ لیا اور بولی:

ساقیا! ایک میرا کام کر دے
سارا میخانہ میرے نام کر دے

ایئر ہوسٹس اثبات میں مسکرائی اور ایک پتلی کمر والا جام بھر کے لے آئی۔ مگر جاتے جاتے نظروں میں اسے تنبیہہ کر گئی۔

ساقی کو سمجھے یہ نہیں ہر آدمی کا کام

ہم نے اپنی ڈائری کھول کر اس میں سے چاروں بچوں کی تصویریں نکالیں تو

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کالی میم بھی بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ غالباً اسے بھی اپنے بچے یاد آنے لگے تھے اور وہ اس آگ کو آگ سے بجھانا چاہتی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ہم نے کچھ اور ذاتی قسم کے سوال کر ڈالے.... ان میں شادی.... محبت.... جنس..... سماج... مذہب.... سب کچھ آجاتا ہے۔

اپنے مذہبی عقائد پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ بولی:

"آپ سے ایک بات پوچھوں، آپ بُرا تو نہیں مانیں گی؟"

ہم نے کہا "پوچھیے۔ ہم غیر ملکیوں کی کسی بات کا بُرا نہیں مانتے۔"

کہنے لگی:

"مسلمان خود تو شراب پیتے ہیں، اپنی عورتوں کو شراب پینے سے منع کیوں کرتے ہیں؟"

سوال کے ایک حِصّے کا جواب ہمارے پاس تھا اور دوسرے حِصّے کا نہیں تھا۔ ابھی ہم پہلے حِصّے کے جواب سے سرخرو ہوئے تھے کہ ایئر ہوسٹس نے پیرس کی آمد آمد کا اعلان کر دیا۔ اللہ اس کا بھلا کرے۔ عین وقت پر ہمیں بچا لے گئی۔ پیٹیاں کسنے اور سامان سمیٹنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دل کی شکل والے کھڑکی کے شیشے سے ہم نے باہر دیکھا تو پیرس شہر کا جان لیوا نظارہ ہمیں کھولے بلا رہا تھا۔

ہم نے پیرس کے پُرخواب قصّے سن رکھے تھے اور آج اپنی آنکھوں سے پیرس دیکھنے والے تھے۔

"آپ کہاں ٹھہریں گی؟" لیلیٰ نے اچانک پوچھا۔

"ہوٹل میں... اور آپ؟"

میں نے تو اپنے ایک دوست کو اِطّلاع دے دی تھی۔ اگر وہ آگیا تو اس کے پاس ٹھہر جاؤں گی۔ ورنہ کہیں اور بندوبست کر لوں گی۔ میں ہر سال پیرس آتی ہُوں۔"

"آپ کا دوست یا آپ کے شوہر کا؟"

ہم اپنی املا کی غلطیاں فوراً درست کیا کرتے ہیں۔

"میرا دوست۔" وہ اعتماد سے بولی۔

لیلیٰ کے اندر سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں اور ہم نے سوچا حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے ورنہ اچھا بھلا شریف صورت قیس مجنوں مجنوں نہ کہلاتا۔

لیجیے پیرس آگیا۔

خوابوں کا شہر

خوبصورتیوں کا شہر

حسین پناہ گزینوں کا شہر

معزول شدہ شاہوں کا شہر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دُوسرا پڑاؤ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پیرس

اوسان گم، سامان گم

پیرس کے اورلی ایرپورٹ پر ہم سامان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ یوں زندگی ہماری ساری ایک انتظار میں ہی بیت رہی ہے مگر اس وقت سامان کا انتظار ہمیں کھل رہا تھا کہ شیشوں کی دیوار کے باہر پیرس پر برکھا کی رم جھم بوندیاں نثار ہو رہی تھیں۔ برسات ہماری کمزوری ہے۔ سامان ہماری مجبوری تھا۔ اگر آج شب کسی سے وعدہ بھی ہوتا تو ہم سامان کی خاطر عہد شکن بننا قبول کر لیتے۔ مگر یہ کیسا اندھیر تھا کہ انتظارِ بسیار کے باوجود ہمارا سوٹ کیس بیلٹ پر سر دُھنتا نظر نہیں آیا۔ ہمارے سامنے آخری سافر بھی سامان لے کر جا چکا تھا

مگر ہم اپنا سا مُنہ لیے کھڑے تھے۔ برقی بیلٹ کا دل دھڑکنا بند ہو گیا تو پھر ہمارے دل کے بند ہونے کی باری آئی۔ اس پیلے سوٹ کیس میں عزیزوں کے تحائف اور لوگوں کی امانتیں تھیں۔ آج صبح سے دائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اس بوڑھے برگد اطالوی کا سامنا ہُوا تھا تو دل کہہ رہا تھا، کچھ ہو کر رہے گا۔ لیجیے۔ وطن سے دُور، غریبُ الوطنی کی شام میں آپ زادِ راہ سے محروم کر دی گئیں۔ اس اتفاق پر پہلے تو ہنسی آئی۔ پھر رونا آیا.... کالے دیو کی قیدی شہزادی کی طرح.... افسوس اس بے رحم زمین پر ہم سے کسی نے نہیں پُوچھا

"اے بے تاج شہزادی! پہلے ہنسی کیوں۔ بعد میں روئی کیوں؟" اپنی حالت پر جتنا ترس کھا سکتے تھے، کھایا۔ اور پھر الاطالیہ کے کاؤنٹر پر جا کر شکایت درج کرانے میں ہی آخری حل نظر آیا۔ ہم نے کئی بار سنا تھا کہ الاطالیہ والے سامان گم کر دیتے ہیں مگر اس وقت ہم نے دریا دلی سے سوچا تھا "سامان کی خیر ہے، سفر میں اوسان گم نہیں ہونے چاہئیں"۔ پر اب ہمارے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ سفر میں کبیدہ خاطر ہونا بزدلوں کا شیوہ ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچا ایک حقیر سے سوٹ کیس کے لیے اپنا پیارا سفر کیوں خراب کریں ——— یہ سوچ کر ہم لاؤنج سے باہر آ گئے۔ پائیل بجاتی بوندوں نے ہمارے حواس باختہ چہرے کو چوما اور سامنے لائن میں کھڑی ہوئی مرسڈیز ٹیکسیوں میں سے ایک ٹیکسی یوں ہماری جانب کھسک آئی جیسے تیرنا اس کی عادت ہو۔ سامان کے گم ہونے کی آزردگی آپ ہی آپ دور ہو گئی۔ سوچا ایسی شاندار ٹیکسی استقبال کو آگے بڑھی ہے۔ اب کیا شکوۂ بے مہریٔ فضائیہ کریں۔ ہم نے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پھر اس سامان کی طرف جو ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ ہمیں یقین تھا ہماری آنکھ کا اشارہ پا کے ڈرائیور فوراً باہر نکل آئے گا اور ہمارا سامان ہاتھوں سے لے کے ڈکی میں رکھنا شروع کر دے گا۔ مگر وہ تو اشارہ شناس تھا ہی نہیں، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ پھر کرخت سی آواز نکالی جس کا مطلب تھا "بیٹھنا ہے بیٹھو ورنہ میں چلا"۔ ہم نے کچھلی سیٹ پر سامان رکھ دیا اور لپک کر اگلا دروازہ کھولا۔ باوجود اس کے کہ ڈرائیور نے ہمارے ساتھ ہمارے شایانِ شان سلوک نہیں کیا تھا، ہم اسے اپنی ہم نشینی کے اعزاز سے محروم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس بار بھی ڈرائیور نے ہمیں آگے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ اجازت اس نے اپنے ہاتھوں سے منسوخ کی۔ ہم اپنی پیشانی سے خفت کا پسینہ پونچھتے ہوئے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے اور اسے بتایا کہ ہمیں ہوٹل "رائل مونسیو ROYAL MONCEAU" میں جانا ہے۔ اور یہ جان کر ہماری تو جان ہی نکل گئی کہ زبانِ یارِ من

ترکی و من ترکی نمی دانم انگریزی سمجھنے سے اس نے بالکل انکار کر دیا اور فرانسیسی ہمارے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ چار حرف جو ہم نے انگریزی میں اٹھانے سیکھ لیے تھے اور اپنے ہم وطنوں کے آگے بول کے اترایا کرتے تھے، آج وہ بھی نادار نظر آئے۔ وہ تو شکر ہوا کہ ہمارے پاس ہوٹل کا کارڈ تھا جو ہم نے اسے دکھایا۔ ورنہ ہمارے غلط تلفظ کے پیشِ نظر نہ جانے وہ ہمیں کہاں پھینک آتا۔

ہوٹل میں داخل ہوتے تو وہی چپ کی وادیوں میں گم کمرے، سنسان کوریڈور، بے آواز دروازے، ملفوف بستر، چکنے غسل خانے اور دل بے تاب کی طرح اوپر نیچے آتی جاتی لفٹیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارا ہوٹل شانزے لیزے کے قریب ہے۔ ہم آپ کو سچی بات بتا دیں۔ ہم شانزے لیزے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ بس ایک فیشن ایبل طبقے کے منہ سے اس کا نام سنا تھا یا ایک بار ایک اردو فلم دیکھی تھی جس میں ہیروئن غرارہ کپڑے کے شانزے لیزے اور ایفل ٹاور کے گرد گھوم گھوم کے گانا گاتی دکھائی گئی تھی۔ تب سے ہمیں بھی شوق ہوا کہ چل کے ذرا شانزے لیزے اور ایفل ٹاور ہی دیکھیں۔

جی نہیں ... پیرس آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور کافی ٹھوس وجہ تھی۔ اب آپ سے کیا چھپائیں۔ چھپانے کا فن ہمیں آتا ہی نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم مارے تعصب کے منہ اٹھائے پیرس چلے آئے تھے۔ صاحبِ عالم ہر بہار کے موسم میں پیرس کا رخ کرتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو چہرے سے جھانکتی گلابیاں اور رنگ کا دمکتا کندن سو سو چغلیاں کھاتا ہے۔ ہم کہ تصور کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہر وہ منظر تصور کی بائیونک آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں جو ہمارے اندر حسد و رشک کے الاؤ بھڑکانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اس لیے ایک دن مردانہ وار فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم زنانہ وار پیرس کی گلیاں اور بازار دیکھیں گے اور یہ بھی دیکھیں گے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کہ صاحبِ عالم آخر وہاں کیا کرنے جاتے ہیں اور کیا مُنہ لے کر آتے ہیں۔ ان کی "روزینہ" اور "شبینہ" سرگرمیوں کا راز دریافت کریں گے۔ ان کی "چوریاں" اور "چالاکیاں" پکڑیں گے اور یہ سارا "ایمونیشن" زندگی بھر کام میں لائیں گے۔ تھکاوٹ بھی تھی اور شب بیداریاں بھی، مگر جوشِ رقابت جلد از جلد شانزے لی زے پہنچنے پر اکسا رہا تھا۔ تاریخ اور جغرافیے میں ہم سدا کورے رہے ہیں۔ ویسے ہمیں اپنی زندگی کی اہم تاریخیں تو ازبر ہیں مگر یہ نہیں جانتے، نپولین بوناپارٹ کیا پارٹ ادا کرنے آیا تھا۔ اور ہٹلر کی ہٹ دھرمی کی وجہ کیا تھی۔ نہ کبھی ہم نے جاننے کی کوشش ہی کی۔ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ اور ہم فرانس کو بادشاہوں اور جنگوں کے حوالے سے نہیں بھگوڑوں کے حوالے سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے یہ پیرس دنیا بھر کے بھاگے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے، معزول شدہ حکمرانوں، دیوانوں اور فرزانوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ یہ بھی خیال محلِ نظر تھا کہ کسی سڑک پر ہمیں ثریا اسفند یاری بیلے ڈانسر کے کوسٹیوم میں یہ گیت گنگناتی نظر آجائیں گی:

سوتن کے سنگ رات بتائی
کاہے کرت اب جھوٹی بتیاں

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ملکہ فرح ایک ایک کو روک کر کہہ رہی ہوں:

میرے پیا کو ڈھونڈھ کے لاؤ سکھی....
جانے کہاں وہ کھو گئے....
کس بیرن کے ہو گئے....

شام، شوق اور شانزے لی زے

ہم نے شام اودھ اور صبح بنارس کے کئی قصّے سُنے ہیں۔ ہم شام سے ہرگز متأثر نہیں ہوتے۔ شام تو بذاتِ خود ایک اداس سی چیز ہے بلکہ زندگی کے اخیر کی

علامت ہے۔ ہاں، آپ کے اردگرد کا ماحول شام کو جو رنگ عطا کرتا ہے۔ شام اس میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ تنہا سفر کیا جائے تو تنہائی کا احساس ہر شے پر غالب آجاتا ہے۔ افوہ! شانزے لی زے تو ایک معروف اور بارونق بازار ہے۔ خوب کشادہ اور خوبصورت ایک عظیم کاروباری مرکز کہہ سکتے ہیں۔ حسنِ زن اور حسنِ ظن سے مرصّع۔ جیسا کسی زمانے میں انارکلی بازار ہوا کرتا تھا۔ اب تو خیر لاہور بھی شاپنگ پلازوں اور بزنس مارکیٹوں کا جنگل بنتا جا رہا ہے اور انارکلی بے چاری پہلی بیوی کی مانند بوڑھی اور پژمُردہ نظر آتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ دُور دُور سے انارکلی کی سج دھج دیکھنے آتے تھے اور بہت سے کھوئے ہوئے دوست وہاں مل جاتے تھے۔ اسی طرح شانزے لی زے بھی خلقت کے ملنے اور بچھڑنے کا سنگم ہے۔ ہم کئی کئی منزلہ ڈیپارٹمنٹل سٹورز، بڑے بڑے شوکیس، روشن روشن ریسٹوران اور جگمگ کرتی دکانیں دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ سامنے اپنے دونوں بازو پھیلائے ایک گستاخ سا فرانسیسی آ گیا۔

"اوئی اللہ"... کہہ کر ہم ٹھٹک گئے۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ سُنا تھا پیرس فیشن اور بے حیائی کا گڑھ ہے، مگر یہ نہ سوچا تھا، نہ جان نہ پہچان.. اور یوں اجنبی مرد بانہیں پھیلائے راستہ روکے کھڑے ہوں گے.... تھوڑی دیر بعد جب بینائی اپنے مرکز پر آئی اور گھبرائے ہوئے دل پر ہم نے قابو پا لیا تو غور سے اردگرد کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ سچ مچ کا آدمی نہیں تھا، شوکیس میں لگی ہوئی آدمی کی ڈمی تھی۔ نقل پر اصل کا گمان ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی بے باک چمک.... ہونٹوں پر طلب کرتی ہوئی مسکراہٹ اور پھیلے ہوئے ہاتھوں میں وہی والہانہ پن..... اچھے مصوّر ہیں یہ لوگ۔

پھر تو ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہی چلے گئے۔ پورے مرد اور سالم عورتوں کی خوبصورت دلکش "ڈمیاں"... دیدہ زیب ملبوسات میں ملبوس شوکیسوں میں براجمان تھیں....

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہیجان انگیز اور شریر پوز

مسافر کپڑوں کو دیکھے یا ان کے اندازِ دلرُبائی کو۔ ہم نے سوچا یہ نقلی مرد اور نقلی عورتیں اتنی خوب صورت اور مکمل ہیں کہ یہاں اگر کوئی جیتا جاگتا ساتھی میسّر نہ آئے تو ان کے ساتھ شام بآسانی گزر سکتی ہے۔

مگر یہاں کوئی تنہا بھی ہو۔ جو بھی نظر آرہا ہے پہلو میں ایک حور شمائل ضرور ہے خیر، حُور شمائل کا الزام ہر گوری خاتون پر نہیں لگ سکتا۔ بس شام کو پہلو میں ایک لڑکی نما چیز کا ہونا بہت ضروری ہے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ہوں۔ کمر میں بازو ہوں اور یوں چل رہے ہوں جیسے "رِچ بٹناں دی جوڑی"۔

یہاں چلنے کا دستور یہ ہے کہ لڑکی کا سارا بوجھ لڑکے اور اس کی جیب پر ہو۔ اگر آپ کسی ملک کے تمدّن، ترقی اور معاشرت کا اندازہ ایک طائرانہ نظر میں لگانا چاہتے ہیں تو اس ملک کے کسی مصروف ترین بازار میں چلے جائیں۔ لوگوں کے چلنے کی رفتار سے اس کی ترقی کی رفتار کا پتہ چل جائے گا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ بازاروں میں چلتے نہیں بلکہ دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا" والے انداز میں یا ایسے جیسے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی ٹرین مس ہو جانے کا خوف لگا ہوا ہے۔ اس جنون میں مرد اور عورت دونوں ہی شامل ہیں۔ ہم سُوئے اتفاق سے دو چار ترقی یافتہ ملکوں سے گزرے ہیں۔ عزم بالجزم کے ساتھ ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ دس بارہ قدم پیچھے پائے گئے۔ ہاں کچھ دن اسی تگ و دو میں گزارنے کے بعد جب وطنِ عزیز میں لوٹ کر آتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہر کوئی محض چہل قدمی کے لیے نکلا ہُوا ہے۔ مزے مزے سے، آرام آرام سے مٹک مٹک کر گھسٹ گھسٹ کر چل رہے ہیں ... امیر غریب، ریڑھی والا، بینک والا، سٹور کا مالک ... بچہ، بوڑھا، جوان۔ آخر ہم کب تک رینگتے

رہیں گے۔ ہاں اگر کوئی سڑک پر تیز قدموں سے رواں ہو جائے تو لوگ اسے روک کر حیرت سے پوچھتے ہیں بھئی خیریت تو ہے؟ یورپ کے دیگر ممالک کی طرح یہاں بھی دکانیں اور بازار شام پانچ بجے بند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

ہم نے سوچا۔ پہلے اللہ کا نام لے کر ساری دکانیں دیکھ لیتے ہیں یعنی ونڈو شاپنگ کرتے ہیں اور اپنے نفس اور ہوس کا امتحان لیتے ہیں۔ خیر نفس کا امتحان لیتے ہُوئے ہمیں پورے چودہ سال ہو گئے ہیں۔ ہاں ہوس کی آہ و بکا سُن کر توجہ اِدھر اُدھر کر لیں گے۔ کیا بتائیں کس کس چیز پر کم بخت دل کس کس طرح آیا۔ ہر خوب صورت چیز دونوں ہاتھوں سے اندر بلاتی تھی اور لُٹ جانے پر اُکساتی تھی۔ ہمارے پاس تو تسلّیٔ دلِ ناصبُور کے لیے صرف ایک ہی جواز تھا۔ دیکھ بی بی! تو نے ابھی بہت لمبا سفر کرنا ہے۔ پہلے پڑاؤ پر ہی اپنا اعمالنامہ (سامان) اس قدر بھاری نہ کر لینا کہ کسی بھی پُل صراط (کسٹم چوکی) پر دھر لی جائے۔ چلتے چلتے ہم ٹھٹک گئے۔ ہمارے سامنے وہی بوڑھا اطالوی ایک نوخیز ہرنی کو گلے میں لٹکائے جا رہا تھا۔ امکان تو نہیں تھا کہ اس عالم میں اسے اردگرد یا خصوصیت سے ہماری جانب دیکھنے کا ہوش ہوگا، پھر بھی ہم نے اوٹ میں چلنا مناسب جانا۔ کیا کریں، ہمیں ساری زندگی اوٹ لینے کی تربیت دی جاتی ہے۔ لڑکی جو ہار پہنی ہوئی تھی، ہوش میں تھی اور تھوڑی تھوڑی کارروائی کے بعد بوڑھے عاشق کو پکڑ کر کسی دکان کے شوکیس کے پاس لے جاتی۔ انگلی سے کسی شے کی طرف اشارہ کرتی بے اختیار بوڑھے شہنشاہ کے ہاتھ اپنی جیبوں کی طرف چلے جاتے۔ مطلوبہ چیز حاصل کرنے کے بعد لڑکی پھر گلے کا ہار بن جاتی۔ اب جب کہ دونوں اپنی دُھن میں دُکان سے باہر نکلے تو ہم نے دیکھا کہ یہ بڈھا تو کوئی اور تھا۔ پھر ہم نے غور کیا تو ہمیں اپنے اردگرد اس اطالوی کے زمانے کے بے شمار زندہ دل بزرگ نظر آئے۔ ان سب کے ساتھ کچّی کلیاں تھیں اور رنگ رلیاں تھیں۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ ہفتے کی شام ہے۔ ان

AUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ملکوں میں ہفتے کی شام سُہاگن شام ہوتی ہے تھکن اتارنے کی شام ہوتی ہے۔ بارٹر BARTAR سوداوں کی شام ہوتی ہے ——— جب ہم پورے بازار کا چکر لگا کر آئے تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ شانزے لی زے اور دوسرے بازاروں میں کیا فرق ہے۔

جوں جوں شام نکھرتی جاتی ہے، لوگ ریستورانوں سے نکل نکل کر کشادہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی کرسیوں پر آ کر بیٹھتے جاتے ہیں۔ پھر "اور لا۔ اور بنا دے مستانہ" کا دَور چلتا ہے۔ کبھی کبھی ہلکی ہلکی پھوار ان کے چہروں پر موتی نثار کرتی گزرتی رہتی ہے۔ انہی مستانوں میں سے جب کسی کا ظرف چھلک اٹھتا ہے تو وہ سڑک پر کھڑا ہو کر اونگی بونگی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک دیوانے کو چڑھ گئی۔ پھر وہ اٹھ کر سڑک کے بیچ کھڑا ہو گیا۔ اب جو کوئی موہنی صورت قریب سے گزرتی۔ اس کے کان کے پاس چہرہ لے جا کر زور سے "ٹھاہ" کی آواز نکالتا۔ وہ چیخ مار کر دُور جا گرتی اور مجمع ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا۔

یہ لوگ ہنسنا جانتے ہیں۔ ہنسنا چاہیں تو خود ہی ہنسنے کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے سب دکانیں بند ہو گئیں اور سڑک پر خوش فکروں کا ہجوم ہو گیا۔ یوں لگتا تھا۔ آج پیرس کے سب گھر خالی ہو گئے ہیں اور سب باشندے شانزے لی زے پر نکل آئے ہیں۔ ایسے میں ہمارے اندر کے شاعر نے مصرع اُٹھایا

بھیڑ ہے قیامت کی اور ہم اکیلے ہیں

چلتے چلتے ہم مشہور زمانہ نائٹ کلب "لیڈو" کے نزدیک پہنچ گئے۔ یاالٰہی! اتنی لمبی قطار شائقین کی۔ یہ تو قیامت تک کم نہ ہو گی۔ سب کے چہروں پر اطمینان کا اُجالا تھا جیسے جانتے ہوں، ٹکٹ تو مل ہی جائے گا۔ اندر بھی چلے جائیں گے۔ نہ دھینگا مشتی، نہ خون خرابہ، نہ گالی گلوچ۔ اصل میں جس تماشے کے ٹکٹ لڑ جھگڑ کر، پسینہ پسینہ ہو کر

نہ خریدنے جائیں، اس تماشے کے دیکھنے میں کیا خاک مزا آئے گا۔ پہلے تن کو گالی گلوچ سے گرم کرتے ہیں۔ پھر اندر جاتے ہیں۔ جیسے شادی کے روز دُلہن کو سُرخ کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ یہ گم سُم اور پُرسکون لوگ اندر جا کر کیا کریں گے؟ ہم نے بہت سے نابالغ نوجوانوں کے سفر نامے پڑھے ہیں اور ہمیں بڑی حسرت ہے کسی نائٹ کلب میں جا کے اپنی آنکھوں سے تصدیق کرنے کی۔ مگر افسوس کہ یہ حسرت تو اس بار بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ پچھلی مرتبہ جب ہم صاحب عالم کے ساتھ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے تو چاروں بچے ہمارے ہمراہ تھے۔ ہر چند کہ ہم بچوں کی آزادی اور آزاد خیالی کے علمبردار ہیں۔ پھر بھی نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے وقت سے پہلے بالغ ہو جائیں۔

واللہ! ہم اپنے بچوں سے حسد بالکل نہیں کرتے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بچے ذہنی طور پر بالغ ہو جائیں تو والدین کو ذہنی طور پر بوڑھا ہونا پڑتا ہے جس کے لیے ہم ابھی تیار نہیں ہیں۔ اس لیے پچھلی مرتبہ بھی نائٹ کلب دیکھنے کی حسرت ناشاد دل میں لئے واپس چلے گئے تھے! دراب بھی لیڈو کے باہر لمبی قطار کو دیکھنے پر ہی اکتفا کی۔

اور یہ جو بے شمار لوگ، خوش فکرے، خوش باشے۔ تفریح گاہوں میں، میخانوں میں، ریستورانوں میں اور قحبہ خانوں میں نظر آ رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے، اپنے تفکرات و مسائل کی کشتیاں جلا کر آئے ہیں، مگر دن کے وقت جب یہ دکانوں دفتروں سٹوروں اور اپنے اپنے کام کے مراکز میں ہوتے ہیں تو بڑی سنجیدگی، لگن اور دیانت کے ساتھ اپنا کام نبھاتے ہیں۔ ان اقوام کی خوبی یہ ہے۔

"جیو تو ایسے جیو جیسے سب تمہارا ہے"

گرما کی اس خوش گوار شام میں فضا میں مُسلسل موتی برس رہے تھے... اور دھیمی دھیمی پھوار سے ہی ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی جبکہ فرانسیسی گوریاں مختصر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سے مختصر لباس میں نظر آرہی تھیں۔ روایات کا پھندہ اُتارتے اُتارتے اُنھوں نے کپڑے تک اُتار دیے ہیں۔ اس کا جواز گوریاں یہ پیش کرتی ہیں کہ یہاں گرمیاں غریب کی جوانی کی طرح مختصر ہوتی ہیں اور سردیاں محبوب کے ستم کی طرح طویل اور شدید۔۔۔۔ برف باری کے دنوں میں اتنے زیادہ کپڑے پہننے پڑتے ہیں کہ گرمیاں شروع ہوتے ہی ان کا ردعمل شروع ہوجاتا ہے۔ آہستہ آہستہ جسموں پر صرف دھجیاں رہ جاتی ہیں۔ عورت دنیا میں ہر جگہ اشتہار کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہم مرد نہیں ہیں مگر عورت کو ہم بھی بڑے غور سے دیکھتے ہیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک۔ کیا کریں عورت چیز ہی ایسی ہے۔

شانزے لی زے کے اتنے چکر لگائے کہ ساری حسرتیں مٹ گئیں۔ سب ڈیپارٹمنٹل سٹور ایک ایک کرکے ہمارے سامنے بند ہوگئے۔ نیون سائن بھی دیکھ ڈالے۔ اشتہار بازی کے جدید ترین ہتھکنڈوں پر غور کیا۔ مگر جب مُڑ کر اپنی جگہ پہ پہنچے تو شام اسی جگہ پر کھڑی تھی۔

تب احساس ہوا کہ یہاں شام ڈھلتی ہی کب ہے؟ کسی کافر ادا حسینہ کی طرح ہاتھ اٹھا کہ انگڑائی لیتی ہے تو بس وہیں اٹک جاتی ہے۔ اسی لیے تو یہاں شام طویل اور چھلکی چھلکی ہوتی ہے۔

یورپ کے دیگر ممالک کی گرمیوں کی طرح یہاں بھی سورج رات کے نو دس بجے کے قریب ڈوبتا ہے۔ شام کا اجالا سنیا سی بنا شہر کے دروازے پر کھڑا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ شہر کے لوگ اپنی آرزوؤں کو مہکانے کی خاطر خود ہی بتیاں روشن کرنے لگتے ہیں۔ شانزے لی زے پر بھی برقی قمقموں سے چراغاں کرکے گویا وہ اس کے سلونے مکھڑے پر افشاں سی چُن دیتے ہیں۔ جُوں جُوں شام کی عمر لمبی ہوتی جاتی ہے دھنک رنگ قمقموں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے میں گھر جانے کا کسے ہوش ہوتا ہے؟

شہرِ تمنّا!

آج ہی کا دن بچا تھا ہمارے پاس اور ہم چاہ رہے تھے کہ کہیں سے جادوئی قالین اور طلسمی دُوربین میسّر آجائے تو ہم ایک دن میں سارا پیرس دیکھ لیں۔ اس وقت ہمیں اپنی عاقبت نااندیشی پر رونا آیا۔ اگر ہم آنے سے پہلے لاہور ٹی۔وی کے پروگرام "الف لیلیٰ" کی پروڈیوسر سے مل کے آئے ہوتے تو یقیناً وہ چند دنوں کے لیے عاریتاً اپنا جادوئی اُڑن کھٹولا اور جادو کی دُوربین ضرور ہمیں دے دیتیں۔ مگر ہم نے آپ کو بتایا نا؟ کہ سفر میں ہم افسوس اور پچھتاوے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ یہ مسئلہ فوری طور پر ہوٹل والوں کی انتظامیہ کے سپرد کر دیا تو انھوں نے ایک ننھا سا کارآمد مشورہ دیا۔۔۔۔ یعنی ٹورسٹ بسیں آج کل جادوئی قالین اور طلسماتی عینک والا کام کرتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہم نے ان کا یہ نیک مشورہ مان کر انھیں مشکور کر لیا بلکہ ان سے کہا کہ وہ ہمارے لیے ٹکٹ بھی خریدیں اور مزید ہدایات سے بھی نوازیں۔ پانچ منٹ کے بعد ہمارے ٹکٹ اور پورا پروگرام ہمیں کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کان ادھر لائیں۔ آپ کو ایک اور بات بتائیں۔۔۔۔

شوہر سے تو یہ ہوٹل والے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ کتنی جلدی فرمائشیں پوری کرتے ہیں۔

نیچے ہوٹل کی لابی میں آئے تو ایک خوش گوار واقعہ اچانک خوشی کی طرح پیش آگیا۔ ہماری ایک عزیز دوست فخر بھابھی، ان کے تینوں بچے اور شوہر شیخ عبدالرحمٰن لابی میں بیٹھے تھے۔ بغلگیری اور گفتگو کے بعد ہم نے پوچھا۔۔۔ "آپ کب یہاں پہنچے؟" اصل میں وہ پاکستان سے سعودیہ تک ہمارے ساتھ چلے تھے۔ خیال تھا جہاں تک ہوسکا۔ اکٹھے سفر کریں گے۔ مگر ان کے ساتھ بھی امریکن ایکسپریس والوں نے نوعمر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

معشوق والا برتاؤ کیا تھا۔ سو وہ ایک دن بعد آئے تھے۔ رات دیر سے پہنچے تھے اس لیے آکر سو گئے تھے۔

اور اب ہمارے بارے میں منادی کرانے والے تھے کہ ہم نے انھیں جالیا۔ انھیں اپنا پروگرام بتایا اور وہیں سے فون کر کے مزید ٹکٹوں کا بندوبست کیا۔ تاکہ مل کر سارا شہر دیکھیں۔ اب تک تنہا سفر کیا تھا۔ ہم وطن ہمسفروں کی موجودگی کے احساس سے ساری قنوطیت آپ ہی مٹ گئی اور ہم ریوالی روڈ کی طرف چلے.....

اسی سڑک پر ٹورسٹ بسوں کا اڈہ ہے۔

وہاں بے شمار کمپنیوں کی بسیں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ کوئی ابھی ابھی آئی تھی اور کوئی ابھی جانے والی تھی مگر ہماری بس کہیں نظر نہ آئی۔ ہم اپنی عادت سے مجبور، حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک گھنٹہ پہلے آگئے تھے۔ خیال تھا، پہلے سے جاکر اچھی سی سیٹ پر قبضہ کرلیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خوش فکرے آکر ٹوٹ پڑیں اور ہمیں ساری سیر کھڑے ہو کر کرنی پڑے۔

اگر ہم اللہ کے فضل سے مرد ہوتے تو یہ ایک گھنٹہ کسی نیک کام میں صرف کرتے یعنی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر آتی جاتی پتلی کمروں اور بھرے بھرے کولہوں والی گوریوں کو تاڑنے میں ہی گزار دیتے۔

مگر عورتیں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوتی ہیں۔ جو لطف مردوں کو عورتوں کے گھورنے میں آتا ہے وہی مزہ عورتوں کو ونڈو شاپنگ میں آتا ہے۔ خرید و فروخت تو خیر اپنے اپنے پرس کے ظرف پر منحصر ہے۔ بھلا تھوڑی دیر للچانے میں کسی کا کیا جاتا ہے۔

ہم مردوں پر قدغن نہیں لگا سکتے۔

مرد ہمیں نہیں روک سکتے۔

سو فخر بھابھی کو ساتھ لے کر ہم ریوالی شاپنگ سنٹر کی جانب رجوع ہوئے۔

ایک احتیاط ہم نے ملحوظ رکھی۔ اتنی دور نہیں جاتے تھے جہاں سے بس کا روٹ نظر نہ آئے۔ بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کوئی ستم ظریف ہماری سیٹ لے لے گا اور ہم ٹکٹ ہاتھ میں پکڑے یونہی کھڑے رہ جائیں گے۔ وطنِ عزیز میں تو ایک ہی سیٹ کی دو دو بار بکنگ ہوتے دیکھی ہے اور ایک پلاٹ کو تین تین گاہکوں کے ہاتھ فروخت ہوتے دیکھا ہے دلال صاحب تینوں پارٹیوں سے پیسے لے کر روپوش ہوتے دیکھے ہیں اور تین اچھے انسان عدالت کے دروازے پر کھڑے ایک دوسرے پر غُراتے دیکھے ہیں۔

ریوالی روڈ پیرس کے اندرونِ شہر میں ہے۔

مگر قیمتیں وہی شانزے لی زے والی۔ زیادہ تر دکانوں پر عورتیں براجمان ہیں۔

ہم نے مسکرا کر جس چیز پر ہاتھ رکھا، بعد میں اٹھالیا۔ بس ٹھیک وقت پر آگئی۔ ڈرائیور نے ایک مترنم سی وسل دی تو سارے سیاح برساتی پتنگوں کی طرح اِدھر اُدھر سے نکل کر بس کی طرف لپکے۔

تب ہمیں پتہ چلا کہ ایک ہم ہی کشتۂ تیغ تمنا نہ تھے، باقی سب سیاح بھی ونڈو شاپنگ میں مگن تھے۔

یہ ڈرائیور عجیب خبط الحواس تھا۔ ایک تو ٹھیک وقت پر آگیا، اس پر ننھی سی ایک وسل بجا کے یوں اطمینان سے سٹیرنگ سنبھال لیا جیسے کسی بین الاقوامی مسئلے پر اجلاس شروع کرنے آیا ہو۔ ہم اس پابندیٔ وقت اور مستعدی عادت کے بالکل عادی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بس کا ڈرائیور وقت کا شہنشاہ ہوتا ہے۔

وہ چائے کی دکان پر جب تک چاہے بیٹھا رہتا ہے.... پہلے کنڈیکٹر کو جائزہ لینے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ کنڈیکٹر آکر ہارن کے پھولے پھولے پیٹ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پر الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگتا ہے۔ ہارن بھیانک آوازوں کے ساتھ چیخنے لگتا ہے پھر کنڈیکٹر براہِ راست بھی سواریوں سے مخاطب ہوتا ہے اور زور زور سے چلاّتا ہے :

آؤ... آؤ... بس جانے والی ہے۔

جب تک بس کی آخری سیٹ فل نہیں ہو جاتی، وہ بولتا رہتا ہے۔

اور جب آخری سیٹ بھی پُر ہو جاتی ہے بلکہ بیس تیس سواریاں ڈنڈوں کے ساتھ لٹک جاتی ہیں تو پھر ڈرائیور کی طرف منہ کر کے زور سے کہتا ہے :

استاد جی! آجاؤ۔ بس بھر گئی ہے۔

استاد جی تو من کے موجی بھی ہوتے ہیں۔ اگر آنے میں دیر لگائیں تو سواریاں گرمی اور حبس کے مارے احتجاج کرنے لگتی ہیں۔ اس وقت کنڈیکٹر ان کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے گندم کی بوریاں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوں اور حقارت سے کہتا ہے :

"شور مچانا ہے تو اُتر جاؤ۔ بس تو اپنی مرضی سے جائے گی۔"

اس پورے عمل میں دو گھنٹے زائد تو لگ ہی جاتے ہیں۔

ہم اسی خیال سے ہی نرم نرم قدموں سے چلے آرہے تھے۔ ہماری چال دیکھ کر ڈرائیور نے دو مرتبہ کلائی کی گھڑی دیکھی۔ پھر اس طرح کا منہ بنایا جیسے کہہ رہا ہو :

"میں اپنے وقت پر چل پڑوں گا۔ تم دیکھتی رہیو۔"

یہ بس ڈبل ڈیکر تھی۔ جب دیہاتی شہر کی سیر کرنے آئیں تو ہمیشہ ڈبل ڈیکر کی اُوپر والی منزل میں بیٹھتے ہیں۔ بلکہ ایک دیہاتی نے تو اپنے شہری دوست سے بے چین ہو کر سوال کر ڈالا تھا :

"یار اوپر والی چھت کا ڈرائیور کہاں ہے؟"

ہم بھی اوپر والی چھت پر آ بیٹھے۔ ایسی آرام دہ اور شفیق سیٹیں کہ جی چاہا عمر بھر کے لیے یہیں ٹک جائیں....

لیجیے اس بار چھتری اُٹھائے ایک شیروانی والے بزرگ ہمارے ساتھ آکر بیٹھ گئے۔ آخر ساری بزرگی ہماری قسمت میں کیوں لکھ دی گئی ہے۔

ہم نے جلدی سے اپنی دوربین نکال کر آنکھوں پر لگائی اور خواہ مخواہ اندر باہر دیکھنے لگے۔

اس بس میں بے شمار قومیتوں کے سیاح تھے مگر گورے سب ایک سے لگتے ہیں جب تک ان کا قد چھوٹا، ناک چپٹی، آنکھیں پھولی پھولی، رنگت سرسوں کا پھول اور لباس بالکل مختلف نہ ہو...

بس میں ایئر فون نصب تھے۔ غور کیا تو سات زبانوں کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک عربی زبان کا بھی تھا۔ بہت ڈھونڈا مگر اردو کا بٹن ملا ہی نہیں۔ عربی زبان کا ہم بہت احترام کرتے ہیں۔ اگر دو عرب آپس میں گالی گلوچ بھی کر رہے ہوں تو ہم احتراماً سر پر دوپٹہ اوڑھ کے دوزانو بیٹھ جاتے ہیں۔

ایک بار ہم سے ایک غیر ملکی دوست نے سوال کیا تھا :

"آپ لوگوں کے عربوں کے ساتھ گہرے ناطے ہیں بلکہ محبت کے ناطے ہیں، حالانکہ آپ کی زبان مختلف ہے۔ کیوں؟"

ہم نے جواب دیا :

"ہمارے ان کے مذہب کے ناطے ہیں۔ روح کے ناطے ہیں۔ اس لیے گہرے اور پائیدار ناطے ہیں۔"

انھوں نے پھر پوچھا :

"مذہب کے علاوہ آپ کی اور ان کی کونسی قدر مشترک ہے؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم نے جواب دیا:

"قدر تو نہیں بتائیں گے البتہ ایک ناقدری ضرور مشترک ہے!"

بولے "کونسی؟"

ہم نے کہا:

"عرب جو سلوک اپنی موٹر کے ساتھ کرتے ہیں، پاکستانی وہی سلوک اپنی بیوی کے ساتھ کرتے ہیں۔"

بس اپنے صحیح وقت پر چل پڑی۔

تھوڑی سی شُدھ بُدھ انگریزی میں ہی رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم نے انگریزی والا بٹن دبا دیا۔

بڑا کٹھن مقام آگیا۔ ذہن اور آنکھ میں جنگ ہونے لگی۔ کبھی آنکھ باہر کے نظاروں اور عالی شان عمارتوں میں ایسی محو ہوتی کہ کانوں کا ساتھ نہ دے سکتی اور جو کانوں میں آنے والی نرم و شیریں پھُوہار کی طرف بھرپور توجہ دیتے تو سب کچھ آنکھ سے اوجھل ہو جاتا اور صرف معلومات رہ جاتیں۔

بڑی بُری عادت ہے ہماری...

جو کچھ دیکھتے ہیں اس کے بارے میں خود ہی اندازے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم نے جھنجھلا کر ایئر فون اپنے کان سے نکال دیا۔

اسی وقت چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک خوب صورت سی گلوری ہماری طرف بڑھی۔

پان اور پیرس میں...

ہم نے حیرت سے سیاہ شیروانی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور پوچھا:

"آپ پاکستان سے آئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ ہندوستان سے..." وہ بولے۔

"سیر کرنے کے لیے آئے ہیں؟"

"جی ہاں.... میرا بیٹا اور بہُو یہاں رہتے ہیں.... لیجیے نا؟" انھوں نے پھر گلوری کی طرف اشارہ کیا۔

ان کے ہاتھ میں صاف سُتھری چمکیلی تھیلی تھی جس میں سلیقے سے گلوریاں رکھی ہُوئی تھیں۔

"شکریہ!" ہم نے سنجیدہ انکساری سے کہا۔

ہمیں پان سے کوئی خاص رغبت نہیں۔ آپ رکھیے۔ آپ کو تو عادت ہے اور یہ نعمت یہاں عنقا ہے۔

اصرار کر کے بولے:

"اب لے بھی لیجیے... اور اس کی فکر نہ کیجیے کہ یہاں سے ملے گا یا نہیں... میری بہُو نے تو باقاعدہ پاندان بنا رکھا ہے۔"

ہم نے "نوازش" کہہ کر ان کے ہاتھ سے گلوری لے لی۔

اور پھر بے بسی سے باہر کی جانب دیکھنے لگے۔ ہمیں پان کھانے کا سلیقہ نہیں آتا۔ جانے لوگ قرص کی طرح پیک کیسے پی جاتے ہیں۔

"میرا نام محمد سلیم ہے۔"

وہ آہستہ سے بولے۔ اور انھوں نے ایئر فون اتار کے اپنی جگہ پر لٹکا دیا۔

گلوری عنایت کرنے کے بعد ان کا ارادہ گفتگو فرمانے کا ہو رہا تھا۔ اس ارادے سے بچنے کے لیے ہم نے دوبارہ ایئر فون اپنے کانوں میں ٹھونس لیا۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ پیرس میں صرف ایفل ٹاور اور شانزے لی زے ہی ہے مگر جب بس گلی گلی، کوچہ کوچہ چلی تو پتہ چلا کہ پیرس قدیم و جدید عمارات کا گلستان ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم نے جواب دیا:

"قدر تو نہیں بتائیں گے البتہ ایک ناقدری ضرور مشترک ہے!"

بولے "کونسی؟"

ہم نے کہا:

"عرب جو سلوک اپنی موٹر کے ساتھ کرتے ہیں، پاکستانی وہی سلوک اپنی بیوی کے ساتھ کرتے ہیں۔"

بس اپنے صحیح وقت پر چل پڑی۔

تھوڑی سی شُدھ بُدھ انگریزی میں ہی رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم نے انگریزی والا بٹن دبا دیا۔

بڑا کٹھن مقام آگیا۔ ذہن اور آنکھ میں جنگ ہونے لگی۔ کبھی آنکھ باہر کے نظاروں اور عالی شان عمارتوں میں ایسی محو ہوتی کہ کانوں کا ساتھ نہ دے سکتی اور جو کانوں میں آنے والی نرم و شیریں پھُوہار کی طرف بھرپور توجہ دیتے تو سب کچھ آنکھ سے اوجھل ہو جاتا اور صرف معلومات رہ جاتیں۔

بڑی بُری عادت ہے ہماری...

جو کچھ دیکھتے ہیں اس کے بارے میں خود ہی اندازے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم نے جھنجھلا کر ایئر فون اپنے کان سے نکال دیا۔

اسی وقت چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک خوب صورت سی گلوری ہماری طرف بڑھی۔

پان اور پیرس میں...

ہم نے حیرت سے سیاہ شیروانی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور پوچھا:

"آپ پاکستان سے آئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ ہندوستان سے..." وہ بولے۔

"سیر کرنے کے لیے آئے ہیں؟"

"جی ہاں.... میرا بیٹا اور بہُو یہاں رہتے ہیں.... لیجیے نا؟" انھوں نے پھر گلوری کی طرف اشارہ کیا۔

ان کے ہاتھ میں صاف سُتھری چمکیلی تھیلی تھی جس میں سلیقے سے گلوریاں رکھی ہُوئی تھیں۔

"شکریہ!" ہم نے سنجیدہ انکساری سے کہا۔

ہمیں پان سے کوئی خاص رغبت نہیں۔ آپ رکھیے۔ آپ کو تو عادت ہے اور یہ نعمت یہاں عنقا ہے۔

اصرار کر کے بولے:

"اب لے بھی لیجیے... اور اس کی فکر نہ کیجیے کہ یہاں سے ملے گا یا نہیں... میری بہُو نے تو باقاعدہ پاندان بنا رکھا ہے۔"

ہم نے "نوازش" کہہ کر ان کے ہاتھ سے گلوری لے لی۔

اور پھر بے بسی سے باہر کی جانب دیکھنے لگے۔ ہمیں پان کھانے کا سلیقہ نہیں آتا۔ جانے لوگ قرص کی طرح پیک کیسے پی جاتے ہیں۔

"میرا نام محمد سلیم ہے۔"

وہ آہستہ سے بولے۔ اور انھوں نے ایئر فون اتار کے اپنی جگہ پر لٹکا دیا۔

گلوری عنایت کرنے کے بعد ان کا ارادہ گفتگو فرمانے کا ہو رہا تھا۔ اس ارادے سے بچنے کے لیے ہم نے دوبارہ ایئر فون اپنے کانوں میں ٹھونس لیا۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ پیرس میں صرف ایفل ٹاور اور شانزے لی زے ہی ہے مگر جب بس گلی گلی، کوچہ کوچہ چلی تو پتہ چلا کہ پیرس قدیم و جدید عمارات کا گلستان ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پیرس کی قدیم عمارتیں، خصوصاً قدیم چرچ فنِ تعمیر کا عجوبہ ہیں۔ پراسرار..... قوی ہیکل.... اور جاہ وحشم کے مظہر....

قدیم گرجاؤں کو باقاعدہ مجسموں اور بتوں سے مزین کیا جاتا تھا۔ یعنی گرجا گھر کی چھت پر، باہر والی چار دیواری پر، اور بڑے دروازوں کے باہر مختلف شکلوں اور مختلف حجم کے مجسمے نصب ہیں۔ یہی مجسمے پرانے زمانے کی ہر عمارت خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، پر نظر آتے ہیں۔ پھر شہر کے چوراہوں میں، خصوصاً تفریح گاہوں میں خوبصورت مجسموں کے منہ یا ناف سے اُچھلتا ہوا پانی فوارے کی صورت میں نکلتا رہتا ہے۔

خاص طور پر "چرچ آف ٹرنٹی" کی پرشکوہ عمارت ایسے نادر مجسموں کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

پرانے بادشاہوں کے محلات میں بتوں اور مجسموں کی بہتات ہے بلکہ وہاں ہر دور کے بادشاہ کا بُت موجود ہے۔ نپولین کا مجسمہ تو ہم نے دیکھا بھی....

پرانے محلوں میں بعض جنگی مناظر اور واقعات کو مجسموں کی شکل میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

شاید اگلے وقتوں کے لوگوں کے پاس اتنا سکون اور وقت تھا..... یا پھر تخلیق کا یہ عمل صدیوں سے جاری وساری ہے.... کسی نہ کسی صورت میں.... اب وہی کام لوگ جدید ترین کیمروں سے لے رہے ہیں۔

عمارتوں اور چوراہوں پر نصب مجسموں کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے یہ بُت گروں کا شہر ہے۔

اور جو پتلی کمروں اور صراحی دار گردن والی ہوش رُبا خواتین کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے یہ بت پرستوں کا شہر ہے۔

یعنی ... خود گھڑتے ہیں۔ خود پرستش کرنے لگتے ہیں۔

جس طرح ہمارے ہاں شاہی قلعہ ہے جس سے ہم پرانے مسلمان بادشاہوں کی عظمت وسطوت کا اندازہ کرتے ہیں۔ ویسا ہی ایک محل یہاں بھی ہے۔ محل کے وسط میں ایک آرچ پر چار گھوڑے نصب ہیں۔ یہ محل قدیم شہنشاہوں کے جاہ وجلال کا منہ بولتا شاہکار ہے۔

اس محل کی خاص بات یہ ہے کہ اسے نہ تو صرف سیاحوں کی آماجگاہ بنایا گیا ہے اور نہ ہی یہاں کوئی بھیانک سزا خانہ ہے۔ بلکہ اس کے آدھے حصّے کو منسٹری آف فنانس کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور دوسرے حصے میں لُوور کا بہت بڑا میوزیم ہے۔

کہتے ہیں کہ لیونارڈو کا شہرہ آفاق شاہکار یعنی مونالیزا کی اصلی تصویر اسی میوزیم میں رکھی ہوئی ہے بلکہ اب تو ہر کس وناکس کو اسے دیکھنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ اسے مقدس امانت کی طرح تالوں میں رکھا گیا ہے۔ ضرور کسی بدنیت نے بُری نگاہ ڈالی ہوگی۔ اسی لیے تو کہتے ہیں۔ اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے۔

ہمارے دل میں خواہش ابھری کہ اے کاش ہمارے پاس وقت ہوتا اور ہم اپنی آنکھوں سے مونالیزا کا دیدار کر کے جاتے اور اپنے وطن میں جا کر نیلے گنبد میں بکنے والی مونالیزا کی تصویروں کی تائید یا تردید کر سکتے۔

ہم ایک سینما ہال کے آگے سے گزرے چلے جا رہے تھے۔ اس کا نام دیکھ کر چونک اُٹھے تھے اس پر لکھا تھا "نپولین"۔ اس سے پہلے ایک تھیٹر گزرا تھا جس کا نام تھا "ڈی شیلے"۔

اس شہر میں تھیٹروں اور سینما ہالوں کی بہتات ہے۔ بڑا شہر جو ہوا۔ اور پھر دنیا بھر کے بگڑے نواب اور بنے ہوئے شہزادے دلبستگی کی خاطر پیرس ہی کا رُخ کرتے ہیں۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ شاہ کے زمانے میں ایرانی امراء کی بیگمات صرف

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بال سیٹ کروانے کے لیے صبح کے بہانے سے پیرس جاتی تھیں اور شام کو آکر ڈنر میں شامل ہوتی تھیں۔

"پیرس فرانس کا مصروف ترین شہر ہے۔"

گائیڈ کی آواز آرہی تھی۔

"یہاں ہزاروں کمپنیاں کام کرتی ہیں۔ ایک سو ستر لائبریریاں ہیں (قسم کھا کے بتائیں یہاں لوگوں کو پڑھنے کی فرصت ملتی ہے؟) ساٹھ عجائب خانے ہیں.... ہم مانے لیتے ہیں۔ جدید دور نے ناجائز بچوں کی طرح عجائب گھروں کا رواج ڈالا ہے۔

یہ شہر ریستورانوں کا شہر کہلاتا ہے۔ اس قدر ریستوران ہیں یہاں کہ انھیں شمار کرنے کے لیے ایک ہفتہ درکار ہے۔ ایک ایسا ریستوران بھی ہے کہ جس میں سو قسم کے صرف پنیر ملتے ہیں۔

افسوس ہم ابھی اتنے مہذب نہیں ہوئے کہ صرف پنیر کھانے کی غرض سے ایک ہفتہ اور پیرس میں ٹک جائیں۔ ویسے بھی بچپن میں ہمارے گھر مائی اللہ جوائی رہتی تھی۔ جب کبھی دودھ پھٹ جاتا تو وہ اسے سفید ململ کے کپڑے میں باندھ کر رسی پر لٹکا دیا کرتی تھی اور کہتی تھی ایک دن کے بعد یہ پنیر بن جائے گا۔

جب سے ہم نے اماں اللہ جوائی کے ہاتھ کا بنا ہوا پنیر کھایا ہے، پنیر سے رغبت بالکل ختم ہو گئی ہے۔

ریستورانوں کا ذکر آیا تو بس خود بخود ایک ریستوران کے آگے رک گئی۔

ہم نے فرانسیسیوں کے آدابِ مہمان نوازی کو دل سے سراہا کہ دیکھیے کس قدر خوش اخلاق قوم ہے۔ پہلے تین گھنٹے شہر میں گھمایا.... کان بھی کھائے اور بھیجا بھی.... اور اب تواضع کی خاطر ریستوران میں لے آئے ہیں۔

واہ واہ بھئی، واہ، واہ....

سارے سیاح دوربینیں اور کیمرے سنبھالے اترنے لگے۔ ہم بھی اپنا قلم اور ڈائری پکڑ کے نیچے آگئے۔ اور فقیر کے پاس کیا ہوتا؟

بس سے اتر کر ہم نے غور کیا تو سب سیاح جوڑے تھے۔ بوڑھے کے ساتھ بوڑھی.... جوان کے ساتھ جوان جہان.... ادھیڑ کے ساتھ ادھڑی ہوئی...

ہم تنہا تھے.... یا وہ گلوری والے بزرگ۔

ان کا خیال آتے ہی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا.... وہ بڑی سعادت مندی سے بالکل ہمارے پیچھے کھڑے تھے۔

اللہ انھیں واصل جنت کرے۔ ہم نے دل میں دعا دی۔

ہم نے ان غیر ملکی سفروں میں زیادہ تر بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے جوڑے تفریحی سفروں پر جاتے دیکھے ہیں۔ یعنی عمر کا پہلا آشوبی اور آتشی دور گزار کے... بال بچوں کو کسی مرحلے پر پہنچا کے.... اور بعض اوقات تین چار شادیاں اور بیس تیس جنگیں لڑ کے.....

ان کی بے قرار روح کو قرار آجاتا ہے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان ملکوں میں عورت اور مرد دونوں جفاکشی کی زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں...

ریٹائرمنٹ تک غالباً یہ اتنی رقم پس انداز کر لیتے ہیں.... کہ مل کر ساری دنیا یا آدھی دنیا دیکھ سکیں.... چل چلاؤ سے پہلے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کے۔ اللہ کی خوبصورت زمین کی خوبصورتیاں سمیٹنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ممکن ہے اس عمر میں بھی کسی پڑاؤ پر نظریاتی تصادم ہو جاتا ہو اور بوڑھا غصے میں کہتا ہو ؎

جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

اور بوڑھی منہ بسور کر تان لگاتی ہو:

"جو ممکن ہو تو لوٹا دو میری آہیں میرے نالے"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

خیر....

اس عمر کے لوگوں کو ایک ساتھ سفر کرتے دیکھ کر ہمیں بڑی تسکین ہوتی ہے۔ اور امید کے دامن میں سر رکھ کر سوچتے ہیں۔ ضعیفی میں صاحب عالم کا ساتھ اور ہاتھ میسّر آئے گا.... اور ٹمٹماتی آنکھوں سے ایک بار دنیا دیکھنے نکلیں گے۔ رات کو بے تحاشا گولیاں کھا کر سویا کریں گے اور صبح کے وقت بے بات ہنس پڑا کریں گے...

یوں ایک دوسرے کو جی جی کہیں گے جیسے "ہنی مون" منانے آئے ہوں.... ویسے راز کی بات ہے۔ ہمارے ساتھ تو "ہنی مون" میں بھی جی جی نہیں ہوئی تھی۔

دیکھئے جانا تھا ریستوران کے اندر اور ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

سارے مسافر یوں قطار باندھ کے ریستوران کے اندر چلے گئے جیسے چیونٹیاں رینگتی ہیں۔

یہ بھید اندر جا کر کھلا کہ... "دست خود دہانِ خود" والا معاملہ ہے اور زد بھی آپ کی اپنی جیب پر ہے۔ چاروں طرف لوگ برگر، سینڈوچ اور فرنچ فرائز کھا رہے تھے۔ ہم نے ایک کوک خریدا اور ٹورسٹ شاپ کی طرف بڑھے جو ریستوران کے اندر تھی۔ اس کے ایک کونے میں بک سٹال بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی سوچا۔ یہاں سے پیرس پر کوئی کتاب خرید لیتے ہیں اور سیدھے سیدھے اس کا ترجمہ کر کے سفرنامہ چھاپ دیں گے۔ اس طرح اپنے وطن میں کم از کم ہمارا نام.... سفرناموں کے مصنفین میں تو ضرور آجائے گا۔

مگر افسوس وہاں اچھی کتابیں سب فرانسیسی زبان میں تھیں۔ جس طرح یہاں کے لوگ فرانسیسی کے علاوہ کوئی زبان بولنا پسند نہیں کرتے۔ انگریزی آتی بھی ہو تو صاف مکر جاتے ہیں۔

ہم کیا کریں...؟ ہمیں انگریزی نہ بھی آتی ہو تو بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ڈرائیور نے وہی معشوقانہ سی وسل دے دی۔

اور سارے مسافر اچھے بچوں کی طرح ریستوران سے نکل نکل کر بس کی طرف آنے لگے۔

بس میں صرف اتنے ہی مسافر تھے جتنی سیٹیں تھیں۔ کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ کوئی مسافر ڈنڈے کے ساتھ لٹکا ہوا نہیں تھا۔ جو جہاں پہلے بیٹھا تھا، وہیں پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

نوجوان عشق پیشہ جوڑے ہمیشہ سینما ہال اور بس کی آخری سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔

"پیرس فرانس کا دار الخلافہ ہے...."

ٹیپ پھر چلنا شروع ہو گئی....

جب ہم معصوم تھے اور سکول میں پڑھتے تھے (کاش زندگی بھر سکول میں رہتے) تو ہمیں کبھی زرافے میں اور دار الخلافے میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کئی بار دار الخلافے کو زرافہ لکھا اور مار کھائی۔

ہمارے اسی زمانے میں ہماری ایک بڑی لائق فائق سہیلی ہوا کرتی تھی۔ اسے ہم جغرافیہ دان سمجھتے تھے۔

ایک روز ہماری مس نے دریافت کیا:

"کھٹمنڈو کیا ہے؟"

ہماری سہیلی نے جھٹ ہاتھ کھڑا کیا اور جلدی سے اُٹھ کر جواب دیا۔

"نیپال کا بیت الخلار"

ہم دوبارہ مشہور کسینو ڈی پیرس کے آگے سے گزرے اس کشادہ اور قدیم ترین عمارت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ تقریباً دنیا بھر کے مشہور سیاستدان لارڈز، شاعر، ادیب اور شہنشاہ یہاں آکر آپرا دیکھ چکے ہیں۔ اگر ان کی یادگاریں محفوظ کر کے اس آپرا میں رکھی جاتیں تو اب تک یہ بھر چکا ہوتا۔

PUNJABISTAN.BLOGSPOT.COM

اس کے بعد دوسرا نمبر نیشنل اکیڈمی آف میوزک کا ہے جس کے ہال میں بیک وقت دو ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

اب ہماری بس اختتامی روٹ یعنی کنکارڈ سکوائر میں داخل ہوئی یہ چوک پیرس کا ایک خوب صورت ترین تفریحی چوک ہے اور دنیا کے چند مشہور و معروف چوکوں میں سے ایک ہے۔ یہ چوک بھی اسی طرح سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے جس طرح لندن کا ٹرافلگر سکوائر.... مگر بلاشبہ یہ ٹرافلگر سکوائر سے زیادہ صاف، زیادہ پرکشش اور پرنظارہ ہے۔

اس کے قریب ہی ایک کنکارڈ آپرا بھی ہے۔

اس چوک میں پانی کے اندر عورتوں کی دلکش مورتیاں نصب ہیں جنھوں نے اداسے مچھلیاں ہاتھوں میں پکڑ رکھی ہیں اور مچھلیوں کے مُنہ سے پانی کے فوّارے اُبل رہے ہیں۔

بس ایفل ٹاور کے آگے جاکر رُک گئی۔

سیاحوں کا یہاں بھی وہی ہجوم بلکہ لفٹ کے ذریعے اُوپر جانے والوں کی لائن تو لمحہ بہ لمحہ لمبی ہوتی جارہی تھی۔

ایفل ٹاور میں جو خاص بات ہمیں نظر آئی وہ یہ کہ اسے ایک جگہ کھڑے ہوکر نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ دور و نزدیک سے چاروں طرف سے گھُوم کر.... اور مختلف زاویے بنا کر دیکھنا چاہیے....

ان ملکوں میں اگر کچھ دیکھنے کو ہے تو وہ ان کی صفائی کی عادت اور تنظیم کی تربیت ہے۔

اور اگر ان ملکوں سے کچھ لے کے جانا چاہیے تو وہ دیانت دارانہ کام کی عادت ہے

کام کے وقت کام تفریح کے وقت تفریح....

خواہشوں کے صنم کدے :

جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے تو "ڈبّی بازار" لاہور کا ایک مشہور بازار ہُوا کرتا تھا۔ اسے لاہور کا "ڈاؤن ٹاؤن" کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ تر خواتین یہیں شاپنگ کرتی تھیں۔ کم از کم یہاں ہر شے انارکلی سے سستی دستیاب ہوجاتی تھی انقلاباتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اب بنی سجی انارکلی دوسری بیوی کی شکل اختیار کرچکی ہے تو ڈبی بازار کا کیا حال ہوگا؟ زمینداروں میں رواج ہوتا ہے ایک منگنی بچپن میں ہی کردیتے ہیں۔ صاحب زادے کو اگر شہر کی ہوا نہ لگے تو وہ اس سے شادی کرلیا کرتا ہے۔ ورنہ بے چاری زندگی بھر ٹھنڈی آہیں بھرتی اس کے نام پر بیٹھی رہتی ہے ڈبّی بازار بھی اب ایسی ہی سہاگن بیوہ کی شکل اختیار کرچکا ہے کیونکہ سُنا ہے اندرونِ شہر کی خواتین بھی اب.... لبرٹی مارکیٹ اور مال روڈ سے شاپنگ کرنا پسند کرتی ہیں۔

ہاں تو جن دنوں ڈبّی بازار جوبن پر تھا جونہی خواتین خریداری کے لیے اس بازار میں داخل ہوتیں، دکاندار اس قسم کی صدائیں لگاتے تھے :

بھین جی کیہہ لینا اے ؟ (بہن جی کیا لینا ہے؟)

آپاں جی ایدھر آؤ! (آپا جی ادھر آئیں!)

باجی جی دیکھ جاؤ۔ (باجی جی دیکھ جائیں)

اماں جی کیہہ وکھانواں ؟ (اماں جی کیا دکھاؤں)

اور کبھی ایسا ہوتا کہ ایک سی آوازیں بے شمار دکانوں سے آنے لگتیں۔ تنک مزاج بیگمات اس صورتِ حال سے گھبرا جاتی تھیں۔ ایک بار ایسی ہی ایک دل جلی بیگم چلی جا رہی تھی اور دکاندار بار بار کہہ رہے تھے :

YOUBISTAN.BLOGSPOT.COM

آپاں جی کیہہ لینا اے (کیا لینا ہے)

کیہہ لینا اے....

کیہہ لینا اے....

انھوں نے جل کر کہا :

"تمھارا کلیجہ لینا ہے۔ دو گے....؟"

"اندر آجائیں۔" دکاندار نے آہستہ سے کہا۔

یہ بازارِ خواہشوں کے صنم کدے ہوتے ہیں۔

GALLERIE LAFAYETTE

آج ہم پیرس کے عظیم ترین اور دنیا بھر میں مشہور سٹورز دیکھنے نکلے تھے.... تقریباً تمام بڑے آدمی جب یہاں آتے ہیں تو ان سٹورز سے شاپنگ ضرور کرتے ہیں۔ گیلریز سٹورز دو بڑی بڑی گنبد نما گول عمارتوں میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے واقع ہیں.... ذرا آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں.... اگر ہم اتفاق سے دنیا کے سب سے بڑے سٹورز کے سامنے اُتار دیے جائیں اور اسے اندر سے دیکھے بغیر چلے آئیں تو کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ ہمیں ان سٹوروں تک جانے کے لیے ریوالی روڈ سے صرف چند قدم اور چلنا پڑتا تھا۔ اگر خریداری کرنا مقصود ہو تو خواتین چند قدم تو کیا ساری عمر چل سکتی ہیں۔

لیکن سرِ راہ فٹ پاتھوں پر پھیری والوں اور مجمع لگانے والوں نے ہمیں ایکدم ڈبّی بازار کی یاد دلادی۔

ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے تھے مگر ہمیں یقین تھا کہ وہ کچھ اس قسم کی آوازیں نکال رہے تھے :

مادام کیا لینا ہے

ادھر آئیں

یہاں سب کچھ ہے پیارے

اور ان کی ایسی آوازوں پر واقعی راہ گیر مکھیوں کے ڈھیر کی طرح ان کی طرف لپک رہے تھے۔

گیلریز سٹورز کے باہر ہی تھڑے پر ایک پتلی کمر والی چست و چالاک گوری فراک بیچ رہی تھی۔ وہ اپنی قینچی جیسی زبان میں کچھ کہتی اور مشینی انداز میں فراک اٹھا کر مجمع کو دکھاتی اور پھر اپنی چھاتی کی کھونٹیوں پر لٹکا کر ادا سے گھوم جاتی کہ اس بہانے لوگ پچھلا بھی دیکھ لیتے.... ہمیں تو کچھ اس طرح سمجھ آئی.... جیسے کہہ رہی ہو :

"دیکھو دیکھو.... یہ جادوئی پیراہن ہے.... پھونک کے رکھ دیتا ہے۔"

"برائے نام.... بالکل برائے نام... ذرا اپنے مرمریں جسم پر اسے سجا کر تو دیکھو۔"

اس ایک للکار پر کئی گوریاں گورے گورے ہاتھ آگے بڑھا دیتیں اور ہلکے ہلکے فراک بے تحاشا بکنے لگتے۔ ہمارے ہاں اس ترکیب سے "سُرمۂ محبت" "تعویذِ محبت" یا "دانتوں کا منجن" بیچا جاتا ہے۔ ہمیں تو اپنی نوخیزی میں بھی "سُرمۂ محبت" یا "تعویذِ محبت" کا اثر دیکھنے کی مہلت نہ ملی تھی۔ کیونکہ ہمارے ساتھ معاملہ کچھ یوں ہوا تھا۔

"کالی تیتری کما دوں نکلی تے اُڈ دی نوں باج پے گیا۔"[1]

اس لیے ہمارا دل بھی للچایا.... ان ترکیبوں کو آزمانے کے لیے.... سوچا یہاں سے ایک فراک خرید لیتے ہیں.... "فراق" کی راتیں گزارنے کے بعد جس کا طلسمی اثر دیکھیں گے....

افسوس کہ ڈھیروں فراک اٹھا کر دیکھنے کے باوجود کوئی بھی فراک ہماری حیثیت اور ہمارے سائز میں فٹ نہیں بیٹھا۔

[1] جونہی ایک کالے پروں والی تیتری گنّے کے کھیتوں میں سے نکلی، اسے باز جھپٹ کر لے گیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہر چند کہ ہم پیرس سے ہو کر جا رہے تھے مگر ایسے بے حیا بھی نہیں کہ بنیان نما قمیض خرید کر لے جائیں.... اتنے میں دوسری آوازوں نے چونکا دیا... اس طرف متوجہ ہوئے... ایک لنگور کی تھوتھنی والا گورا ریڑھی پر بے شمار چیزیں رکھے لوگوں کو دعوتِ عام دے رہا تھا۔ ہم نے سمجھا یہ وہی ریڑھی ہے جس پر ہر مال کی قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے۔ ادھر چل پڑے....

سلائی کی ننھی ننھی پلاسٹک کی مشینیں رکھی تھیں وہاں.... ہم نے سوچا کہ پیرس سے یہی عجوبہ لیے چلتے ہیں.... اس کے قریب گئے۔ مشین کی قیمت پوچھی... مگر وہ ہماری کہاں سنتا تھا۔ اس کی زبان تو ریل گاڑی کی طرح چل رہی تھی۔ ریل گاڑی بھی ایسی جو کسی اسٹیشن پر نہ ٹھہرتی ہو۔ ہم نے بارہا کہا اس کی قیمت کم کرو مگر وہ جو کروں والے انداز میں.... تماشا کرتا جاتا۔ ہماری بات کی طرف دھیان ہی نہ دیتا۔ بہت دیر بعد یاد آیا کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتا۔ پوچھا تو اس نے بہت بُرا منایا۔ ہماری بے بسی کو ساتھ والی گوری نے تاڑ لیا۔ وہ سوٹ کیس اور پرس کا ریڑھا لگائے کھڑی تھی۔

ہم نے اس کی ملیح صورت پر مسکراہٹ کا سایہ دیکھا تو پوچھا۔

انگریزی جانتی ہو؟

بولی

تھوڑی تھوڑی....

عرض کیا۔

اس مشین کی قیمت کم کراؤ۔

اس نے گورے لنگور سے سفارش کی۔

وہ اس طرح چیخا جیسے ہمارے سر میں کچھ دے مارے گا۔ گوری شرمندہ سی ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ بولی:

"قیمت کم نہیں ہو گی۔"

ہم نے دکاندار کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر لکھا تھا:

"لینا ہے لو نہیں تو آگے ہو۔"

ہم نے غصّہ کھا کر ایک کھلونا مشین خرید لی۔ اور قدم بڑھا کر گیلریز سٹورز کے اندر گھس گئے۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ہم کوئی ایسے گرے پڑے ہوئے نہیں ہیں کہ ریڑھیوں اور فٹ پاتھوں پر شاپنگ کرتے پھریں...

اندر پہنچ کر جو آنکھ کھلی تو پھر جھپکنا بھول گئے.... یونہی راستے میں کھڑے کھڑے پتھر ہو گئے.... بے شمار منزلیں.... بجلی کی سیڑھیاں اوپر نیچے آتی جاتی ہوئی.... ملبوسات.... ملبوسات.... افراط.... چکا چوند....

وہ تو کسی گاہک نے "ایکسکیوزمی مادام" کہہ کر خوابوں کے جزیرے سے نکال دیا۔ اور ہم یہ دیکھ کر شرمندہ ہوئے کہ بیچ راہ میں کھڑے پتھرائی آنکھوں سے اک اک شے کو دیکھ رہے ہیں۔ تب ہمیں خیال آیا کہ یہ لاہور کی لبرٹی مارکیٹ نہیں ہے کہ جس میں خوش فکرے جہاں چاہیں کھڑے ہو جائیں۔

ان سٹوروں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اگر آپ کی جیب میں پیسہ ہے تو آپ صرف ایک خالی گھر خرید کر ان کے اندر چلے جائیں۔ واپسی پر ضروریاتِ زندگی کی ہر شے آپ کے ساتھ ہو گی۔

خیر ہم کوئی گھر بھرنے تو نکلے نہیں تھے۔ ہمارے پرس میں پیسے بھی کافی تھے۔ بس ایک بُری عادت ہے ہماری.... جب ہم بیرونی ممالک میں خریداری کیلیے نکلتے ہیں تو چیزوں پر لگی ہوئی قیمتوں کی چٹوں کو پاکستانی روپے سے ضرب دیتے جاتے ہیں۔ پاؤنڈ کو بیس سے، ڈالر کو دس سے، سوئز فرانک اور مارک کو پانچ سے، ریال کو تین سے.... اس کا ایک خاطر خواہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس ضرب اور تقسیم کے چکر میں پھنس کر بعض اوقات

URDUBIAN.BLOGSPOT.COM

انتہائی ضروری چیز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور تو اور اگر برگر یا آئس کریم بھی خریدیں تو اس کی قیمت بھی پاکستانی روپے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کا نتیجہ پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟

اگر انسان اپنی اوقات نہ بھولے اور روپے کی قدر و قیمت پر نظر رکھے، تو پاؤنڈ یا فرانک سے اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور پھر وہ نازک سے نازک موقعے پر بھی ایک ڈالر ایک مارک یا ایک فرانک تک خرچ کرنا گوارا نہیں کرتا۔

اس طرح رفتہ رفتہ مالدار ہو جاتا ہے۔

آسان نسخہ ہے۔ آزما کر دیکھیں۔

یہاں بھی دکانوں پر سیل کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے تو گویا یہ بدعت بھی یہیں سے ہمارے ملک میں گئی ہے۔ اس وقت ہم نے اندازہ لگایا کہ گیلریز سٹورز کی وہ چیزیں جو آؤٹ آف فیشن ہو جاتی ہیں یا پڑے پڑے خراب ہو جاتی ہیں ان کو اسی طرح فٹ پاتھوں پر رکھ کر بیچ دیتے ہیں۔ ورنہ انہی کے تھڑوں پر سیل نہ دکھائی دے۔

یہ لوگ اپنے مال پر خاطر خواہ رقم کما کے اس کی سیل لگا دیتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں پیسہ ہمیشہ گردش کرتا رہے۔ اس لیے ہر شے جلد از جلد نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سلیپر ڈی پیرس :

دنیا میں جتنے لوگ بھی سفر پر جاتے ہیں، ان کو راہ میں کچھ واقعات کچھ مشکلات ضرور پیش آتی ہیں مگر ہمیں سفر میں ہمیشہ ہمارا جوتا شکی شوہر کی طرح تنگ کرتا ہے۔ بہت سوچ بچار کر کے ٹھوک بجا کے لیتے ہیں مگر پہلے پڑاؤ پر ہی آہیں اور کراہیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ پتہ نہیں مسلسل چل چل کے پاؤں پھول جاتے ہیں یا جوتا تنگ ظرف بن جاتا ہے۔۔۔ یہاں بھی یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ ہم نے سوچا اتفاق سے دنیا

کے اتنے بڑے بازار سے گزرے چلے جا رہے ہیں۔ ایک خوب صورت سا جوتا خرید کر اہلِ ثروت کے منہ پر جوتا لگا جائیں۔

مگر اب اپنے ذوقِ جمال کی انتہا کیا بیان کریں۔ دکان کے اندر جن جوتوں پر ہم نے نگاہ ڈالی وہ دو تین ہزار روپے سے کیا کم ہوں گے۔ ناامیدی کے عالم میں باہر نکلے تو سامنے ایک فرانسیسی سلیپروں کا چھابڑا لگائے کھڑا تھا۔ جلدی سے بڑھ کر اپنے ناپ کا سلیپر خرید لیا۔ قیمت بھی ہماری ہستی کے مطابق تھی۔

سلیپر ایسا نرم جیسے نومولود کا بستر۔ قرار آ گیا۔

شام کو ہوٹل پہنچے تو ہمارے ہمسفروں نے پوچھا۔۔۔ "اتنی دیر بازار میں لگا دی۔ کیا خرید کر لائی ہیں؟"

ہم نے بڑی شان سے کہا "سلیپر ڈی پیرس"

وہ بولے "دکھائیں تو؟"

ہم نے نکال کر دکھا دیے۔

انھوں نے کہا "یہ تو بیڈ روم سلیپر ہیں اور سلیپر ڈی پیرس کہاں ہیں؟"

ہم نے کہا۔

"جو چیز پیرس سے خریدی جائے اسے ساتھ ڈی پیرس لگا دینے سے اس کی وقعت اور قیمت بڑھ جاتی ہے۔ آپ اسے سلیپر ڈی پیرس ہی سمجھیے۔"

گدھا اور عطر :

آپ نے یقیناً ایسے گدھے ضرور دیکھے ہوں گے جن پر صرف کتابوں کا بوجھ ہوتا ہے ——— آیئے! پیرس کے بڑے چوک میں آپ کو ایک ایسا گدھا دکھائیں جس پر کسی خوش ذوق نے خوشبو کا بوجھ لاد دیا ہے ———

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

گدھے کو خوشبو سے کیا نسبت ــــ؟

مگر دیکھ لیجیے۔ وہ بھرے بازار میں مجمع لگائے کھڑا ہے۔ پستہ قد گدھے پر مختلف قسم کے عطریات، کولون اور سپرے رکھے ہیں۔ بوڑھا فرانسیسی گدھے کے کان کو مروڑ کر کبھی اس کا رُخ اِدھر پھیر لیتا ہے ــــ کبھی اُدھر اور پھر پھیری والوں کے مخصوص انداز میں رواں ہو جاتا ہے :

"آؤ.... آؤ.... مہربانو!... قدر دانو!... یہ موقع نہ گنواؤ... ہر گدھ اس قابل نہیں ہوتا کہ خوشبو کا احسان اٹھائے اور ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ خوشبو کو من میں بسائے....."

لوگ بھی بڑے دریا دل ہیں۔ دیکھتے دیکھتے بے شمار فرانک گدھے پر نثار ہونے لگے.... ہم نے بھی گدھوں سے دیرینہ عقیدت کے طور پر دس فرانک کا ایک نوٹ قربان کر دیا۔

خضر کہاں ہے یارب ــــ؟

لیجیے، آخر وہی ہُوا نا ــــ؟ بہت بھروسہ تھا ہمیں اپنے ذہن اور اپنی یادداشت پر۔ اس لیے تن تنہا دندناتے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ خوب صورت، کشادہ شاہراہوں اور بڑے بڑے جگمگاتے ڈیپارٹمنٹل سٹوروں کے جنگل میں ہم راستہ بھُول گئے۔

جانے کون کسے کہانی سنا رہا تھا ــــ؟

ہم جس راہ گیر کو روک کر ٹیکسی سٹینڈ کا پتہ پوچھتے تو اس کا چہرہ صاف سلیٹ بن جاتا۔ ہمارے نطق کا کوئی دھبہ اس سفید سلیٹ پر نہ اُبھرتا.....

اگر آپ ایسے ملکوں میں گئے ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہاں سڑک پار کرنا کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ اللہ اپنے پیارے وطن کو پائندہ و تابندہ رکھے۔ ایسے وقتوں میں ہر بگڑے ہوتے بچے کو ماں کی آغوش یاد آجاتی ہے۔ کتنا خوب صورت بندوبست ہے۔ سپاہی کا اشارہ نظر انداز کر کے جب چاہو نکل جاؤ اور بھاگتے دوڑتے ٹریفک میں سڑک پار کر لو.... بہت سی بے رحم سڑکیں آر پار کرنے اور بلاوجہ کئی دکانوں میں گھسنے نکلنے کے بعد بالآخر ہم ایک ایسے سٹور میں پہنچ گئے جہاں ایک فرانسیسی بڑھیا کچھ انگریزی جانتی تھی۔ بڑی بی کو خوش کرنے کے لیے بتیسی تو پیش نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک سستا سا سوئٹر خریدا اور جب وہ پارسل دے کر شکریہ ادا کرنے لگی تو ہم نے جھٹ ٹیکسی سٹینڈ کا پتہ پوچھ لیا۔ اس نے ازراہِ عنایت ہمیں کاغذ پر نقشہ بنا کر سمجھا دیا۔ اللہ اس کے بڑھاپے کو شباب عطا کرے۔

ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچے تو کئی میل لمبا کیو دیکھ کر یوں لگا جیسے بقایا زندگی اپنی باری کا انتظار کرنے میں کٹ جائے گی....

مگر حیرت ہوئی.... مون سون کے بادلوں کی طرح جلد ہی مسافر ٹیکسیوں میں بکھر گئے۔ نہ لائن میں انتشار نہ بے چینی ــــ راہ گیروں کے چہروں پر انکساری اور شائستگی تھی۔ ٹیکسی والا شانِ بے نیازی سے آگے آتا۔ بیٹھے بیٹھے دروازہ کھولتا۔ سواری بٹھاتا اور بادِ صبا کے جھونکے کی طرح نکل جاتا....

ٹیکسی اور معشوق :

ہماری باری آئی تو ایک مرسڈیز ٹیکسی رینگ کر قریب آئی۔ ہم نے جلدی سے پچھلا دروازہ ہی کھولا ــــ سامان اندر پھینکا اور جلدی سے ٹِک گئے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

.... ابھی ہم سامان کے ساتھ بیٹھنے کا سلیقہ سیکھ رہے تھے کہ ایک ننھی سی غراہٹ سن کر چونک اُٹھے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو اگلی سیٹ کی پشت پر اپنی دونوں دستیاں جمائے ایک "ہڈحرام" کی نسل کا کتا ہم پر غرا رہا تھا ـــــ تب سمجھ میں آیا کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور اگلی سیٹ پر سواری کیوں نہیں بٹھاتے۔ جو ٹیکسی ڈرائیور ایسے روح فرسا دلربا نہیں رکھتے، وہ صرف چائے کی فلاسک اور ناشتہ دان اگلی سیٹ پر رکھتے ہیں....

کتے کو یوں غراتے دیکھ کر تو ہمارا خون خشک ہوگیا..... ہمیں کتوں سے کتنی شدید نفرت ہے، یہ بتانے کا موقع ہرگز نہیں تھا۔ ایک تو پہلے ہی راستہ بھول کر بھٹک چکے تھے۔ دوسرے ڈرائیور کو بڑی مشکل سے ہوٹل کا پتہ سمجھایا تھا۔ اس کے معشوق کو ناراض کرنے کا مطلب آبلہ پائی کے سوا کچھ نہ تھا..... ہم تو سکڑتے سکڑتے دور کونے میں جا لگے ـــــ اور وہ فرانسیسی مستانہ کیسٹ کی آواز میں گم، دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹیکسی اڑائے لیے جا رہا تھا....

ہماری خاموشی، سہماہٹ اور ازلی بزدلی نے کتے کو شیر کر دیا۔ اپنی کسی ڈانٹ کا جواب نہ پاکر ہماری طرف لپکا.... ہمارے منہ سے ننھی سی چیخ نکل گئی.... تب اس حاتم طائی نے کمال بے نیازی سے مڑ کر ہمیں دیکھا اور کتے کو گردن سے پکڑ کر گود میں بٹھالیا اور اپنی زبان میں دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرنے لگا۔ کتے نے صرف کان ہلانے پر اکتفا کی.... مگر اس کی زہر بھری آنکھیں ہمارے چہرے پر ہی رہیں شاید ڈرائیور نے اس کے کان میں کہا تھا:

"جن گداگروں میں دم خم نہ ہو، ان پر نہیں غراتے...."

دیکھتے ہی دیکھتے کتا اس کی گود سے نیچے اترا اور پائیدان پر سر نیہوڑا کر بیٹھ گیا۔

یہ جانوروں کو سدھا لیتے ہیں۔ ہم اب تک انسانوں کو نہیں سدھا سکے۔

پیا سے دو میٹھی باتیں :

پی آئی اے کو ملا کر پڑھیں تو پیا بنتا ہے۔ ہم کسی اجنبی سرزمین پر پیا کا دفتر دیکھ لیں تو یوں لگتا ہے جیسے میکہ نظر آ گیا۔ بے اختیار اندر کو کھنچے چلے جاتے ہیں.... مگر پیرس میں پیا والوں نے ہم سے سسرالی رشتہ داروں والا سلوک کیا۔

دراصل پیرس سے ہمارا پروگرام نیویارک جانے کا تھا مگر اب فخر بھابھی کا ساتھ ہو جانے پر، ان کے خلوص کے آگے ہم مجبور ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ واشنگٹن جانا چاہتے تھے اور جب ہم یہ ذرا سی بات منوانے کے لیے پیا کے دفتر پہنچے تو انھوں نے نیویارک کو واشنگٹن میں تبدیل کرنے کے راستہ میں اتنی کڑی شرطیں رکھ دیں جتنی پرانے وقتوں کی شہزادیاں عاشق مزاج، مہم جو شہزادوں کے جذبے آزمانے کے لیے رکھا کرتی تھیں

ہم نہ تو عاشق، نہ شہزادے ـــــ وقت بھی کم... اور دن اتوار کا۔ شانزے لی زے رات بھر کھل کھیلنے والی دوشیزہ کی طرح صبح دم خاموش اور اُجڑی اُجڑی تھی... صرف ہوائی کمپنیوں کے چند دفاتر کھلے تھے....

کسی نہ کسی کا در تو کھٹکھٹانا تھا.... اس میں یہ بھی دیکھتے چلے.... کہ اتوار کے روز بڑی دکانیں بند ہو جانے کے بعد چھابڑی والے شانزے لی زے پر آموجود ہوتے ہیں.... بالکل ہمارے انارکلی بازار کی طرح.... گوریاں اتوار کو اچھا لباس پہن کے، سج دھج کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی ہیں۔ ورنہ روزمرہ بڑا سادہ لباس پہنتی ہیں یہی وہ ممالک ہیں جنھوں نے میک اپ کی لکھوکھا چیزیں ایجاد کی ہیں۔ مگر گوریاں عام زندگی میں لپ سٹک کے علاوہ کوئی میک اپ نہیں کرتیں۔ البتہ بعض ملازمتوں کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں فل میک اپ میں آنا پڑتا ہے مثلاً ایر ہوسٹس،

ہوٹل کی ویٹریس، دفتر کی سیکرٹریاں، ہوائی اڈوں پر براجمان پریاں اور کاسمیٹکس کے سٹالوں پر بیٹھی ہوئی مہ وشیں

بالآخر TWA نے ہماری مشکل حل کر دی اور جانے کا سامان ہو گیا۔ ہوٹل میں آئے تو پتہ چلا کہ ہمارا گمشدہ سامان بھی مل گیا ہے اور الاطالیہ والے ہوٹل میں چھوڑ گئے ہیں پیا کی بے اعتنائی کا سارا غم بھول کے ہم نے اک نعرۂ مستانہ لگایا " الاطالیہ زندہ باد! "

پنچھی تے پردیسی :

ایک جگہ نہیں رہ سکتے ہماری پھوپھی ایک خوب صورت مثال دیا کرتی تھیں " بندے جیہا پکھی کوئی نئیں "... (انسان جیسا کوئی پرندہ نہیں)

اس بار ہم پیرس کے جدید ترین اور خوب صورت ترین ہوائی اڈے چارلس ڈیگال سے سوار ہوئے جب تک ہم جہاز میں سوار نہ ہو جائیں بوکھلائے بوکھلائے سے لگتے ہیں۔ اب جبکہ ہم اپنی سیٹ پر بیٹھ کے، ایک بار پیٹیاں کس کے کھول چکے تھے ——— تو احساس جاگا کہ ہم تو امریکہ کی جانب محوِ پرواز ہیں ———

ان بین الاقوامی لمبی پروازوں میں قسمت سے کوئی ہم ذوق یا ہم سخن مسافر مل جائے تو مل جائے، ورنہ ایک سیٹ پر مشرق و مغرب بیٹھے ہوتے ہیں ——— شمال و جنوب کو یکجا کر دیا جاتا ہے ——— اردو اور فرانسیسی کو ایک ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے ——— ترکی اور چینی کو ہم نشینی کا شرف بخشا جاتا ہے ——— یا پھر انگریزی اور عربی کا اتصال کر دیا جاتا ہے ———

کبھی کبھی زبان ندارد!

ہمیں دورانِ سفر گفتگو کرنے کی بالکل عادت نہیں ——— سفر میں ہم گم سُم

ہو جاتے ہیں اور ہمارا ذہن جاگ اٹھتا ہے۔ اُدھر طیارہ اڑا، اِدھر ذہن محوِ پرواز ہُوا ——— خوب صورت کہانیاں خوب صورت یادیں انمول تشبیہیں بے مول استعارے ——— اور الفاظ و احساس کے لاتعداد قافلے لوٹتے پرندوں کی طرح غول در غول چلے آتے ہیں ———

ایسے میں ہمیں صرف قلم کی زبان میں کہنا اور سننا اچھا لگتا ہے ———

اس لیے ہمیں اچھے یا برے ہمسفر کی ہمسائیگی کھلتی نہیں ———

ہم جہاز کے جس حصے میں تھے۔ وہاں مسافر کم اور دبدبہ زیادہ ہوتا ہے۔ جہازی عملے کی غیر ضروری توجہ اور بے طلب نوازش سے بیٹھے بیٹھے ایک منّی سی غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ کہیں ہم ظلِ سبحانی تو نہیں ہو گئے ———؟

اور ہوائی سفر کے اس تیسرے مرحلے میں ہمیں آپ ہی آپ علم ہو گیا کہ جہاز کے اس حصے میں مے مفت لٹائی جاتی ہے ——— یا مفت پلائی جاتی ہے ——— اسی لیے تو گورے مرد و زن دم نہیں لیتے اور اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں بار بار جام خالی کرتے ہیں ——— ہر کورس کے ساتھ پیتے ہیں اور جب تک پرواز کرتے ہیں، لال پری کے پروں پر سوار رہتے ہیں۔

جانے پرواز در پرواز کا کیا لطف آتا ہو گا ——— ہمیں کچھ تجربہ نہیں... ہم تو اس لیے خوش بیٹھے تھے کہ ان دیوانوں میں ایک ہم ہی فرزانے تھے مرزا غالب کا شعر ہمیں ہمیشہ بُرے وقتوں میں ہی یاد آیا کرتا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہمارا جی چاہا کہ ہم اس شعر میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اپنے آپ کو دانش وروں کی صف میں شامل کر لیں۔ ہم نے شعر کو یوں اذیت دی ؎

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مفت کی پیتے ہیں مے اور کہتے ہیں کہ ہاں
رنگ لائے گی ہمارا بالادستی ایک دن

پیرس سے ہمارے ساتھ ایک لال منہ والا امریکن بیٹھ گیا تھا۔ کھانا تو اس کا ہم سے برداشت ہو گیا۔ پینا برداشت نہ ہوا۔ کیا کریں لالہ فام سیال کی کوئی بھی قسم ہو، اس کی بو سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے ——

ہم نے کھڑکی کی جانب رُخ پھیرا اور قلم و ڈائری سنبھال لیے —— مگر کبھی کبھی کنکھیوں سے اپنے ہمسائے کو بھی دیکھتے جاتے تھے۔ عورت ہونے کے ناطے ہمیں دل ہی دل میں اس کے ردِّ عمل کا بھی خوف تھا —— وہی ردِّ عمل جس کی تکرار ہماری بدیسی فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔ اگر ہمارا ملک ہوتا تو ہم ذرا سی بات پر آگ بگولا ہو جاتے اور ایک ہاتھ بھی رسید کر دیتے۔ کیونکہ ہاتھ رسید کرنے اور سینڈل استعمال کرنے والی خواتین کو ہمارے ہاں بڑی پبلسٹی دی جاتی ہے۔

ویسے سچی بات بتائیں۔ اس موقع پر بولنے کے لیے ہم نے اپنی انگریزی کی گرائمر درست کر کے کچھ ڈائیلاگ بھی بنا لیے تھے کہ :

"اے میخوارو! ذلیلو —— اور خوارو!

یہ جو جہازوں میں سفر کرتی ہیں، تمھاری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہوتی ہیں افسوس! تم شراب کے نشے میں بھول جاتے ہو۔ اب جب کہ تم زمین پر ہو نہ آسمان پر فضا میں معلق ہو تو تمھارا نفس برائی سے پاک نہیں ہوا۔ ایسے فاسد جذبے زمین پر چھوڑ آیا کرو۔ کیا خبر یہیں سے تمھیں آسمانوں پر بلا لیا جائے۔ وہاں کیا مُنہ لے کے جاؤ گے ——؟"

ابھی ہم نے اتنا ہی سوچا تھا کہ گورے کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ گھبرا کر سیدھے ہو گئے اپنی ٹانگوں پر رنگ دار کمبل ڈالے وہ ——

غرقِ مے ناب غرقِ نیند ہو چکا تھا۔

اس کے خراٹے متعفن بھی تھے اور مرغن بھی!

عجیب بے تکے پن سے سویا ہوا تھا اور نیند میں اس کے ہاتھ پاؤں یوں پھیلتے جا رہے تھے جس طرح ذبیحہ بھینس اکڑتی جاتی ہے۔ ایک سیٹ پر دو کرسیاں ہوتی ہیں اور دونوں کی حدیں مقرر ہوتی ہیں اور جیسے جیسے وہ پھیلتا جا رہا تھا، خدشہ تھا کہ روس کی طرح ہماری سرحد میں نہ گھس آئے۔

اور ہمیں یہ بھی یاد تھا کہ ان مہذب ملکوں میں اگر کسی کے خراٹے سمع خراشی کر رہے ہوں تو اس پر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم نے اس پر رحم کیا.... مقدمہ دائر نہیں کیا بلکہ ائیر ہوسٹس کو بلا کر کہا :

"ان صاحب کی پوزیشن درست کر دیں۔ یہ میدانِ کارزار میں نہیں..... جہاز میں سو رہے ہیں۔"

جب گلبدن سی ائیر ہوسٹس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے انھیں چھُوا تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ ہمارا خیال تھا انگریزی فلموں کے کلائمکس سین کا کوئی "ٹوٹا" ابھی نظر آئے گا اور وہ بے اختیار ائیر ہوسٹس کے گلے میں جھُول جائیں گے۔

مگر انھوں نے بکمال ہوشیاری.... ائیر ہوسٹس کی التماس پر ہمیں مُڑ کر دیکھا اور بڑی لجاجت سے معافی مانگ لی۔ پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو جگائے رکھنے کے لیے ایک رسالہ بکڑ لیا۔

ہم کچھ کھسیانے سے ہو گئے.... کچھ اور نہیں سوجھا تو کھڑکی کا پردہ سرکا کے باہر کی طرف دیکھنے لگے۔

کیا کریں ہمارے ہاں عورت وہی سمجھی جاتی ہے جو مرد کی نیت پر شک کرے۔

FUNDESTAN.BLOGSPOT.COM

جب ہم زندگی میں پہلی بار جہاز میں بیٹھے تھے تو ہمیں باہر دیکھتے ہوئے ہول آتا تھا۔ کلیجہ کٹ کٹ کے آنتوں میں آتا تھا... مگر اب اللہ کے فضل سے دلیرانہ شان سے بیٹھے بادلوں کی دنیا دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں اللہ کی قدرت پر نثار ہو رہے تھے۔

دُھلا دُھلایا نیلا آسمان اپنے رنگ سے زیادہ خوب صورت نظر آ رہا تھا جہاز بادلوں کی قبا چاک کر کے اوپر آ گیا تھا۔ اب جہاز آسمان اور بادلوں کے درمیان یوں تھا جیسے رضائی کے استر کے اندر رُوئی ہوتی ہے۔

دلکش دیدنی منظر.... اور دو نیلاہٹوں کے درمیان جہاز اڑا چلا جا رہا تھا.... نیچے نیلا سمندر تھا اور اوپر نیلا آسمان ——— یہ پورا سفر بحرِ اوقیانوس کے اُوپر تھا....

سمندر کی حدود شروع ہوتے ہی نشیلی ایئر ہوسٹس ایمرجنسی جیکٹ اُٹھا لائی اور ہدایات سے نوازنے لگی ——— مگر مسافروں کے چہروں کے رنگ فق ہونے سے پہلے انھوں نے جہازی فلم کا اعلان کر دیا ——— ڈراتے بھی ہیں، بہلاتے بھی ہیں...

ہم نے کافی دیر سے چُپ کی بُکّل اوڑھ رکھی تھی مگر ہمارے اندر پڑا حیوانِ ناطق مچل رہا تھا۔ اس لیے اُٹھ کر جہاز کے دوسرے حصّے کی طرف چل دیے کہ فخر بھابھی اینڈ فیملی سے گپ شپ لگا کے زبان کے جالے اتارے جائیں... وہاں پہنچے تو تقریباً سارے مسافر اونگھ رہے تھے ——— سو رہے تھے... یا خواب دیکھ رہے تھے.... انھیں دیکھ کر ہم نے دل میں کہا "کتنے نیک لوگ ہیں۔ سو رہے ہیں۔" سوئے ہوؤں کو جگانا ——— اور ستم رسیدوں کو ستانا کچھ اچھا نہ لگا.... ہم کھوٹے سکّے کی طرح اُلٹے پھر آئے۔ فلم شروع ہو چکی تھی

اور ہمارا ہمسایا گورا خراٹوں میں مست سو رہا تھا۔ اب کے ہم نے اسے جگانا مناسب نہ جانا اور اس طرح اس کی ٹانگیں پھلانگیں جس طرح بچپن میں "اڈی چھڑ پا" کھیلتے تھے اور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے.... ایئر فون لگا کر فلم دیکھنے کی کوشش کی ——— طبیعت ادھر نہیں آئی ——— تو ایئر فون نکال کر رکھ دیا۔

ہم بیٹھ کر نہیں سو سکتے.... نئے گھر میں نہیں سو سکتے.... دورانِ سفر نہیں سو سکتے.... ہاں اگر جہاز کا سفر طویل ہو تو بیٹھے بیٹھے ہمارے پاؤں ضرور سو جاتے ہیں ؎

بزمِ جاناں سے جو اٹھتا ہوں تو سو جاتے ہیں پیر
دفعتاً آنکھوں سے پاؤں میں اتر آتی ہے نیند!

سر اٹھا کر آس پاس دیکھا ——— اکثر مسافر بتیاں بجھا کر اونگھ رہے تھے۔ بھلا ایسا جنت آسا ماحول کہاں ملتا ہوگا ———؟ پیٹ بھر کھانا... نفس کے پیالے سے زیادہ شراب ——— ایئر ہوسٹس کی چکنی مسکراہٹیں.... نشہ آور ماحول ——— نہ شوہر کے کچوکے نہ بیوی کی بک بک ——— نہ کاروباری دنیا کے خنجر ——— سب نیند کے ماتے سو جاتے ہیں۔

سوئے ہوئے لوگوں پر بڑا رشک آیا۔ جس شخص کو جنت کے تختے پر بھی نیند نہ آئے تو اسے کیا کہیں گے ———؟

نیند کو بھی نیند آ جاتی ہے ہجرِ یار میں
چھوڑ کر بیتاب مجھ کو آپ سو جاتی ہے نیند

اس وقت اچانک ہمیں صاحبِ عالم کا خیال آ گیا۔ صاحبِ عالم دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ آپ کہیں گے یہاں ہم لفظ خوش قسمت کی تشریح کریں۔ ہم اپنی لغت میں اس انسان کو خوش قسمت کہتے ہیں جو ہاؤ ہُو میں۔ باجوں گاجوں میں۔

KUTABISTAN.BLOGSPOT.COM

سفر میں حضر میں —— ہر جگہ ہر عالم میں سو جاتا ہو۔ اور صاحب عالم کو تین سیکنڈ لگتے ہیں سونے میں۔ صرف اپنے آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے :

"میاں ! اب سو جا —— !"

اور ہم پوچھ رہے تھے :

"میاں میں کیسے سوؤں —— ؟"

تیسرا پڑاؤ

امریکہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

واشنگٹن میں ورود

پیرس سے ایک طویل فلائٹ کے بعد ہم لوگ دوپہر تین بجے کے قریب واشنگٹن ڈی۔سی پہنچ گئے۔ یوں لگا جیسے ایک دن ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ دوسرا شروع ہوگیا۔ گویا ہماری ایک ثابت وسالم رات ہماری زندگی کی قیمتی راتوں میں سے غائب کرلی گئی تھی۔ یہ گھپلا کچھ ہوائی سفروں میں ہی ہوتا ہے کہیں دن فرار ہوجاتا ہے ——— کہیں سے رات چرالی جاتی ہے ——— غم نہ کر اے رات ع

محشر میں تجھ کو مانگ تو لیں گے خدا سے ہم

چہرے پر اس رات کے نشان نہ تھے کہ تازہ دم نہ تھا.... سوئے نہ تھے... ہنسے نہ تھے... بولے نہ تھے۔

جہاز کے رکتے ہی اس کے دونوں دروازوں کے ساتھ بڑی بڑی لمبیں آکر لگ گئیں۔ مسافرنیاں اور مسافر جہازوں سے نکلتے ہی یوں لمبوں کے جبڑوں میں جا گھسے جیسے قلب مادر سے آغوشِ مادر میں منتقل ہوگئے ہوں بے اختیار منہ سے واہ نکل گئی۔

زندگی کو خوب صورت بنانا اور راہوں کو آسان کرنا تو کوئی ان سے سیکھے۔

بسیں بھی بڑی آرام دہ تھیں... بالکل ہوائی جہاز کی سیٹوں کی طرح....

ہم نے بہتیرا تلاش کیا، کوئی سیٹ کا اُدھڑا ہُوا پہلو اور دانت نکوستی رُوئی نظر آ جائے.... مگر مایوسی ہوئی۔ یہاں بھی وہی طریق کار تھا۔ جو پہلے آیا تھا، پہلے بیٹھ گیا تھا۔ بعد میں آنے والے کھڑے تھے۔ عورت اور مرد کی تخصیص نہیں تھی۔ ایسا امریکہ کافی آزردہ کرتا ہے۔ اس سے ہماری ٹوٹی پھُوٹی بسیں بدرجہا بہتر..... جہاں ذرا درُست حالت کی عورت کھڑی ہو تو کئی سیٹیں خالی ہو جاتی ہیں۔

ہم گنواروں کی طرح بس کے بند شیشوں میں سے اس کا جہاز کے ساتھ جُڑنے اور پھر چاند گاڑی کی طرح علیٰحدہ ہو جانے کا منظر اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے دیہاتی بچہ پہلی بار شہر آتا ہے اور بس میں کھڑکی کی طرف جا بیٹھتا ہے۔ بس ایک جھٹکے سے صحرائی جہاز کے انداز میں نیچے ہُوئی تو اس کی وہ تہہ در تہہ گردن جو جہاز کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھی ـــــ سمٹ کر اپنے ظرف میں سما گئی... اور بس چل پڑی اور تھوڑی دیر بعد اس نے ہمیں ڈلس کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کی عمارت کے اندر اتار دیا.... کتنی دیر بعد زمین پر پاؤں رکھے تھے۔ بالکل نیل آرم سٹرونگ والی کیفیت پیدا ہوئی زمین اور انسان کی کوشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

امیگرنٹ کی پُل صراط :

دوسرے ملکوں میں داخل ہونے کے لیے اجنبی باشندوں کو ہمیشہ ایک چھان بین کی پُل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں جس کا اعمالنامہ بھاری ہو،

وہ پل صراط سے گر کے سیدھا واصل جہنم ہوتا ہے مگر ان بین الملکی سفروں میں ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات مکمل نہ ہوں تو مسافر امیگرنٹ پُل صراط عبور نہیں کر سکتا، سیدھا اپنے ملک کے جہنم میں واپس آ جاتا ہے.... اس پُل صراط کو عبور کرنے سے پہلے نئے نویلے مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی ہیں۔ مگر پھر بھی دھڑکتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ اپنا پاسپورٹ اور ضروری کاغذات پکڑے ان لائنوں میں جا کھڑے ہوتے ہیں جو تمام حسرتوں کی طرح لمبی ہوتی جاتی ہیں۔

جہاز سے اُترتے ہی ایسی کئی چوکیاں نظر آتی ہیں جو اندر آتے ہی مسافروں کو دبوچ لیتی ہیں۔ ہم بھی لوگوں کی دیکھا دیکھی اپنی لائن میں جا کھڑے ہُوئے۔ اس طویل ترین لائن میں اتنی قسم کے باشندے تھے کہ اللہ میاں کی VERSATILITY پر بھی ایمان لے آئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے حشر جتنی لمبی لائن چھٹ گئی اور ہم سفید کپڑوں والے منکر نکیر کے پاس پہنچ گئے۔ لمبے قد کا گورا ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور پاسپورٹ کے صفحات کو الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں ہمارا دل پاپ میوزک کی تال پر رقص کرتا رہا.... اچانک اس نے اپنی بنٹے جیسی آنکھیں گھما کر پوچھا

"آپ پہلی بار امریکہ آئی ہیں؟"

"جی حضور!"

ہم نے اپنے ازلی احساس کمتری کے جامے میں سمٹ کر کہا۔

"کیا آپ کوئی کھانے والی چیز لائی ہیں؟"

ہم نے پھر لرزتے ہوئے کہا...

"ہمارے ہاں تو صرف قوم کا غم کھانے کا رواج ہے.... کبھی ہم اپنی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

قوم کا غم کھاتے ہیں۔ کبھی آپ کی قوم کا ——— !"

وہ بولے۔

"کوئی پینے کی شے لائی ہیں؟"

ہم نے عرض کیا۔

"ہماری شاعری میں تو بس آنکھوں سے پی جاتی ہے۔ ہم آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں۔ نہ چڑھے تو واپس بھیج دیجیے۔"

انھوں نے اپنے تبسم کے زرد تمباکو کو اخلاق کی سبز پتی میں لپیٹا اور ایک گلوری سی بنگل کے بولے۔

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

ہم نے ان کی شرم کی شرم رکھی اور پار ہو گئے ——— یعنی امریکہ کی جانب قدم رکھ لیا۔ امیگرنٹ پل صراط سے بھی آگے مقاماتِ آہ و فغاں ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں اندر جا کر پتہ چلا.... کہتے ہیں۔ جب آدمی مرجاتا ہے اور فرشتے اس کی رُوح کو لے کر چلتے ہیں تو راستے میں مختلف چوکیاں آتی ہیں، جہاں بازپرس ہوتی ہے۔

لیجیے۔ یہ دوسری چوکی کسٹم کی ہے۔

ہمارے قدم وہاں رُک گئے۔

اعمالنامہ کھلنے کا اندیشہ ہو تو کون نہیں ڈر جاتا۔

ہمارے پاسپورٹ کو نظروں سے سینکنے کے بعد انھوں نے لوٹا دیا.... ہاں تصویر دیکھنے میں ایک سیکنڈ زائد لگایا تھا۔ کیونکہ ہم نے احتیاطاً پانچ سال پہلے کی تصویر لگا دی تھی.... انھوں نے لپک کر ہمارا سوٹ کیس اٹھا لیا جو ہمارے ظرف کی طرح ہلکا نکلا۔ انھوں نے اس کو اس طرح ہلایا جس طرح خالی بوتل میں سے کاک نکالتے ہیں۔ اور دُور پھینک دیا.... اس مہذب ضرب سے دو ساڑھیاں

اور چند سوٹ کسمسائے۔ ہم نے اف کرنے سے پہلے سوٹ کیس کو بانہوں میں لے لیا۔ وہ ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے آسٹریلیا کا گوالا ساہیوال کی گائے کو دیکھتا ہے ———

ہم جلدی سے لاؤنج سے باہر نکل آئے.... آہا! ہم امریکہ پہنچ گئے۔

لاؤنج کے باہر بالکل حشر کا سا سماں تھا.... جن لوگوں نے بین الاقوامی سفر کیے ہیں وہ حشر کے دن کا خوف نہیں کھائیں گے.... نفسانفسی کا ایک عجیب عالم یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے سب کی آنکھیں پیشانی پر لگ گئی ہوں۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔

لوگ.... عورتیں.... بچے.... شور و پکار ———

آخر ساری دنیا سفر پر کیوں نکل آتی ہے ———

ہم تو خیر زندگی میں پہلی بار آسٹریا نے سے باہر آئے تھے.... اس لیے کہ کولمبس نے اپنے وصیت نامے میں واشگاف الفاظ میں لکھا تھا:

"اے گوروا! میرے بعد آنے والو ——— ایشیا کی طرف سے آئے گی ایک ہستی، جب پندرھویں صدی ہجری دم توڑ رہی ہوگی۔ بس اس ہستی کو ہاتھوں ہاتھ لینا۔ اور سمجھنا اس میں اللہ کی رضا ——— اور دینا اسے سارا امریکہ دکھا" ———

لیجیے ہمیں کوئی خوش آمدید کہنے نہیں آیا.... نہ لال قالین بچھے.... نہ پھول.... نہ جھنڈیاں.... نہ آنکھیں فرشِ راہ ہوئیں.... اللہ ان نالائقوں کو معاف کرے۔

باہر ایسی ہوا چل رہی تھی جس نے کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دی۔ گرم اور لُو موافق بالکل اپنے وطن جیسی ——— واشنگٹن کی گرمی محسوس کر کے گرمیٔ آرزو بڑھ گئی.... پھر غالب یاد آیا ع

"اِس بھی مزاج کو گرمی ہی راس ہے۔"

سردی سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہماری پیدائش بہاولپور کی ہے اور بہاولپور ملتان کا ہمسایہ ہے۔ بس یونہی ہم نے ان ملکوں کے "ٹھنڈے ٹھار" قصّے سُن رکھے تھے اور پھر سردیوں کے کپڑے بھی ساتھ نہ رکھے تھے... خیال تھا امریکہ سے خریدیں گے اور واپسی پر اعمالنامہ (سامان) بھاری کر کے آئیں گے۔

تیری میری لینڈ:

میری لینڈ امریکہ کا ایک خوب صورت علاقہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پوٹومیک دریا بہتا ہے۔ اس دریا کی وجہ سے واشنگٹن اور اس کے گردونواح کا علاقہ سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ ڈلس ائیرپورٹ سے ایک لمبی اور کشادہ سڑک شہر کی جانب جاتی ہے۔ اسے بیلٹ وے BELT WAY کہا جاتا ہے۔ یہ سڑک شہری آبادی کے گرد بیلٹ کی طرح احاطہ کیے ہوئے ہے۔ عام طور پر دُوسرے شہروں میں جانے کے لیے ـــــ یا ہوائی اڈوں کو جانے کے لیے یہی سڑک استعمال ہوتی ہے۔ اس پر خطرناک قسم کا ٹریفک نہیں ہوتا۔ اس لیے لوگ موٹریں اسّی نوّے کی رفتار سے چلاتے ہیں۔ یہاں سڑکیں ناموں سے نہیں نمبروں سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ سڑک جس پر ہم آنکھیں کھولے اور کان بند کیے جا رہے تھے۔ اس کا نمبر ۴۹۵ تھا ـــــ ۴۲۰ بھی ہوتا تو ہمیں کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

ہمارے ذہن میں ایک سوال بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ہم نے جھٹ مسز "مارکہنی" سے پوچھ لیا:

"اگر سڑکیں صرف نمبروں سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں، تو آپ اپنے ملک کے مشہور و معروف لوگوں کو خراج کس طرح پیش کرتے ہیں؟"

"عظیم لوگوں کے خراج کا سڑکوں سے کیا تعلق ـــــ؟"

انھوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔" ہم نے وضاحت کی ـــــ

"ہمارے ہاں کوئی وزیرِ وطن بم کے دھماکے میں مر جائے تو ہم ایک پُل اس کے نام پر بنوا دیتے ہیں ـــــ کوئی عظیم شاعر کسی ہسپتال کے جنرل وارڈ میں دوائیوں کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہو تو ہمیں اس کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی اور اگر وہ وفات پا جائے تو ہسپتال کا ایک ایر کنڈیشنڈ وارڈ اس کے نام لگا دیتے ہیں.... اگر کوئی بڑا ادیب رسالوں کے پیٹ بھرتا رہے اور اپنا خالی پیٹ چھپاتا رہے ـــــ تو ہم اس پر تنقید کے کوڑے برساتے رہتے ہیں.... جب وہ دنیا سے کوچ کر کے پہلی بار عقل کا ثبوت دیتا ہے تو ہم کوئی چوک کوئی چوراہا اس کے نام کر دیتے ہیں۔ اگر وقت کا کوئی نقیب اٹھے تو ہم اس کے مخلص جذبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ مذاق اس کی جان لے لے تو اس کے نام پر کوئی بڑا ہال بنا دیتے ہیں تاکہ لوگ اس "ہال" میں جمع ہو کر کسی "صاحبِ حال" کے "جمال" پر سر دُھنتے رہیں۔

ان نومولود چوراہوں، سڑکوں، پلوں اور باغوں کے مرحُوم نام رکھنے کے بعد ہم نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا کہ مغفور کے قیمتی مسوّدوں کا کیا بنا؟ بیوہ کا آخری کنگن کب بکا؟ اور یتیموں کو روٹی مل رہی ہے یا نہیں؟

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

قابلِ فخر بھابھی :

ہماری ایک بڑی پیاری بھابھی ہیں۔ جن کا نام بھی فخر ہے۔ ان کی محبت اور خلوص ہمیں واشنگٹن ڈی۔ سی لے آیا تھا۔ ان کا خوب صورت گھر میری لینڈ میں ہے۔ سارے گھر پہ پاکستان کی چھاپ ہے۔ رہتی امریکہ میں ہیں۔ دل سراسر مسلمانی رکھتی ہیں۔

ہم ہی اکیلے کشتۂ تیغِ نازنہ تھے۔ اکثر ائیر پورٹ سے لوگوں کو پکڑ کر گھر لے آتی ہیں۔ میز کھانوں سے بھر دیتی ہیں۔ علی الصبح چپکے سے کمروں کی صفائی کر جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ غسل خانے بھی خود صاف کر دیتی ہیں۔ امریکہ میں رہ کر دوسرے کا غسل خانہ صاف کرنا مجاہدۂ نفس ہے۔ سارا دن مہمانوں کو لیے لیے شاپنگ کراتی ہیں۔ شام کو آ کے باورچی خانے میں گھس جاتی ہیں۔ تھک کر فرش پر گر جاتی ہیں۔ کوئی مہمان سر پہ کھڑا ہو کے پوچھے کہ کیا ہوا؟ تو جھٹ موٹر کی چابیاں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور کہتی ہیں "کہیں جانا ہے آپ کو ——— ؟"

اگر دیارِ غیر میں کسی پڑاؤ پر فخر بھابھی جیسے دوست مل جائیں تو سفر راحت بن جاتا ہے ———

اللہ ان کو خوش رکھے ———

کچھ ایسے ستم ظریف بھی ان کے گھر آتے ہیں جو بستر پر کھانا مانگتے ہیں۔ کپڑے ان سے دُھلواتے ہیں۔ غسل خانے بے تحاشا گندے کر جاتے ہیں۔ پیسے ادھار مانگتے ہیں اور جاتے وقت شکریے کی بجائے خفگی کا لٹھ مار جاتے ہیں.... مگر انتھک اور خوش کلام فخر بھابھی بس ہر دم مسکرائے جاتی ہیں....

فخر بھابھی! آپ تو نری پاگل ہیں۔ ذی ہوش لوگوں کے جنگل میں ایک دیوانہ!

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے :

ایک تھا طوطا من موہنا سا ——— پنجرے میں آنکھ کھولی۔ پنجرے میں پلا.... زنداں کی ہوا راس آ گئی اس کو۔ مسکرا مسکرا کر ہر آنے جانے والے کو محبت بھرے نغمے سنایا کرتا تھا۔ ایک دن مالک نے خوش ہو کے اس کا پنجرہ کھول دیا ——— پہلے تو طوطا غیر یقینی انداز میں سکڑ کر پنجرے کے ساتھ چمٹا رہا.... پھر جب ٹھنڈی ہوا نے آگے بڑھ کر اس کو حوصلہ دیا تو دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک آیا.... آس پاس کسی کو نہ پا کر اعتبار آیا.... دروازے سے باہر نکلا ——— اور پھُر کر کے آسمانوں کی جانب اُڑا ——— پہلی پرواز پر دیوار سے ٹکرایا... پھڑ پھڑایا.... اور تڑپ کر نیچے گر گیا....

طوطا اُڑنے کا ڈھنگ بھُول چکا تھا.....

باہر ہلکی ہلکی دھیمی دھیمی پھوہار پڑ رہی تھی۔ میری لینڈ کا سرسبز علاقہ دُھلا دُھلایا نظر آ رہا تھا۔ ہم برکھا کے متوالے ہیں۔ شاید بادلوں کو پتہ چل گیا تھا۔ جس سرزمین پر ترسے.... گیلے موتی قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگے ———

مگر کسی کو کیا معلوم برسات میں مسلسل اداس رہنا ہمارا شغل خاص ہے۔ یہاں امریکہ میں آ کر، اتنی بڑی مہم سر کر کے.... سینے پہ ایک تمغہ سجا کے ——— ل کیسا ویران اور اداس تھا..... یہ پہلا دن تھا امریکہ میں ——— اور یوں تا تھا اپنی زمین سے ناطہ توڑے صدیاں بیت گئی ہیں.... آج معلوم ہوا زمین رشتہ کیسا رشتہ ہے ——— ؟ آج سے پہلے ہم اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے۔ ہم نے لاہور ائیر پورٹ پر بچوں کو ہنس ہنس کر خدا حافظ کہا تھا اور صاحبِ عالم کی طرف نظروں کی ایک فاتحانہ برچھی پھینک کر کہا تھا ؏

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر"

پر یہ کیسی زمین تھی... چہرے پہ آپ ہی آپ آنسوؤں کی فصل اُگ آئی تھی اضطراب جاگ اُٹھا تھا اور جدائیوں کے احساس ڈس رہے تھے ہم اپنے آنسو چھپانے کے لیے غسل خانے میں گھس گئے تاکہ جی کو ہلکا کر کے آئیں.. باہر سارا امریکہ جگمگ کر رہا تھا ——— اندر ہمارا دل خالی خالی تھا....

اسی وقت گھبرائی ہوئی فخر بھابھی دروازہ پیٹنے لگیں...

"جلدی دروازہ کھولیے۔ جلدی باہر آئیے...."

ابھی ہمارا ارادہ دروازہ کھولنے کا نہیں تھا.... انھوں نے پھر کہا۔

"لاہور سے آپ کی کال ہے"

ہم نے چٹخنی یوں کھولی جیسے آپ ہی آپ جادو سے کھل گئی ہو ؎

میں وہ مجنوں ہوں کہ اک آہ کا نعرہ ماروں
ٹھوکریں کھاتی ہوئی قبر سے لیلیٰ نکلے

لکڑی کے گھر لوہے کے دل :

رات سونے سے پہلے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا۔ یہ جو پیارے پیارے، چکنے چکنے، کرسمس کیک کی طرح سجے بنے گھر امریکی رسالوں میں دکھائے جاتے ہیں.... اور جن کے فرانسیسی دریچے اور امریکی در ہم اپنے ہاتھوں سے چھو چھو کر دیکھا کرتے تھے۔ سب لکڑی کے ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب اپنے اسی گنوارانہ انداز کے ساتھ دھپ دھپ کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں جا رہے تھے تو ہمارے نازک جسم کے بوجھ سے

نہ صرف یہ کہ سیڑھیاں ہل رہی تھیں، بلکہ دُہائی بھی دے رہی تھیں... ہلکے ظرف کی سیڑھیاں ہمیں پسند نہ آئیں جبکہ ان پر بھاری قالین بھی پڑے ہوئے تھے۔ اپنے گھر کی سیڑھیوں کے ساتھ ہم ہر وہ بدسلوکی روا رکھتے ہیں جو ناپسندیدہ رشتہ داروں کے ساتھ رکھنی چاہیئے۔ مگر وہ بے چاری اُف تک نہیں کرتیں۔

اور یہاں کمروں میں چلیں تو فرش جھومنے لگتا ہے ——— کاریڈور میں بھاگیں تو دروازے سر ہلاتے ہیں۔ کوئی سرگوشی کرنا چاہیں تو دیواریں دلآرام بن جاتی ہیں.... ان کمروں میں کوئی راز صرفِ راز نہیں رہتا۔ لکڑی کی دیواروں میں چھید ہوتے ہیں.... اوہو سمجھ میں آگیا۔ اسی لیے تو امریکہ کے بچے اور بچیاں نو اور بارہ سال کی عمر کے درمیان ہی بالغ ہو جاتے ہیں.... اور بالغانہ تجربے عاقلانہ ہوشمندی کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔

اندر سے ان گھروں کی سجاوٹ قابلِ دید ہوتی ہے۔ یہاں جو بات ہمیں پسند آئی، وہ یہ کہ گرد کا نام نہیں۔ سب مصروف خواتین پندرہ دن میں ایک مرتبہ گھر صاف کرتی ہیں۔ گھر کا مالک ہفتے عشرے میں ایک بار لان کی گھاس کاٹتا ہے۔ گھر والی ہفتے کے سات دنوں کو تقسیم کر چھوڑتی ہے۔ ایک دن سودا سلف لانا ——— ایک دن کپڑے دھونا ——— ایک دن استری کرنا ——— ایک دن ہفتے بھر کا کھانا پکانا ——— اور ایک دن ---------

ہم نے ڈرتے ڈرتے مسز "مارکہنی" سے پوچھا۔

"کیا آپ محبت کیلیے بھی کوئی دن مخصوص کر چھوڑتی ہیں؟"

"تقریباً...." انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"اوہو۔" ہم گھبرا گئے اور ہم نے کہا "جو کسی کا دل اس دن سے پہلے محبت کرنے کو چاہے.... تو وہ کیا کرے ———؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"وہ صبر کرے۔" انھوں نے کہا۔

"صبر تو صرف اپنے ملک میں ہوتا ہے۔ جہاں چار دن کی بیاہی کو چھوڑ کر سیاں دبئی سدھارتے ہیں.... کیا یہ میوہ یہاں بھی ہوتا ہے ـــــ ؟"

اس پر وہ بے تحاشا ہنسنے لگیں۔

تین حرف ایسے امریکہ پر.... ہم نے صاف کہہ دیا۔

محبت کے لیے کوئی موسم نہیں ہوتا۔ کوئی دن نہیں ہوتا ـــــ محبت تو بس سر کا سودا ہے اور آپ زندگی کو شیڈیول کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ زندگی میں تھوڑی سی بے ترتیبی ـــــ تھوڑا سا انتشار ـــــ تھوڑی سی کج روی۔ تھوڑی سی بے اصولی زندگی کو حسن بخشتی ہے... ہم اپنی زندگی کو گھنٹوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم دن اور رات کے غلام نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں لوگ اپنی طبیعت کے غلام ہیں۔ دفتر سے لیٹ ہو جاتے ہیں مگر اپنی طبیعت سے لیٹ نہیں ہوتے ـــــ

شوہر سدھار نسخہ :

ویسے یہاں آتے ہی ایک نسخہ پھوہڑ مردوں کو سدھارنے کا ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ وہ شوہر جو اپنے گھروں میں بہت زور سے چیختے ہیں اور چلاتے ہیں۔ کمرے میں گندگی پھیلاتے ہیں۔ بار بار چائے مانگتے ہیں۔ بغیر اطلاع دیے دوستوں کی فوج کی فوج بلا لیتے ہیں۔ رات کو دیر سے گھر آتے ہیں اور آتے ہی بیوی سے گھن گرج کے ساتھ کھانا مانگتے ہیں اور اس قسم کے دیگر محبت بھرے ظلم و ستم اپنی بیویوں پر ڈھاتے ہیں، ان کے لیے امریکہ بہت اچھی جگہ ہے۔

امریکہ اور یورپ کی خاتون نے مرد سے جنم جنم کے بدلے لیے ہیں، اس لیے یہ ملک بگڑے ہوئے شوہروں کو صحیح کر دیتے ہیں۔ یہاں پر ہم نے بڑے بڑے اکڑفوں اور طرم خاں جیسے شوہروں کو بھی برتن مانجھتے اور گھاس کاٹتے دیکھا ہے۔ بیوی مشین میں ڈال کے کپڑے دھوتی ہے۔ یہ استری کرتے جاتے ہیں۔ یہ آلو چھیلتے ہیں تو بیوی گوشت بھون لیتی ہے۔ مرغی کاٹنے اور بچوں کی حجامت جیسے گھٹیا کام ہنسی خوشی کر لیتے ہیں۔

اے کاش! ہمارے اختیار میں ہوتا اور ہم صاحب عالم کو چند مہینوں کے لیے ہی سہی، امریکہ میں لے آتے اور تماشائے اہل ستم دیکھ لیتے۔

دریا اور دریا دلی :

پوٹومیک دریا کے ساتھ ساتھ کا علاقہ بہت پر فضا ہے۔ خوب صورت کشادہ سڑکیں.... اور ان کے کنارے اُگے ہوئے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ـــــ رنگ برنگے پھولوں اور خود رو پودوں نے اس پوری وادی کو گھیر رکھا ہے۔ اس لیے جب برسات کے موتی برستے ہیں تو سبزے کا لباس نکھر کر اور سہانا ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں دیے سے روشن کر دیتا ہے۔

ہم علی الصبح چہل قدمی کے عادی نہیں ہیں۔

مگر چونکہ یہ امریکہ میں ہمارا باقاعدہ دوسرا دن تھا، اس لیے اپنے میزبانوں پر رُعب ڈالنا بھی مقصود تھا۔ صبح اُٹھتے ہی ہم نے گھر کا دروازہ کھولا اور باہر سڑک پر نکل گئے۔ سورج ابھی نکلا نہ تھا، صبح بڑی حسین تھی۔ بچے سکول جانے کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے۔ دفتری لوگوں کو دفتر جانے کی جلدی تھی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کسی چوراہے پر کوئی سنتری نہ کھڑا تھا مگر اس کے باوجود ٹریفک کا نظام بڑا منظم تھا۔ موٹریں گو تیز رفتار تھیں مگر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ایک دوسرے کو پچھاڑ نہ رہی تھیں۔ سامنے ایک چوراہے پر STOP لکھا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا یہ اشارۂ خصوصی غالباً ہمارے لیے ہے۔ اتنے میں کیا دیکھا۔ ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ آئی۔ چوراہے پر چند سیکنڈ رکی اور پھر روانہ ہوگئی۔

عقل کا اندھا تھا موٹر والا بھی ——— اگر رکے بغیر نکل جاتا تو بخدا ہم اس کی شکایت بالکل نہ کرتے۔ ہمارے ہاں شکایت ان کی درج کرائی جاتی ہے جن سے کوئی بدلہ لینا ہو۔

اب ہم آداب سڑگشت سے تو واقف نہ تھے۔ جدھر منہ آتا ادھر ہی چل دیتے۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی کہ اگر ہم غلط جگہ سے سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے تو موٹر والا رک کے ہمیں سڑک پار کرنے کا حق دیتا۔

تب ہمیں پتہ چلا کہ یہاں پیدل چلنے والوں کے حقوق زیادہ ہیں، اس لیئے یہاں کے شہری ٹریفک کے اصولوں کی پابندی ہی نہیں، احترام بھی کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے حقوق و فرائض سے باخبر رہتے ہیں۔ ان کو زندگی نے یہی سکھایا ہے کہ ایک دوسرے کی باری کا خود خیال کریں۔ جو پہلے آکر رُکتا ہے۔ وہ پہلے سڑک کو پار کرتا ہے اگر عورت یا بچے چالو سڑک کو پار کرنا چاہیں تو موٹریں ایک دم رُک جاتی ہیں۔

پیدل چلنے والوں کے حقوق کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی راہ گیر کو کسی کمین کا کتا کاٹ لے تو وہ ہرجانے کا دعویٰ کر دیتا ہے.... ایک بات کی ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ جب ان کو معلوم ہے کہ کتا کبھی نہ کبھی ضرور کاٹ لیتا ہے تو یہ لوگ

کتوں سے اتنی محبت کیوں فرماتے ہیں؟ خیر کوئی معقول گورا ملا تو اس سے ضرور پوچھیں گے۔

اگر کسی کمین نے اپنے گھر کے باہر جمی ہوئی برف صاف نہ کی ہو اور اس سے کسی مسافر کو نقصان پہنچا ہو تو وہ بھی مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ بھئی یہ تو دعوؤں کا ملک ہے۔ بات بات میں، اور لات لات میں دعوے ہوتے ہیں۔ شوہر کو ایک دفا لتو چھینکیں آجائیں.... بیوی کا کتا آکے بستر میں گھس جائے یا ہمسائے کی بلی میں آؤں.... میں آؤں کہے۔

چہل قدمی کر کے گھر لوٹے تو میزبان پریشان ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جو نور کے تڑکے منہ اُٹھا کے ہوا خوری کے لیے نکل گئے ہیں تو کہیں راستہ بھول کر "خوار" نہ ہو رہے ہوں۔

ہمیں ہشاش بشاش لوٹتے دیکھا تو کھل اُٹھیں۔ بولیں۔

"کہاں گئی تھیں؟"

"جوگنگ کے لیے...." JOGGING

دراصل یہ لفظ کل امریکہ آتے ہی ہم نے سُنا تھا۔ سڑکوں پر کئی لوگ نیکر اور بنیان پہنے والہانہ انداز میں دوڑ رہے تھے۔ پہلے ہم نے سمجھا کوئی ان کے کپڑے اتار کر بھاگ گیا ہے، اس لیے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ استفسار کرنے پر پتہ چلا کہ یہ جاگرز ہیں۔ دوڑ دوڑ کر ورزش کرتے ہیں۔ ان کی بے وقوفی پر رونا آیا۔ ان کے ملک میں کاریں اتنی سستی ہیں۔ یہ تو پوری زندگی موٹریں بیٹھ کر گزار سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں جس نے پہلی پشت میں موٹر خریدی ہو، وہ غسل خانے میں بھی موٹر ہی میں بیٹھ کر جانا چاہتا ہے۔

"اچھا اچھا...." وہ خوش ہو کر بولیں۔ "آپ کو امریکیوں کی طرح جوگنگ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کی عادت ہے۔"

ہم نے کہا " ویسے تو ہمیں علی الصبح "جگالی" کی عادت ہے۔

تب انھوں نے گرم گرم چائے کا پیالہ ہماری طرف بڑھایا.... ہم نے سوچا امریکہ میں بیٹھے ہیں۔ اگر صبح کی چائے کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے اخبار نہ پکڑا تو لوگ ہمیں جاہل سمجھیں گے۔ اس لیے اٹھ کر سامنے پڑا ہوا اخبار اُٹھا لیا۔ اخبار کیا پکڑا۔ نازک کلائی میں موچ آگئی۔ ہم نے اخبار میز پر رکھ کے اپنی میزبان سے پوچھا ـــــ " یہ تھان ہے یا اخبار ـــــ ؟"

وہ بولیں " یہ یہاں کا سنڈے ایڈیشن ہے۔ آپ آج کا تازہ پرچہ لے لیں۔" ہم نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور سنڈے ایڈیشن کی ورق گردانی کرنے لگے.... انگریزی زبان اور انگریزی اخبار سے ہمیں کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ گھر میں بھی ہم انگریزی اخبار صرف فلمی اشتہاروں کے لیے دیکھتے ہیں.... جتنی چٹپٹی خبریں اردو کے اخبار میں ہوتی ہیں، اس کا تو جواب نہیں.... یہاں انگریزی اخبار کا ورق ورق دیکھنا.... وہی رعب ڈالنے والی مجبوری تھی....

سنڈے ایڈیشن ایک قسم کا " خصوصی اشتہار نمبر" ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے اشتہار ـــــ فریب کن اشتہار ـــــ گمراہ کُن اشتہار ـــــ اصراف کے اشتہار ـــــ اور دل کو لے ڈوبنے والے اشتہار ـــــ

ہماری متلاشی نظروں کو ایک خبر نے پکڑ لیا۔

ممتا اور فائر بریگیڈ :

فائر بریگیڈ سٹیشن پر ملازم ایک خاتون کے مقدمے کی تفصیل درج تھی۔

عام طور پر آگ لگانا عورت کا کام ہے مگر امریکیوں نے عقل مندی کی کہ ایک خاتون کو آگ بجھانے پر مامور کر دیا۔ تجربہ ہی سہی.... کیونکہ اس ملک کو تجربے کرنے کی بیماری ہے۔ یہ بچگلی خاتون اپنے شیر خوار کو سٹیشن پر بلوا کر اسے دودھ پلایا کرتی تھی۔ خوش ذوق مردوں کو یہ منظر نہیں بھایا۔ انھوں نے خاتون کو چھٹی کرنے کے لیے کہا۔ وہ نہ مانی تو اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔

سٹیشن والوں کا موقف تھا :

" یہ فائر بریگیڈ سٹیشن ہے۔ یہاں کسی وقت بھی خطرے کے الارم بجنے لگتے ہیں اور اُٹھ کر دوڑنا پڑتا ہے۔ ایسے میں بچے کو دودھ پلانا چہ معنی دارد...؟"

سو سٹیشن والے مقدمہ جیت گئے اور خاتون کو برطرف کر دیا

خاتون نچلی بیٹھنے والی کہاں تھی۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا.... شہریوں کے پندار کو جگایا اور بولی ـــــ " نوکری کرنا میرے پیٹ کی مجبوری ہے اور ماں کا دودھ پینا بچے کا پیدائشی حق ہے۔ میں ڈیوٹی کے اوقات میں باقاعدہ اسٹیشن پر حاضر رہتی ہوں.... ہر کام مستعدی سے کرتی ہوں۔ جب بچے کے دودھ کا وقت ہوتا ہے تو اس کی نانی اٹھا کر لے آتی ہے۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کے اپنے بچے کو دُودھ پلا دیتی ہوں۔ ان کے رزق پہ لات تو نہیں مارتی.... کیا ان کے بچے نہیں ہیں۔ وہ بھی تو کسی کی اولاد ہیں۔

" دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے"

اس پر شہر میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ساری ماؤں کی ہمدردیاں خاتون کے ساتھ.... سارے مردوں کے دلاسے خاتون کے ساتھ.... قانون تھرتھرایا اور فیصلہ خاتون کے حق میں دے دیا۔ اس کی نوکری بحال ہوگئی۔ نہ صرف یہ کہ ڈیوٹی کے اوقات میں بچے کو دُودھ پلانے کی اجازت مل گئی۔ اسٹیشن والوں کو اس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سردردی کا ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑا ——— دل چاہا یہ پوری کی پوری تفصیل کاٹ کے وطنِ عزیز لے جائیں اور ان فیشن ایبل خواتین کو دکھائیں جو بچے کی پیدائش کے فوراً بعد انجیکشن لگوا کے دودھ کی نہریں خشک کر دیتی ہیں تاکہ ان کی قیمتی قمیضیں اور قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔ اور پھر فخریہ محفلوں میں بتاتی ہیں کہ ہم تو بچے کو فلاں ڈبّے کا دودھ پلاتی ہیں۔

نفس کی مہار :

ایک دن فخر بھابھی نے کہا "چلیے آپ کو یہاں کے بڑے سٹورز دکھاتے ہیں۔"

"دکھانے سے آپ کا کیا مطلب ہے ——— ؟" ہم نے چہک کر کہا۔

وہ بولیں "فی الحال آپ صرف دیکھیں۔ خرید و فروخت بعد میں کریں.... یہاں ہر ہفتے ہر سٹور پر سیل لگتی ہے۔ آپ جیسے جلد باز ٹورسٹ آتے ہی شاپنگ کو چل دیتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔"

ہاں یہاں سارا سال سیلوں کے ہفتے آتے رہتے ہیں۔ گرمیوں کے شروع میں سرد کپڑوں کو سیل میں رکھ کے نکال دیتے ہیں اور سردیوں کے شروع میں موسم گرما کے ملبوسات اونے پونے نکال دیتے ہیں۔ یہاں سیل کا مطلب سیل ہی ہوتا ہے، ہمارے ہاں سیل کا مطلب مداری کا پرانا کرتب ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو اپنا لہو جلا کر ڈالر کماتے ہیں۔ دو چار سینٹ بچا کر بھی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ سبزی گوشت، کوکا کولا، پیپسی کولا اور دیگر اشیائے خوردنی کی بھی سیل لگتی ہے۔ ہفتہ وار سیلوں کے اشتہار پہلے سے اخباروں میں آنے لگتے ہیں۔ اگر گروسری سٹور میں کھانے کی چیزوں یا گوشت کی افراط ہو جائے تو قیمت کم کر کے

نکال دیتے ہیں۔ ایسے میں سگھڑ خواتین ضرورت سے زیادہ گوشت لا کر ڈیپ فریزر میں رکھ دیتی ہیں۔

سیل کے انتظار میں کچھ فائدہ تو ہوتا ہے مگر صبر و تحمل کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جبکہ ہم چند دنوں کے لیے آئے تھے۔ ہمیں اپنی میزبان کا یہ مشورہ یوں لگا، جیسے انھوں نے ہمیں ہماری "حیثیت" کا احساس دلایا ہو۔ اگر دنیا سے "سیاح" اور "شیخ" اٹھ جائیں تو دنیا کی ساری انڈسٹری منہ کے بل گر جاتے۔ ہم اس وقت سیاح تھے اور سیاح اپنی موم بتی کو دونوں سروں سے پھونکتا ہے۔ لیکن ہاں! ہم نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا نا؟ کہ ایسے میں ہم اپنے نفس کو بے مہار نہیں ہونے دیتے....

سب سے پہلے وہ ہمیں ایک بڑے سے گروسری سٹور میں لے گئیں۔ مقصد ہمیں حیران کرنا تھا۔ اور ہم کنگ سائز کریلے اور بینگن دیکھ کر ہی چاروں شانے چت ہو گئے تھے۔ وہاں پر ہر وہ سبزی تھی جو ہمارے ملک میں ہوتی ہے.... اور دنیا بھر کے پھل.... آڑو ایسے جیسے سرحد کا پٹھان ——— خوبانی بلوچستان کی حسینہ کی طرح دلفریب ——— آلو بخارا سندھ کے جاٹ کی طرح تکڑا اور لہو سے بھرا بھرا ——— اور آم..... آم دیکھ کے ہم چلّائے کہ یہ ضرور پاکستان سے آیا ہوگا مگر جلد ہی ہماری غلط فہمی دور ہو گئی.... اب انھوں نے آم بھی اگا لیا ہے.... ہم نے بڑی دیر سے مسز "مارکھنی" کو کچوکا نہیں لگایا تھا۔ اس لیے سب سبزیاں اور پھل دیکھ کر ان سے کہا:

"اتنا بڑا ہے امریکہ۔ دنیا بھر کے پھل اور سبزیاں یہاں اُگتے ہیں... آخر امرود کیوں نہیں ہیں یہاں"

وہ مسکرائیں اور بولیں "ہم لوگ تجربہ کر رہے ہیں۔ ایک نہ ایک دن

امرود اُگا کر رہیں گے۔"

ہماری نظر گوشت والے حصّے پر پڑ گئی۔ مختلف خانوں میں بکری، گائے، مرغی اور مچھلی کا گوشت رکھا تھا اور ہاں ایک خانے میں سرخ سرخ اور سفید جیسے گجریلے میں کھویا ——— وہ سؤر کا گوشت تھا۔ ہم لاحول پڑھ کر پیچھے ہوئے تو ہمارا ہاتھ ایک بٹن سے چھو گیا۔ اسی وقت ایک تن و توش والا گورا شیشے کی دیوار کی دوسری طرف نمودار ہوا اور منہ باہر نکال کر بولا:

"کیا حکم ہے میرے آقا..؟"

ہم نے سمجھا امریکہ میں ابھی تک الہ دین کے جن ہیں۔ ہم ابھی کوئی دِل لُبھانے والی فرمائش کرنے لگے تھے کہ ایک خاتون نے بڑھ کر گائے کا دایاں پہلو اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے خودکار مشین سے پسلی پسلی الگ کر دی۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ حضرت قصابوں کے معزز قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہم نے کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر غور کیا۔ بڑے بے وقوف لوگ ہیں۔ باقاعدہ لائن بنا کے بل ادا کرتے ہیں۔ یہاں ایک قباحت ہے۔ مطلوبہ اشیا جلد مل جاتی ہیں مگر بل کی ادائیگی میں خاصی دیر ہو جاتی ہے۔ حالانکہ سب کام کمپیوٹر کے ذریعے ہوتا ہے۔ سودا اِدھر سے اُدھر بھیجنے کے لیے خودکار مشینیں نصب ہیں۔ عام طور پر دکانوں کے اندر ملازمین آٹھ گھنٹے کھڑے ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر کام کرنا ممنوع ہے۔ نہ تو کوئی کُولھے پر ہاتھ رکھ کے سٹول پر بیٹھا نظر آتا ہے، نہ کوئی کرسی پر نیم دراز ہو کر سودا بیچتا ہے ———

ہاں بل کی ادائیگی کا دستور ہمارے ملک میں قابلِ رشک ہے۔ دس بیس گاہکوں کے مجمع میں سے مُنہ باہر نکال کر پیسے دو اور چل دو..... یہ

آسانیاں امریکہ میں کہاں ——— ؟

مسلسل آٹھ گھنٹے کھڑے رہتے ہیں، پھر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں اور تھکاوٹ کی وجہ سے کوئی کرختگی ان کے چہروں پر نہیں ابھرتی۔ چہروں پر خوش خلقی کا غازہ سجائے رکھتے ہیں۔ پلیز پلیز کہتے کہتے زبان سُوکھتی ہے اور تھینک یو' سوری کہنے کا رواج عام ہے۔ سچی بات ہے ہمارے ہاں تو پلیز اور تھینک یو جیسے الفاظ صرف نوجوان لڑکیوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں کمپیوٹر کے آگے ایک پچاس سالہ خاتون کھڑی تھی۔ چاق چوبند تھی۔ چُست کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرہ میک اپ سے مزیّن تھا۔ آواز میں کرارہ پن تھا۔ بس دانت مصنوعی تھے۔ دانت تو یہاں کھانے اور دکھانے کے دونوں نقلی ہوتے ہیں.... اتنی تیزی سے اس کے ہاتھ کمپیوٹر پر چل رہے تھے کہ ہمیں اس کے بڑھاپے پر رشک آنے لگا۔

امریکن سیلز گرل کا رویہ یورپین سیلز گرل سے بہتر ہوتا ہے۔ خصوصاً جرمنی اور فرانس کی پریاں خاصی تنک مزاج ہوتی ہیں۔ چہروں پر صاف لکھا ہوتا ہے "ہم آپ کے غلام نہیں"۔ مگر امریکی لڑکیاں خوش مزاج' سادہ اور مخلص ہوتی ہیں۔ رویّے میں حلیمی ہوتی ہے۔ لباس کے معاملے میں امریکی عورت بہت بے پرواہ ہے۔ جس طرح گھر میں بیٹھی ہو' اسی طرح اُٹھ کے بازار میں چل دیتی ہے۔ وہی کھدر کی پیوند لگی جینز اور پاؤں میں ہوائی چپل.... یا پھر دھجیوں کی شکل میں تن پر لٹکتا ہوا نیم عریاں فراک اور ننگے پاؤں.... امریکن عورتوں کے مقابلے میں یورپین عورت زیادہ خوش لباس ہوتی ہے۔ خصوصاً جرمنی کی عورتیں بڑے اہتمام سے تیار ہو کر نکلتی ہیں۔ خواہ سبزی اور گوشت خریدنے جا رہی ہوں۔ البتہ ایک بات مشترک دیکھی۔ ان عورتوں میں کہ یورپین عورتوں کی طرح امریکی عورتیں بھی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

زیرجاموں سے الرجک نظر آتی ہیں۔ خصوصاً ٹین ایجرز ——— ہم اتنے بڑے سٹور کی صحت افزا فضا میں اتنی دیر صبر و تحمل سے نہیں رہ سکتے ——— اس لیے مسز "مارکہنی" کو سوالات سے داغنا شروع کیا :

"آخر آپ لوگ ہر چیز میں ملاوٹ کیوں نہیں کرتے ——— ؟"

"ملاوٹ ——— ؟ انھوں نے حیرت سے آنکھیں گھمائیں۔

"ہاں ہاں" ہم نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "آپ کی تو نسلوں کی نسلوں میں ملاوٹ ہے۔ پوری تاریخ میں ملاوٹ ہے۔ پھر اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کیوں نہیں کرتے۔"

"اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کیسے کی جاتی ہے ——— ؟"

"واہ واہ آپ لوگ بڑے سیانے بنتے ہیں اور ساری دنیا کے نانے بنتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں معلوم کہ ملاوٹ ایک بزنس سیکریٹ ہے۔ مثلاً آٹے میں لکڑی کا برادہ ملادیں، چینی میں سوجی یا ریت ملادیں، سیاہ زیرے میں سونف کے چھلکے ملادیں، سُرخ مرچوں میں جو مرضی پیس کر ملادیں، صرف لال رنگ کر دیں، نمک میں میدہ ملادیں، چائے کی پتی میں کالے چنے کے چھلکے ملادیں، گھی میں گریس یا موبل آئیل ملادیں، دالوں میں سیروں کے حساب سے کنکر ملادیں، دُودھ میں پانی یا ڈبے کا دودھ حل کر کے ملادیں، بچوں کی ٹافیوں میں کوئلہ پیس کر ملادیں، سبز الائچی کا عرق نکال کے اس پر سبز رنگ چڑھادیں ——— آخر آپ محنت سے کیوں جان چراتے ہیں۔ یہ سب منافع خوری کی آسان ترکیبیں ہیں۔"...

"توبہ توبہ۔ اُف توبہ توبہ ..." مسز "مارکہنی" اپنے کلّے پیٹنے لگیں۔ "آپ کو معلوم ہے یہ کتنا بڑا جُرم ہے انسانی زندگیوں سے کھیلنا گناہِ عظیم ہے۔"

ہم نے ہنس کر کہا "جس طرح جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا

ہے، اسی طرح کاروبار میں بھی گناہ اور ثواب کا خیال نہیں آنا چاہیے۔

یہی دیکھیں نا ہمارے ہاں شراب پر بندش ہے مگر چھپ چھپ کر جو دیسی شراب کشید کی جاتی ہے، اس میں ایسے اجزائے ترکیبی شامل کر دیے جاتے ہیں کہ پینے والے ایک بار جُھوم کر ہمیشہ کے لیے سو جاتے ہیں"

"اچھا" مسز "مارکہنی" کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"مگر آپ اتنا تو دیکھیں، اس طرح وہ قانون کی سزا سے صاف بچ جاتے ہیں"

شاہین بچے :

خصوصاً نئی نسل مختصر سے مختصر لباس میں نظر آنا پسند کرتی ہے۔ ننھے مُنّے جانگیے اور چھوٹی چھوٹی چولیاں، وہ بھی اتنے باریک کپڑے کی کہ نگاہ کو آر پار جانے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا بس چلے تو کبھی لباس تبدیل نہ کریں۔ ایک بار جسم پر چڑھا لیں تو پھر پھٹتے دم تک اتارنا پسند نہ کریں۔ ان کی پیوند لگی خستہ اور غلیظ جینز دیکھ کر تو یہی اِحساس ہوتا ہے خصوصاً یونیورسٹیوں میں تو یہ مقولہ عام ہے کہ "خوش لباسی وجہِ شرمندگی ہے۔"

نئی نسل نے خوش حالی میں آنکھ کھولی ہے اس لیے فیشن کے طور پر بھوکے ننگوں والا حُلیہ بنا کر ٹوٹی پھوٹی موٹر میں گھومنا پسند کرتے ہیں۔

طلبا اور طالبات گھر بیٹھ کر چھٹیوں کو ضائع نہیں کرتے۔ اس لیے گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر تفریحی مقامات پر، ریستورانوں میں، ریلوے سٹیشنوں میں اور کئی پرائیویٹ اداروں میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اوقات پرائمری سکولوں کے بچوں کو ہفتہ وار ڈالر کمانے کی ٹریننگ دینے کیلئے سکولوں کے اندر اس نوعیت کے کام شروع کیے جاتے ہیں۔ اور ننھے بچوں کو گھروں سے بلا کر کام کروایا جاتا ہے۔ گویا پیسہ کمانے کے جراثیم وہ ان کے اندر انڈیل دیتے ہیں۔

بے راہ روی کے رجحانات زیادہ تر ٹین ایجرز میں پائے جاتے ہیں۔ تیرہ سال تک لڑکی کنواری رہے تو اسے ذہنی مریضہ کہا جاتا ہے۔ ہر سال کی طرح جب سکولوں اور کالجوں پر چھاپے مارے گئے تو خاندانی منصوبہ بندی اور منشیات کی تمام اقسام ٹین ایجر لڑکوں اور لڑکیوں سے دستیاب ہوئیں۔

نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سکولوں کے باہر بیٹھ کر مزے سے چرس والے سگریٹ پیتے ہیں۔

"اتنی پابندیوں کے باوجود ایسے ملک میں چرس کیسے سمگل ہو جاتی ہے؟" ہم نے مسز "مارکہنی" سے پوچھ ہی لیا۔

وہ بولیں "اگر میں آپ کو طریقہ بتا دوں تو آپ سمگلنگ تو نہ شروع کر دیں گی؟"

ہم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ناک کو رگڑا۔۔۔۔ اور انھیں یقین دلایا کہ اگر ہمیں کبھی کچھ سمگل کرنے کا خیال آیا تو وہ اللہ کا خوف ہوگا۔ جو یہاں بالکل نہیں ہے۔"

پھر ہم نے پینترا بدل کے وار کیا:

"شرم کریں آپ کے بچے اتنے بے راہ رو ہیں۔ آپ اپنے بچوں کو سکولوں میں یہی کچھ سکھاتے ہیں ——— ؟"

وہ بولیں۔

"یہ بھی تو دیکھیں ہمارے سکولوں میں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں سکولوں میں "دھونس" مفت دی جاتی ہے۔"

وہ بولیں۔

"ہمارے ہاں تعلیم کے دوران بچوں کے ذہنی رجحانات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے اور اس سے والدین کو مطلع کیا جاتا ہے۔"

ہم نے کہا۔

"ہمارے ہاں بچوں کے والدین کے سیاسی رجحانات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے اور بچوں کو گاہے گاہے اس سے مطلع کیا جاتا ہے بلکہ اگر ضرورت محسوس ہو تو بچوں سے جلوس نکلوا کے توڑ پھوڑ کروا کے ملکی نظام کو درہم برہم کیا جاتا ہے۔ نعرے لگوائے جاتے ہیں۔"

وہ بولیں۔

"ہمارے ہاں گرمی کی چھٹیوں میں سمر کورسز شروع کرنے کا رواج ہے ان کورسز کو پرکشش بنانے کے لیے بچوں کے والدین کو خطوط لکھ کر مشورے طلب کیے جاتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔

"ہمارے ہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں سمر ووکیشن کی فیس ایک ساتھ لی جاتی ہے اس سے خواہ غریب والدین کا ہارٹ فیل کیوں نہ ہو جائے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں بچوں کے نام کاٹ دیے جاتے ہیں اور والدین کو ہرگز چٹھیاں نہیں لکھی جاتیں۔"

انھوں نے کہا "ہمارے ہاں شہری بچوں کے سکولوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر کمیونٹی میں اپنی مدد آپ کے تحت سکول، کالج اور ہسپتال بناتے ہیں۔"

ہم نے کہا "ہم تو ہر کام کے لیے حکومت کے ہاتھ کو دیکھتے ہیں۔۔۔ ہمارے ہاں ٹرسٹ اور فلاحی ادارے انکم ٹیکس کو بچانے کے لیے بنائے جاتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہیں۔"

وہ بولیں۔" ہمیں اپنے بچوں سے عشق ہے۔ دیکھیے ہم نے ان کے لیے کتنے خوبصورت پارک اور تفریح گاہیں بنا رکھی ہیں۔"

ہم نے کہا۔" محبت ہمیں بھی اپنے بچوں سے ہے... مگر ہم تو راتوں رات بچوں کے پارکوں میں لگے ہوئے جھولے اور نلکے اتار کر لے جاتے ہیں۔"

انھوں نے کہا۔" بچہ قوم کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت قومی خزانے کی طرح کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں سکولوں میں بچوں کو ڈانٹنا پھٹکارنا خلافِ انسانیت سمجھا جاتا ہے۔"

ہم نے کہا۔" ہمارے ہاں تو ہر قسم کا غصہ بچوں پر نکالنے کا رواج ہے۔"

انھوں نے حیرت سے پوچھا" کس قسم کا غصہ ——— ؟"

ہم نے فخر سے کہا:

"اگر شوہر کو بیوی پر غصہ ہو تو وہ بچوں کو دھنک کے رکھ دیتا ہے... اگر بیوی شوہر کے رویے سے شاکی ہو تو بچوں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ استاد کو پرنسپل سے شکایتیں ہوں تو کلاس میں بچوں کو چھڑیاں مارنے لگتا ہے۔ پرنسپل کو حکومت کی پالیسی سے اختلاف ہو تو بچوں کی کھال ادھیڑنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کا مصرف بہت صحت منداور مثبت ہے۔"

"اچھا" ——— ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... آسمان کی طرف ٹھوٹھنی اُٹھا کر بولیں ؏

؏ یہ "پاگل" کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں[1]

[1] علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے :

ہم نے واشنگٹن ڈی۔ سی جانے کا پروگرام بنایا تو ہمیں بے شمار دوستوں کی لالہ زار ہدایات یاد آنے لگیں۔

"دیکھیے... جب کبھی آپ واشنگٹن جائیں تو چور اُچکّوں سے خبردار رہیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ادھر کا مال اُدھر کر دیتے ہیں۔"

"اوہ! واشنگٹن ڈی۔ سی کبھی تنہا نہ جائیں۔ ایک عورت کا وہاں تن تنہا جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

اس عمر میں جب ہمیں یوں خبردار کیا گیا تو جی باغ و بہار ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ یہاں ہمیں واقعی عورت سمجھا جا رہا ہے اور وہ بھی ایسی جس کا تنہا جانا خطرے سے خالی نہیں... دل چاہا یہیں ٹِک جائیں۔ وہاں تو چار بچوں کی ماں کوردّی کی ٹوکری سمجھ لیا جاتا ہے۔ اب اپنے "ہونے" کی تصدیق کرنے کے لیے واشنگٹن جانا بھی ضروری تھا اور جنم جنم کا خوف جو ہم پلّے سے باندھے پھرتے ہیں، اکیلے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے روکتا تھا۔ یہ مسئلہ فخر بھائی نے حل کر دیا۔ اور ہم سب قافلہ بنا کر نکل آئے۔ پوٹومیک دریا کے ساتھ ساتھ ایک سڑک واشنگٹن شہر کو جاتی ہے جسے ولیسٹ لیک کہتے ہیں۔ ہری بھری۔ خوش ادا ——— صاف ستھری ——— مسکراتی گنگناتی سڑک ہے... کنارے کنارے بنے ہوئے خوب صورت گھر دندے آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔

امریکہ میں ہر قسم کے مکان ہیں، امرا کے لیے، متوسط طبقے کے لیے، مزدور طبقے کے لیے ——— کارکنوں اور مزدوروں کی رہائش عام طور پر اپنے روایتی اپارٹمنٹس میں ہوتی ہے۔ متوسط طبقے کے گھروں کو یہاں ٹاؤن ہاؤسز TOWN HOUSES

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کہتے ہیں۔ ان گھروں کی قیمت تقریباً گیارہ لاکھ روپے ہے جو ایک عام شہری کی قوتِ خرید کے اندر اندر ہے۔ ان گھروں کی نشانی یہ ہے کہ قطار اندر قطار بنے ہوتے ہیں۔ گھر جڑواں ہوتے ہیں مگر چھتوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

البتہ امرا کے گھر کشادہ، پرفضا اور باغ باغیچے والے ہوتے ہیں.... یعنی آگے پیچھے لان، پھلوں کے درخت اور سبزیاں گھر کے اندر اگائی جاسکتی ہیں۔

جس طرح گاؤں میں مویشیوں کی بہتات ہوتی ہے، اسی طرح سڑکوں پر موٹروں کی بہتات ہوتی ہے۔ ٹریفک اچانک رک جائے تو مویشی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ ویسے پٹرول کے مہنگا ہو جانے کی وجہ سے یہاں بھی چھوٹی موٹروں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ بلکہ اکثر کفایت شعار لوگ موٹر خاص خاص موقعوں پر برتتے ہیں۔ دفتر کے لیے بس اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے سائیکل استعمال کرتے ہیں.... ابھی ہم چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی موٹروں کی دلکش قطاروں پر سوجان سے فدا ہونے کا سوچ رہے تھے کہ ایک دھماکہ ہوا.... پتہ چلا کہ کسی مہربان نے اپنی موٹر ہماری موٹر سے ٹکرا دی ہے۔ ہمارے میزبان نہ بوکھلائے نہ آپے سے باہر ہوئے ——— بس سٹیرنگ تھامے یوں بیٹھے رہے جیسے وقت کی لگام تھام رکھی ہو.... اسی وقت ایک چپٹی ناک والا زرد رو آدمی ہماری موٹر کو ٹٹول ٹٹول کر، دبا دبا کر یوں دیکھنے لگا جیسے ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے۔ جب آگے پیچھے سے اچھی طرح معائنہ کر چکا تو پھر سائل کی صورت میں گڑگڑاتا ہوا کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا اور ہاتھ باندھ کر بولا:

"جناب! آج میرا انڈی کیٹر خراب ہے۔ بارش کی وجہ سے میں ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا اور آپ کی موٹر کو ٹکر مار دی۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں... میں نے آپ کی موٹر کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے... اسے خراش تک نہیں آئی۔

آپ بھی اُٹھ کر اپنی تسلی کر لیں.... اور مجھے جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تو یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا...."

واہ وا۔ سُبحان اللہ! کیا اللہ کا نیک بندہ ہے.... ابھی ہم اس کی شان میں قصیدہ گوئی شروع کرنے والے تھے کہ فخر بھابھی نے بتایا "یہاں لوگ قانونی کارروائیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر یہ ٹکر مار کر بھاگ جاتا تو تلخ نتائج اسے بھگتنا پڑتے۔ لوگوں کے دلوں میں قانون کا ڈر اور احترام ہے۔ پولیس تک معاملہ نہیں لے جانا چاہتے، اسی لیے اقبالِ جرم کر کے معافی مانگ لیتے ہیں۔ اگر موٹر کو نقصان پہنچتا تو بھی یہ فوراً ہرجانہ ادا کر دیتا۔"

اور عین اسی وقت ہمیں مال روڈ پر پیش آنے والا واقعہ یاد آگیا۔ ایک روز صُبح ہم اپنے بچوں کے ساتھ موٹر میں بیٹھے بہت محتاط انداز سے چلے جا رہے تھے۔ کہ خوش فکروں سے لدی ہوئی ایک موٹر عجلت سے آگے بڑھی ——— اس کوشش میں وہ ہماری موٹر سے ٹکرا گئی ——— ہماری موٹر کی پشت کی بتیاں ٹوٹ گئیں ... ڈینٹ پڑ گئے۔ ہم تو حسبِ معمول اس جارحانہ اقدام پر صبر ہی کر لیتے وہ تو خدا بھلا کرے سنتری بہادر کا ——— انہوں نے وسلوں کی دُھونی رمادی پھر بالآخر موٹر والے کو جا لیا۔ پہلے تو زبانی اس کی تواضع کی۔ بعد ازاں باقاعدہ چالان کا پرچہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا ——— اب وہ شاطر اچھی طرح اندازہ کر چکا تھا۔ زخمی موٹر میں ایک ماں بچوں کو لئے بیٹھی ہے۔ اس لئے سیدھا ہماری طرف آیا۔ یتیم سی شکل بنا کے، مسکینوں والے انداز میں ہاتھ جوڑ دیئے.... اور گلوگیر آواز میں بولا۔

"بیگم صاحبہ! میں بڑی عجلت میں کچہری جا رہا تھا۔ ساڑھے نو بجے میری پیشی ہے۔ یہ میرے گواہ ہیں۔ اگر آج وقت پر نہ پہنچا تو مقدمہ ہار جاؤں گا میرا لاکھوں

کا نقصان ہوگا۔ میں مرجاؤں گا۔ بس آپ۔ آج مجھ پر اتنا رحم کریں۔ کہ چالان کی پرچی واپس کرادیں۔ اور آپ سنتری سے کہہ دیں۔ ہمارا آپس میں سمجھوتہ ہوگیا ہے وہ مجھے جانے دے۔ اور میں اللہ اور رسول کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ شام کو آپ کے درِ دولت پر حاضر ہوکر سارا ہرجانہ ادا کردوں گا۔ یا آپ کی موٹر کی مرمت کرادونگا"

ہم سوچنے لگے تو وہ پھر گڑگڑایا ——

میری بات کا یقین کریں بیگم صاحبہ! میں نے اللہ اور رسُول کی قسمیں کھائی ہیں۔ آپ کے ننھے منے بچے ہیں۔ ان کے صدقے میں ——

بس۔۔۔۔ اتنے میں ہی ہم آبدیدہ ہوچکے تھے۔ ہمیں اس کی خاندانی نجابت پر یقین آگیا تھا۔ اور ہمیں یہ وہم بھی ہونے لگا تھا۔ کہ اب وہ بڑھ کے ہمارے قدم چھُولے گا۔ اور عاجزی کا یہ انداز ہمیں ہمیشہ مجروح کرکے رکھ دیتا ہے"

"ہم نے کہا اچھا بھائی۔۔۔۔ تمہیں مُعاف کیا۔ ہمارا پتہ اور فون نمبر لکھ لو۔ اس نے فوراً لکھ لیا۔ ہم نے سنتری بہادر کو بُلا کے مُعاملہ رفع دفع کردیا۔ جاتے جاتے اس مردِ شریف نے کورنش بجالا کر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور کھڑکی کے قریب آکر بولا۔

"شام کو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوجاؤں گا۔ اللہ آپ کو جزا دے ——"

اور یہ سوچ کر کہ ہم عفو و درگزر کرسکتے ہیں۔ شام تک اپنی اس خوبی کے نشہ میں اینٹھتے رہے۔ مگر وہ نجیب الطرفین مرد آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔۔۔۔

ادیبوں کی بے ادب بستی :

یہاں ایک جارج ٹاؤن ہے جس کی ایم سٹریٹ پر واشنگٹن کے تمام شاعر ادیب اور صحافی رہتے ہیں۔ فن سے ہمارا کوئی ناطہ ہو نہ ہو ہم اپنے آپ کو ان کی برادری میں سے ضرور سمجھتے ہیں۔ اس وقت ہمیں جارج ٹاؤن کے شاعروں اور

ادیبوں پر بڑا ترس آیا۔ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے کوچے سے ایک شہرۂ آفاق ہستی گزری چلی جارہی ہے۔۔۔۔ ورنہ ننھی ننھی جھنڈیاں پکڑ کر روشوں پر تو ضرور نکل آتے۔ ہم نے ان کی "کور ذوقی" پر کُڑھنا مناسب نہ جانا۔ جلدی سے مسز مارکہنی سے پوچھا :

"یہ سارے ادیب، شاعر اور صحافی ایک بستی میں کیسے رہتے ہیں؟"

انھوں نے کہا :

"جیسے سارے انسان رہتے ہیں۔"

ہم نے کہا :

"ہم انسانوں کی نہیں، شاعروں اور ادیبوں کی بات کررہے ہیں۔ اس خاک کی تھوڑی سی چٹکی ہمیں بھی لاکردیں تاکہ یہاں سے جاکے اپنے دیس کے شاعروں اور ادیبوں کو چٹائیں۔ وہ ایک محلّے میں نہیں تو ایک شہر میں ہی ایک دوسرے کا وجُود برداشت کرلیں۔"

وہ سٹپٹا کر بولیں :

"ادیب، شاعر، صحافی تو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے علمبردار ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ایک آئیڈیل معاشرہ پیش کرتے ہیں اور ان کا ہر پیغام محبت کا پیغام ہوتا ہے"

ہم نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرا سوال دے مارا۔

"آپ کے ہاں اس بات پر جھگڑا نہیں ہوتا کہ کون بڑا شاعر ہے اور کون بڑا ادیب ہے؟"

بولیں :

"یہ تو وقت اور قارئین ثابت کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پڑھا جانے والا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ادیب بڑا ادیب کہلاتا ہے اور پھر ایک عصر کے شاعر اور ادیب تو تقریباً ایک ہی صف میں شمار ہوتے ہیں۔"

ہم نے کہا:

"ہمارے ہاں صرف محمود اور ایاز ہی ایک صف میں شمار ہوتے ہیں باقی ہر شاعر اور ادیب کی صف الگ ہوتی ہے۔ ہاں ایک اور صف بھی ہے جس میں شاعر و ادیب بلا تخصیص و تفریق کھڑے ہو جاتے ہیں ——— بلکہ جتنی جلدی کوئی شاعر یا ادیب منظر سے ہٹ جاتا ہے، اتنی جلدی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔"

"کیا آپ ادیبوں اور شاعروں کو ان کی زندگی میں تسلیم نہیں کرتے۔" انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ان کی زندگی میں تو ہم صرف تسلیم بجا لاتے ہیں۔"

نشانیاں آنجہانیاں :

جب کبھی آپ واشنگٹن ڈی۔سی جائیں گے، لوگ آپ سے ضرور پوچھیں گے آپ نے لنکن میموریل دیکھا ——— واشنگٹن مانومنٹ دیکھا ——— جیفرسن میموریل دیکھا ——— لوگ بھی کتنے ستم ظریف ہیں۔ زندوں کی دُنیا میں ہزارہا واشنگٹن، لنکن اور جیفرسن مارے مارے پھر رہے ہیں... کسی کو ان کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے... مگر ذرا ان یادگاروں پر جا کر دیکھیے، خلقت ہی خلقت نظر آتی ہے۔ ہمیں مرحومین کی جگمگ کرتی یادگاریں دیکھنے کا اتنا شوق تو نہیں ہے مگر اس خیال سے یہ جگہیں دیکھنے پر آمادہ ہو گئے کہ اس مرحلے سے

ایک بار ہی گزر جائیں تاکہ بار بار کی جواب دہی سے بچ جائیں۔

واشنگٹن مانومنٹ ایک سو باون کلومیٹر اونچا چوکور سا مینار ہے۔ اوپر سے تھوڑا سا میزائل نما ہو گیا ہے۔ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک سیاحوں اور اژدہوں کا ہجوم رہتا ہے یہاں ——— سُنا ہے بہار کے موسم میں تو رات بارہ بجے تک کھُلا رہتا ہے۔ اوپر جانے کے لیے وہی لفٹ سسٹم جس میں بیک وقت سینکڑوں لوگ سما جاتے ہیں۔ اس لفٹ میں ایک لقا کبوتری بھی تھی۔ لفٹ کے ساتھ ہی اس کی زبان چالو ہو گئی۔ چند سیکنڈوں میں اس نے مینار کی کہانی سُنا ڈالی... سمجھ میں نہیں آیا کہ لفٹ پہلے رُکی یا اس کی زبان...

یہ مینار بھی دنیا کے عام میناروں جیسا ہی ہے البتہ اس کی پہلی منزل پر بڑی بڑی شیشے کی چھ کھڑکیاں ہیں۔ دراصل یہی کھڑکیاں واشنگٹن نما ہیں۔ سارا واشنگٹن ان میں سے نظر آتا ہے۔ مشہور عمارات و جگہوں کی تفصیل ہر کھڑکی پر درج ہے اس سے اوپر ایک اور کڑی منزل ہے جہاں لفٹ صرف دو افراد کو ہی لے کر جا سکتی ہے۔ ہم ایک غذا رسیدہ بزرگ خاتون کے ساتھ نتھی ہو گئے۔ اوپر جا کر پتہ چلا واقعی یہ جگہ صرف عاشق و معشوق کے دیکھنے کی ہے۔ ایک ہی کھڑکی اور اس میں بھی شیشہ ندارد ——— اوپر دیکھیں تو آسمان لپک کر پکڑ لے... نیچے دیکھیں تو زمین قدموں سے نکل جائے۔ ہمیں تو بہت زور کا چکر آیا.... اس چکر میں ہم نے صاف دیکھ لیا کہ ایک بچ بٹناں دی جوڑی دنیا و مافیہا سے بے خبر اس بے شیشہ کھڑکی میں آویزاں تھی۔

جیفرسن میموریل گنبد گوں ایک چاندنی جیسی سفید سفید عمارت ہے۔ جس کے عین وسط میں امریکہ کے آنجہانی صدر جیفرسن کا چھ میٹر کا مجسمہ نصب ہے۔ ہمیں بڑے آدمیوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کا بہت شوق ہے۔ ہم

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

فوٹو گرافر کو اشارہ کر کے اس مجسمے کے پہلو میں یوں جا کھڑے ہوئے جیسے ہاتھی کے قدموں میں چڑیا بیٹھ جاتی ہے۔ ایک ہم ہی نہیں تھے وہاں شوق کے گھائل ہر شخص جو آرہا تھا، مجسمے کے پہلو میں کھڑا ہو کر تصویریں بنوا رہا تھا۔

یہاں سے سیدھے لنکن میموریل پہنچے کہ تینوں یادگاریں قریب قریب ہیں آٹھ ستونوں پر استوار ایک عظیم الشان ہال میں ابراہیم لنکن کا لحیم شحیم بت ایک کرسی پر تمکنت سے بیٹھا ہے جیسے آنے جانے والوں سے جمہوریت کا مفہوم پوچھ رہا ہو۔

یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لوگ مجسمے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اس کی گود میں بیٹھ کر تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ ہمیں تو شرم آگئی اور یہ کہتے ہوئے باہر نکلے ع

"کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی"

شعلے اگاتے ہیں :

سوچا جب سب آنجہانیوں کو آج مشکور کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تو کیوں نہ صدر کینیڈی کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے جائیں۔ مرحوم صدر کینیڈی امریکہ کے قومی قبرستان "آرلنگٹن سمیٹری" میں مدفون ہیں۔ بے تحاشا سیاح موٹروں اور بسوں میں بیٹھ کر اندر جا رہے تھے۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو قبرستان کا ڈسپلن دیکھ کر تھرّا اُٹھے خدایا یہ لوگ مردوں کو بھی ڈسپلن کی چھُری سے ذبح کرتے ہیں ـــــ تمام قبریں قطار اندر قطار.... تمام نشانیاں سلسلہ وار..... سیدھی لائنیں.... صاف راستے... نہ کوئی مردہ شرارت کر سکے نہ اُف ہائے کر سکے ـــــ ہم تو اس ننھے سے شعلے کو دیکھنے گئے تھے جو صدر کینیڈی

کی قبر پر ناتمام آرزو کی طرح ہمیشہ سلگتا رہتا ہے۔ اس شعلے کو دیکھ کر ایک شعر بے اختیار یاد آیا ؎

وہ آگ لے کے دل میں گیا ہوں کہ بعدِ مرگ
شعلے اُگائے ہیں میری خاکِ مزار نے

مسلّح نازنین :

ہم "آرلنگٹن سمیٹری" سے نکل کے اندھا دھند بھاگے جا رہے تھے کہ ایک مترنم سی وسل نے قدم پکڑ لیے۔ مڑ کر دیکھا تو نیلی وردی میں ملبوس ایک لوہے کا آدمی ہمیں اپنی جانب بلا رہا تھا۔ خوف سے لرزتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔ قریب پہنچے تو ہوش اڑ گئے..... ہپ کی چھاپا میں ایک نازنین نازآفریں سیٹی ہونٹوں سے لگائے کھڑی تھی۔ اجلے تن پر پولیس کی نیلی وردی، وردی پر سنہری بٹن.... بلوریں کمر کے گرد سخت بیلٹ کا حلقہ.... حلقے کے ساتھ کارتوس ـــــ کارتوس کے ساتھ ایک ملفوف خنجر.... کندھے کے ساتھ.... پستول.... پیکر میں نزاکت، لہجے میں پولیسوں والی کرختگی ـــــ کہنے لگی :

"آپ غلط سمت جا رہی ہیں ـــــ"

ہم نے مڑ کر دیکھا اور غور کیا.... قبرستان سے نکل کر دوبارہ قبرستان کی طرف جا رہے تھے... نہ بابا ادھر کون بہ رضا و رغبت جاتا ہے۔

اس نے ہماری سمت درست کی۔ ہم نے جُھک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور چُپکے سے اس کے کان میں یہ کہتے چلے کہ :

اے کیل کانٹوں سے لیس حسینہ! ابھی ہمارے دیس کی عورت کے ہتھیار آنکھ، عارض، ہونٹ اور زلفیں ہیں۔ انھیں ہتھیاروں سے سربراہ مفلوج اور راہنما مغلوب ہوئے۔ انھیں ہتھیاروں کے آگے شاعر بے بس اور ادیب

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دست بستہ نظر آتے ہیں۔ تُو نے وہ ہتھیار تج کے یہ وردی زیب تن کی... قسم ہے پروردگار کی تُو نے گھاٹے کا سودا کیا....

اسلامک سنٹر :

غیر ممالک میں مساجد دیکھ کر جی کس قدر خوش ہوتا ہے، اس کا ثبوت تو یہی ہے کہ ہم جمعے کی نماز ضرور کسی مسجد میں پڑھنے جاتے ہیں۔ یہاں واشنگٹن ڈی سی میں ایک جامع مسجد ہے۔ یہ مسجد مسلمان سربراہوں کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ شاہ فیصل مرحوم کے اسلام نواز جذبے کا منہ بولتا شاہکار ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

واشنگٹن میں مقیم مختلف ممالک کے مُسلمان ہر جُمعے کو یہاں اکھٹا ہوتے ہیں۔

اس مسجد کے اندر ایک درسگاہ بھی ہے۔

اور یہ درسگاہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اہلِ دل اور اہلِ ایمان لوگوں کی فراخدلی کی منتظر رہتی ہے۔

وائٹ ہاؤس :

جب ہم سینہ پھلائے وائٹ ہاؤس کے اندر داخل ہو رہے تھے تو سوچ رہے تھے کہ وطن جاتے ہی سب سے پہلے جو خبر اپنے بدخواہوں کو سُنائیں گے وہ یہی ہوگی کہ ہمیں باقاعدہ وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا۔

مگر اندر جاتے ہی دنگ رہ گئے۔ وہاں تو ایک خلقت تھی.... باقاعدہ قطار بندی سسٹم تھا.... دور و نزدیک کہیں کار پارک کرنے کی جگہ نہ تھی اور سیاحوں سے لدی ہوئی بسیں شوق کے ماروں کو گیٹ کے باہر اُنڈیل اُنڈیل کر

جا رہی تھیں۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ ہفتے کا دن چھوڑ کے، کہ وہ دن سرکاری کاموں کے لیے مخصوص ہوتا ہے، باقی ہر دن صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے.....

منگل اور جمعے کو وائٹ ہاؤس صرف ایک بجے دوپہر تک کھلا رہتا ہے اس لیے شائقین کا یہاں بھی ہجوم رہتا ہے۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ چُپ رہیں تو مسز مارکہنی کو شک ہونے لگتا ہے کہ ہم امریکہ سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہمارا ایک گھنٹے سے پہلے بولنا اشد ضروری ہوتا ہے

ہم نے سامنے امریکہ کا لہراتا ہُوا جھنڈا دیکھا تو جھٹ سے سوال تیار کر لیا:

"بھلا بتائیں تو امریکہ کے جھنڈے پر تیرہ لائنیں اور پچاس ستارے کیوں ہیں ——— ؟"

انھوں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"یہ تیرہ لائنیں امریکہ کی ابتدائی ریاستوں کی نشاندہی کرتی ہیں اور پچاس ستارے بعد میں ابھرنے والی ریاستوں کی نمائندگی کرتے ہیں"

ہم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

نو ستارے ہمارے ہاں بھی اُبھرے تھے مگر ع

"وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی"

وہائٹ ہاؤس کے بارے میں سوچتے ہوئے ہم ہمیشہ بڑے بڑے گنبدوں کلسوں اور بارہ دریوں والی ایک گنجلک و پُرشکوہ عمارت کا تصور کرتے تھے مگر وائٹ ہاؤس نہ اتنا زیادہ سفید ہے، نہ اتنا زیادہ محل ——— گھنے درختوں میں گھری ہوئی ایک مٹیالی سفید عمارت ہے جس کے در و دیوار سے ایک یتیمی برستی ہے۔ حالانکہ اس عمارت نے امریکہ کے ہر صدر کو اپنی آغوشِ محبت میں سلایا ہے بلکہ کئی ایک کو تو ہمیشہ کی نیند سُلایا ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کینیڈی سنٹر :

جہاں آرٹ اور کلچر کی کھچڑی پکتی ہے۔

اس خوب صورت عمارت کے اندر آرٹ اور فن کے نام پر ایک دنیا آباد ہے۔ ایک آئزن ہاور تھیٹر ہے۔ ایک آپرا ہاؤس ہے۔ کنسرٹ ہال الگ ہے اور امرکین فلم انسٹی ٹیوٹ بھی اس کے اندر ہے۔ ویسے ان کی کوئی بھی دنیا میخانوں اور ریستورانوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

اس عمارت میں ہم دور تک اندر نہیں گئے۔ اصل میں ہم کسی دوسرے ملک کے کلچر کو غلطی سے چھو بھی آئیں تو ہمارا اپنا کلچر رنگ بدلنے لگتا ہے اور اب تک ہم نے اتنے رنگ برنگے کلچرل شو دیکھے ہیں کہ سوالیہ نشان بنے ہر ایک سے کہا کرتے ہیں ؎

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو !

کیپیٹل ہل :

کیپیٹل ہل وہ واحد عمارت ہے جسے ہم نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور جس کے سامنے کھڑے ہو کر شکرانے کے طور پر سر کو جھکایا۔ اس کی وجہ بتائے دیتے ہیں۔ یہ ایک بڑے گنبد والی پراسرار عمارت، امریکہ کی سیاسی بصیرت کا جام جم ہے۔ امریکہ کا ہر بڑا فیصلہ اسی عمارت کے بطن سے نکلتا ہے۔ اس کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے واشنگٹن ڈی۔ سی کو فلک بوس عمارات کا عجائب خانہ نہیں بننے دیا۔ یعنی کیپیٹل ہل واشنگٹن ڈی سی کی بلند و بالا عمارت ہے اور قانون ہے کہ واشنگٹن ڈی۔ سی میں کوئی بھی عمارت اس سے بلند نہیں بنائی جائے گی۔

پانی پانی کر گئی

واٹر گیٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوتے وقت خوف ہمیں بھی آیا۔ گو ہم کوئی سیاسی بیان دینے اندر نہیں جا رہے تھے مگر یہ احساس غالب تھا کہ یہی وہ عمارت ہے جس نے امریکہ کے صدر نکسن کا راز طشت از بام کر کے اس کو ننگر ننگر، شہر شہر رسوا کیا۔ امریکہ کی کئی کئی منزلہ عمارتوں کی طرح یہ ایک عام سی عمارت ہے۔ آدھا حصہ رہائشی اپارٹمنٹس کے لیے مخصوص ہے اور باقی آدھے حصے میں سرکاری دفاتر ہیں۔ انہی میں سے ایک وہ دفتر ہے جس کی دیواروں کے کان ہیں اور دروازے پیٹ کے ہلکے ہیں ——— اس کے ارد گرد ڈوب مرنے کو چلو بھر پانی بھی نہیں مگر یہ پانی پانی کرنے کا اسرار جانتی ہے۔

سمتھ سونئین : SMITH SONION

یہ ایک بہت بڑا عجائب خانہ ہے۔ اس کی وسیع و عریض جڑواں عمارتوں کے اندر سائنسی نوادرات اور سائنسی ایجادات رکھی ہیں۔ امریکہ میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ ان کا ورثہ اور اثاثہ بنتا جاتا ہے اور اس کو وہ تاریخ کی طرح سمتھ سونئین جیسے عجائب خانوں میں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔

سرخی مائل سیاہ عمارت " ایرو سپیس میوزیم " کے لیے مخصوص ہے۔ اس عمارت کے اندر ہوائی جہازوں کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ رائٹ برادران کے بنائے ہوئے اولین ڈھانچوں سے لے کر موجودہ دور کے جمبو جیٹ تک ہر جہاز

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کا ڈھانچہ اور تاریخ موجود ہے اور تو اور اپالو گیارہ کا اصل ماڈل مع چاند گاڑی کے وہاں رکھا ہے اور سکائی لیب کا ڈھانچہ بھی جوں کا توں یہاں رکھ دیا گیا ہے۔

اگر کوئی شوقین کیمرا اور قلم لے کر اندر جائے تو خلائی تسخیرات کی پوری تاریخ لکھ کر لے آئے۔ بلاشبہ موجودہ نسلوں کے لیے دیکھنے کی جگہ ہے۔

لائبریری آف کانگرس :

محترم قارئین ——— ٹھہریے، ذرا دم لیجیے پہلے ہم ایک اعتراف کرلیں اور ساتھ ہی معذرت بھی ——— ہم جو آپ کو اپنے ساتھ لیے لیے امریکہ کے گلی کوچوں میں تھکا رہے ہیں، تو اس کی وجہ بھی بتا دیں۔ ہم یہاں واشنگٹن ڈی۔سی اس لیے آئے ہیں کہ "لائبریری آف کانگرس" میں ہماری ایک معصوم جگر گوشہ "چارہ گر" رکھی ہے۔ کل جب ہم نے فون کر کے بتایا تھا کہ ہم اپنی دوسری لختِ جگر "پیاسی" کو ساتھ لاتے ہیں تو انھوں نے ہمیں آنے کی دعوت دی تھی۔ "پیاسی" دینے کا تو محض ایک بہانہ تھا۔ ہم ان کی الماریوں میں سجی اپنی کتاب دیکھنا چاہتے تھے۔

اور جب ہم نے لائبریری کی خوب صورت عمارت کے اندر داخل ہو کر مطالعاتی ہال کا دروازہ کھولا تو اندر ادراک کی روشنی اور علم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی پہلی بار جی چاہا یہیں ٹک جائیں۔ اتنا بڑا ہال کہ ہر وقت ہزاروں علم کے رسیا یہاں بیٹھ کر تحقیق کر سکیں۔ اس وقت بے شمار مرد و زن اپنی اپنی میز پر ننھے ننھے لیمپ جلائے کتابوں کی دنیا میں غرق تھے۔ ہر چہرے پر لکھا تھا ——— "لے سانس بھی آہستہ ———" گزرنے والے بن چاپ کے گزرتے...

اور جو بات کرنی ہوتی سرگوشی میں کرتے۔ ہمیں اس ہال سے گزر کر "مشرقی علوم" کی لائبریری میں جانا تھا جو ذرا فاصلے پر واقع ہے۔ اُس عمارت میں جانے کے لیے زمین دوز راہداریاں اور بھول بھلیوں جیسی لفٹیں تھیں... مگر بھلا ہو ان ہدایات کا جو جگہ جگہ درج تھیں اور خضر کی صورت بھٹکنے نہ دیتی تھیں۔

بالآخر ہم اُردو کتب کی لائبریری میں پہنچ گئے۔

وہاں ایک مس شرمیلی نے باہر نکل کر ہمارا سواگت کیا

ایسی بے ساختہ شرم و حیا والی خاتون ہم نے امریکہ میں پہلی بار دیکھی تھی۔ نظریں جھکا کر بات کرتی اور بات بات میں چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ کاش ہم مرد ہوتے تو اس کی پہلی محجوب مسکراہٹ کے اسیر ہو چکے ہوتے اور اسے دامن سے باندھ کر اپنے دیس میں لے آتے۔ یہاں لا کر اسے کھونٹے سے باندھ دیتے ہمیشہ کے لیے ———

اس نے شرما شرما کر وہاں موجود سب لوگوں سے ہمارا تعارف کرایا۔ ہماری کتاب نکال کر لائی۔ ہمیں چائے پلائی۔ تب ہم نے اسے مصنف کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کا اعزاز بخشا۔

میری لینڈ پوسٹ آفس :

جانے ڈاکخانے سے ہمیں کیا ازلی نسبت ہے کہ ہم جس ملک، جس شہر میں جائیں۔ اس کے ڈاک خانے میں ضرور جاتے ہیں۔ خاکی وردی والا ڈاکیا بڑا اچھا لگتا ہے۔ لال لال لیٹر بکس میں خط ڈال کے یک گونہ طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم نے جب قلم پکڑنا سیکھا تھا اور الفاظ کی لاٹھی تھام کے مفہوم کے صحرا میں قدم رکھا تھا اپنی ننھی منھی سہیلیوں پر رعب ڈالنے کے لیے خط لکھا کرتے تھے اور ہمیں ان کے جوابات کا انتظار رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوہ قاف کی پریوں والی اور مافوق الفطرت شہزادوں والی کہانیوں کے آرڈر بھی دیا کرتے تھے اور جب کبھی گھر کی ڈیوڑھی میں ہمیں ڈاکیہ نظر آجاتا ہمارے چمن میں بہار آجاتی تھی۔

خط کا انتظار ہمیں تب بھی رہا کرتا تھا۔

خط کا انتظار ہمیں آج بھی رہتا ہے۔

اسی نامہ بر کے توسط سے آج اپنے قارئین کے ساتھ ایک خوب صورت سا تعلق قائم ہے.... سفر میں جب دل گھبرائے تو ہم سب احباب کو خط لکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ دس بارہ خطوط اکٹھے ہو گئے تھے۔ سوچا.... اسی بہانے میری لینڈ کا ڈاک خانہ بھی دیکھ لیں گے۔

صاف ستھرے ڈاک خانے کے اندر قدم رکھا ـــــ تو اسی ڈسپلن کا مظاہرہ ہوا جو ان کی روزمرّہ زندگی کا خاصا ہے۔

اپنے ہاں تو جب کبھی ڈاک خانے گئے، کھڑکی کے قریب پہنچنے کی دیر تھی۔ اردگرد ایک ہجوم سا ہو گیا۔ ایک ہاتھ دائیں طرف سے نکلا ٹکٹ دے دیں۔ دوسرا بائیں طرف سے بڑھا ابوظہبی کا ایرو گرام دے دیں... کوئی گرم بھبھو کا گردن پر... کوئی تیز نگاہ پیشانی پر.... پہلے مجھے.... پہلے مجھے.... ہر شخص پہلے میں کا وِرد کرتا ہے اور یہی عجلت ہر کام میں تاخیر کا باعث بن جاتی ہے۔

یہاں لوگ سکون سے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ اس لیے باری جلدی آجاتی ہے۔ ٹکٹ لے کر مڑے تو دیکھا سامنے جلی حروف میں لکھا تھا :

SERVICE IS OUR LAST NAME

ڈاک خانے کے اندر جھانکا تو دو صاحبان چُستی سے اپنا اپنا کام کر رہے تھے ان میں سے جب ایک نے ہماری طرف رُخ کیا تو پتہ چلا کہ وہ صاحب نہیں صاحبہ تھیں ـــــ ان کے سراپے اور صورت میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ بالوں پر زرد رنگ چڑھایا تھا اور مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ بدصورت عورتیں جب دوسروں کی توجہ کھینچنا چاہتی ہیں تو عجیب و غریب حُلیے بنا کر رکھتی ہیں.... خاص طور پر چار جیبوں والی مردانہ قمیص پہنتی ہیں۔ بوائے کٹ بال رکھتی ہیں تاکہ پیچھے سے مرد اور آگے سے عورت لگیں اور دیکھنے والے پکار اُٹھیں ؎

اس عشق میں ہر نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلےٰ نظر آتا ہے

اے دیس سے آنے والے بتا ـــــ ؟

ہم جب کبھی کسی نئے ملک میں جائیں تو وہاں مقیم پاکستانیوں سے ملنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں اور دل میں سوچ لیتے ہیں کہ یہ بھی ہمیں ملنے کو تڑپ رہے ہوں گے۔ میری لینڈ میں اتنے روز قیام کے باوجود جب کسی پاکستانی بیگم نے ہمیں گھاس نہیں ڈالی تو ایک دن ہم نے خود بنفسِ نفیس ان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک گھر میں سارے پاکستانیوں کی محفل جمی تھی۔ ہم بھی وہاں جا دھمکے فقیر بن کے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور تماشائے اہلِ وطن دیکھنے لگے۔ یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ بیگمات وہاں بھی اپنے حسب نسب اور جائیدادوں کی گٹھڑیاں اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ وہاں بھی وہ صرف اپنی ہی شناخت کرتی ہیں اور اپنی ذات کے حوالے سے بات کرتی ہیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کس بازار سے کیا خریدا تھا ـــــ ؟
اس مہینے کتنی بچت ہوئی ـــــ ؟
گھر میں کیا کیا تبدیلیاں کیں ـــــ ؟
پاکستان سے اچانک کتنے مہمانوں نے دھاوا بول کے گھر کے سکون کو درہم برہم کیا ـــــ ؟
ایک کا دوسری سے سبقت لے جانے کا وہی انداز ـــــ !
وہی مَیں ـــــ مَیں ـــــ مَیں ـــــ !
جب کسی بیگم نے اپنی بیگمی کی شان سے نیچے اُتر کے ہم سے ہمکلام ہونے کی کوشش نہیں کی تو پھر ہم نے اپنے نطق کا کشکول آگے بڑھایا۔
"آپ کو امریکہ کیسا لگا ـــــ ؟" ایک خاتون نے ازراہِ مروّت جلدی سے پوچھا۔
"بہت اچھا ہے امریکہ۔ بہت خوبصورت ملک ہے۔"
"پھر کیا خیال ہے آپ کا ؟"
"کیا مطلب ـــــ ؟"
"کیا آپ امریکہ میں رہنے کو ترجیح دیں گی یا واپس جانا پسند کریں گی ؟"

نہ کر ہم نشیں دل جلانے کی باتیں
قفس میں نہ کر آشیانے کی باتیں

واپس ـــــ ہر قیمت پر واپس ـــــ" ہم نے جلدی سے کہا۔
"اُس دیس میں جس کی مٹی سے خوشبو آتی ہے۔ وہاں جہاں بہت سی سہولتیں نہیں ہیں ... جہاں لوگ کام چور ہیں سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہیں ... پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا... اسی خاک سے نسبت ہے ہمیں"

انھوں نے بُرا سا منہ بنایا اور کام کرنے کے بہانے اُٹھ گئیں۔
"آپ نے کیا کچھ خریدا ہے یہاں سے ـــــ ؟"
دوسری خاتون نے ہمارا دل رکھنے کو گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔
"دردِ دل خریدا ہے یہاں سے۔"
"ہیں وہ کیا ہوتا ہے ؟"
"یہ رائٹر ہیں۔" فخر بھابھی نے جلدی سے انھیں سنبھالا دینے کی کوشش کی ـــــ
"او۔ آئی سی" کہہ کر انھوں نے ہماری طرف ترس کھائی نظروں سے دیکھا اور پھر رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔
کسی خاتون نے بے چینی سے وطنِ عزیز کے بارے میں کوئی چُبھتا ہُوا سوال نہیں کیا۔ جیسے وہ سب جانتی ہیں اور مزید جان کر کیا لینا ہے۔
ایک بزرگ خاتون جو تیس سال سے امریکہ میں رہ رہی تھیں، تجربہ کار اور ایماندار نظر آئیں۔ ہم نے ان کا دامن تھام کے تجسس اور تحیّر کی آگ بُجھانا چاہی تو وہ شروع ہو گئیں:
"یہاں لوگ خوش نہیں ہیں... مگر جکڑے ہوئے ہیں یہ مایا جال ہے آتے ہیں تو پھنس جاتے ہیں۔ ہاتھ پیر مارنے کے باوجود یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ دن بہ دن یہاں مہنگائی زیادہ ہو رہی ہے گزارہ مشکل ہو جائے گا۔ یہاں پر زندگی کی ہر آسائش خریدی جا سکتی ہے ... مگر ٹیکس ایک آدمی کی کمر توڑ دیتے ہیں۔"
"یہ گھر تو آپ کے اپنے ہوتے ہیں ؟"
ہم نے معصوم سا سوال کیا۔
"نہیں ڈیئر!" انھوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "ہر آدمی یہ گھر قسطوں کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ذریعے خریدتا ہے اور جب تک جیتا ہے، قسطیں ہی ادا کرتا رہتا ہے۔ لوگ کہنے کو اپنے گھروں میں رہتے ہیں مگر ان گھروں کے مالک نہیں کہلا سکتے... موٹروں پر ٹیکس لگتا ہے... بچوں کی اعلیٰ تعلیم بہت مہنگی ہے۔"

"یہاں ایک عام آدمی کی اوسط آمدنی کیا ہے؟"

بولیں:

"ایک عام آدمی کی اوسط آمدنی بیس ہزار ڈالر ہے جس میں سے وہ اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے پیسہ نہیں بچا سکتا۔ اس لیے تمام بچے چھٹیوں کے دوران ملازمتیں کر لیتے ہیں یا تعلیم ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں غریب طبقے کا زندہ رہنا نہایت مشکل ہے۔"

"غریب طبقہ ——؟" ہم نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا "کیا یہاں بھی غریب لوگ ہوتے ہیں...؟"

"ہاں ہاں۔" وہ ہماری جہالت پر ذرا بھی جز بز نہ ہوئیں۔

"یہاں ایک ایسا طبقہ ہے جو ساڑھے سات ہزار ڈالر سالانہ کماتا ہے۔ اس کا معیارِ زندگی پست ہے۔ ان کے پاس رہنے کو اچھا گھر نہیں۔ کھانے کو اچھی خوراک نہیں... ان کے بچے پرائمری کے بعد تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے بچے بھی پسماندہ اور غریب ہی رہتے ہیں۔"

"پھر ہمارے ملک کے غریب منہ اٹھا کر ادھر کیوں آجاتے ہیں؟"

دور سے چمکنے والی ہر چیز سونا جو نظر آتی ہے۔ اور وہ یہاں آکر گھٹیا طرزِ رہائش اختیار کرنا پسند کرتے ہیں اور گھٹیا کام کرنا قبول کر لیتے ہیں۔"

"دیکھیں نا!" ایک دوسری خاتون نے ہماری گفتگو میں باقاعدہ حصہ لیا "یہاں ہیلتھ پالیسی بہت مہنگی ہے۔ ہسپتالوں کے معاوضے بہت

زیادہ ہیں۔ لوگ اچانک مرجانا پسند کرتے ہیں، بیمار ہونا پسند نہیں کرتے۔"

پھر محفل میں شریک سبھی لوگ اس ملک کے بارے میں دیانت دارانہ اظہارِ خیال کرنے لگے۔ اس وقت ہم نے دھیرے سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جسے دانتوں تلے دبائے پھر رہے تھے۔

"اب تو آپ لوگوں نے کافی دنیا دیکھ لی ہے۔ واپس کیوں نہیں چلے جاتے ——؟"

اس پر سب نے لب سکوڑے اور اپنا اپنا جواز پیش کرنے لگیں:

"وہاں اجارہ داری ہے۔"

"وہاں رشوت ستانی ہے۔"

"وہاں ٹیلنٹ کی قدر نہیں کی جاتی۔"

"وہاں اچھے جاب نہیں ہیں۔"

"حالات غیر یقینی ہیں۔"... وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے کہا۔ "یہ ساری زندگی ایک یقین کے سہارے گزرتی ہے۔ کیا یہاں امریکہ میں کرپشن اور رشوت ستانی نہیں ہے؟"

"ہاں ہے۔" انھوں نے کہا "مگر یہاں کرپشن اور رشوت ستانی صرف اعلیٰ سطح پر ہے جس سے عام شہریوں کو نقصان نہیں پہنچتا۔"

"آپ نے اپنے بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے....؟ خصوصاً لڑکیوں کے بارے میں جو یہاں پروان چڑھ رہی ہیں؟"

اس پر سب خواتین نے بیک نظر مسز تھ کی جانب دیکھا اور پھر جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

عشق شرع داویری

ہمارے پاس سانپ کے سونگھے کا منتر تو تھا نہیں کہ ان معزز خواتین پر پھونکتے اور ان کی زبانوں کے قفل کھل جاتے۔ یوں بھی عشائیہ شروع ہو چکا تھا۔ یہاں کھانے کے بعد لوگ جلدی رخصت ہو جاتے ہیں کیونکہ پکانے والے بھی خود اور برتن دھونے والے بھی خود ـــــ صبح سات بجے کام پر جانا ہوتا ہے اور ہر صبح کئی کئی میل موٹر چلانا پڑتی ہے۔ اس لیے محفل جلدی برخاست ہو گئی۔ بوقتِ رُخصت کئی نیک بیبیوں نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملائے اور چالو فقرہ جھولی میں ڈالا یعنی

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

ہم سوچتے رہے۔ کوئی نہ کوئی ہمیں بھی دعوت دے گی مگر غریبوں کو غریب خانے پر کون بلاتا ہے؟ یہ تو یہاں اردو بولنا باعثِ شرم سمجھتی ہیں۔ اردو ادب کا ادب کیا جانیں...؟

البتہ مسز ت ش نے جاتے جاتے فخر بھابھی سے پوچھا۔

"کل آپ مہندی پر آ رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں!" فخر بھابھی نے کہا۔

"تو اپنی دوست کو بھی ضرور لائیے گا!"

"کیسی مہندی ـــــ؟ کس کی مہندی ـــــ؟" ہم نے استفسار کیا تو فخر بھابھی نے ہمیں بتایا۔

"ان کی بیٹی کی شادی ایک امریکن نژاد عیسائی لڑکے سے ہو رہی ہے اور یہ تمام پاکستانی رسمیں ادا کرنا چاہتے ہیں...."

"اچھا اچھا... لڑکا مسلمان ہو گا؟"

"جی نہیں" انھوں نے بتایا "لڑکا خالص امریکی ہے۔ یونیورسٹی میں لڑکی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک اپارٹمنٹ لے کر رہتے تھے۔ اب لڑکی نے صاف کہہ دیا تھا کہ سیدھے سیدھے میری شادی کر دیں ورنہ میں اپنی شادی کا اعلان خود ہی کر دوں گی... اس لیے والدین دھوم دھام سے ـــــ پاکستانی لڑکی اور امریکی لڑکے کی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

واہ وا ورجینیا : RICHMOND VIRGINIA

رچمنڈ ورجینیا کے بارے میں ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ کنواروں اور کنواریوں کا دیس ہو گا۔ جونہی ہم اس کی حدود میں داخل ہوں گے، لوگ لمبے لمبے ہار لے کر ہماری پیشوائی کو نکل آئیں گے اور یہ کہہ کر ہمارے گلے کو پھولوں سے لاد دیں گے ـــــ آپ پہلی شادی شدہ خاتون ہیں جو کنواروں کے جزیرے میں داخل ہو رہی ہیں.....

مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہماری اس خوش فہمی کو رفیق جنجوعہ نے یہ کہہ کر دُور کر دیا کہ اس علاقے کو رچمنڈ ورجینیا کہتے ہیں مگر یہاں کنواری یا کنوارے کو ڈھونڈنا لانا ہے جُوئے شیر کا ـــــ!

رفیق جنجوعہ صاحب ہماری دوست ناہید کے شوہر ہیں۔ ان کا آبائی شہر لالہ موسیٰ ہے۔ عرصہ دراز سے امریکہ میں براجمان ہیں۔ منہ ٹیڑھا کر کے نتھنوں کی مدد سے پرانگریزی بولتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچوں کے ساتھ بھی اردو یا پنجابی بولنا پسند نہیں کرتے مگر تہبند باندھ کے گھر میں پھرتے ہیں۔ روٹی کے اوپر پیاز رکھ کر کھاتے ہیں اور پنجابی کے مزے دار لطیفے سناتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی اخلاص اور محبت والے ہیں۔ ہماری آمد کا سنا تو بھاگم بھاگ میری لینڈ پہنچ گئے۔ امریکہ

جیسی جگہ پر خلوص کا اظہار یہی ہے کہ کوئی ایک شہر سے دوسرے شہر کسی سے ملنے جائے... نہ یہاں وقت فالتو ہوتا ہے۔ نہ سفر آسان...

واپسی پر ہمیں اپنے ساتھ ہی لیتے آئے۔ ان کے پاس ویسے تو ہمیں آنا ہی تھا مگر انھوں نے دو زبردست چیزوں کا لالچ بھی دیا تھا۔ ایک تو یہاں رچمنڈ ورجینیا کے قریب ایک خوب صورت وادی ہے جس کا نام "شانن دوہا" ہے۔ اس کے حسن کے قصے ہم صاحب عالم کی زبانی سُن چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ہمیں بحرِ اوقیانوس کی بیچ دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ بیچ کے لذیذ مناظر کا آنکھوں دیکھا... حال بھی صاحب عالم کی زبانی ہی سنا تھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ داستان سناتے وقت نہ صرف انھیں زیب آرائی کرنے کی عادت ہے بلکہ ان کے پاس ہر قسم کی معلومات کا زائد مرچ مصالحہ اِتنا ہوتا ہے کہ جہاں چاہیں اِستعمال کرلیں پھر بھی ہم امریکہ آئے بیٹھے تھے اور نظارہ ہائے نو بہ نو سے اپنی آنکھوں کو غسل دینا چاہتے تھے۔

اس شہر میں ہمارا قیام صرف ایک ہفتے کے لیے تھا۔ اس لیے پہلے دو دن ہم نے حسبِ عادت سارے شاپنگ سینٹر اور مشہور عمارات دیکھ ڈالیں۔ بازاروں کا تو وہی عالم جو ہر بڑے شہر میں ہوتا ہے۔ شوق کی ارزانی اور اشیا کی فراوانی ـــــ ہجومِ مہ رخاں اور حیلۂ دلبراں ـــــ !

البتہ بعض عمارات دیکھ کر حیرت ہوئی بلکہ ان کا اسمبلی چیمبر نہ ہیبت ناک ہے نہ پُرشکوہ ـــــ ایک عام سی مسکین سی عمارت ہے۔ نہ باہر باوردی پولیس نہ کوئی نیزہ بردار دربان ـــــ یہی حال گورنر ہاؤس کا تھا۔ کوئی چوب دار دروازے پر نہ تھا اور نہ کسی دروازے پر لکھا تھا "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔"

شہر میں ابھی تک قدیم زمانے کے نشانات موجود ہیں۔ کہیں مجسّموں کی صورت

میں اور کہیں دیواروں پر کندہ نقوش کی شکل میں! رچمنڈ ورجینیا امریکہ کے بڑے اور مصروف شہروں کی نسبت پُرسکون اور نرم مزاج ہے۔

کنواری وادی : SHANANDOAH VALLEY

انتہائی خوب صورت راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم شانن دوہا کی حسین و دلکش وادی میں پہنچ گئے۔ راستے میں ورجینیا یونیورسٹی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس کی بنیاد صدر جیفرسن نے رکھی تھی۔ رچمنڈ کی حدود سے باہر نکلیں تو ایلی گینی پہاڑوں ALIGANY MOUNTAINS کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ زمین کے سینے پر مست ہاتھی کی طرح لیٹے ہوئے سیاہ پہاڑ اور ان کی چھاتیوں پر شیر خوار کی طرح لپٹا ہوا سبزہ ـــــ کیا بھلا نظارہ ہے۔

ان پہاڑوں کے سلسلے نسلوں میں بٹے ہوتے ہیں.... نسل در نسل دور دور تک جاتے ہیں۔ اسی بات سے اندازہ لگالیں۔ ایک طویل مُسافت کے بعد ان پہاڑوں کا سلسلہ کینیڈا سے جا مِلتا ہے۔ لیکن امریکہ کی حدود کے اندر اِن پہاڑوں کو APPALACHAX MOUNTAIN RANGE کہتے ہیں۔

پہاڑوں کے نشیبی حصوں میں چھتریوں والے درخت قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے، زمین سے آسمان تک سبزے کا سائبان تنا ہوا ہے۔ ہر نشیب اور ہر فراز پر ایک سبز چادر سی تنی رہتی ہے۔ اس وقت ہم نے سوچا... اے کاش! کوئی اڑن طشتری ایسی بھی ایجاد ہو جس کے سہارے آدمی درختوں کی ان چھتریوں پر لوٹ پوٹ ہو کے واپس آجائے۔

شانن دوہا وادی رچمنڈ ورجینیا سے تقریباً ایک سو میل دُور ہے۔ سنا ہے اس وادی کا نام کسی ہندو دیوی کے نام پر ہے۔ چلتے چلتے سڑکیں اُوپر کو اُٹھنا شروع ہوجاتی ہیں۔ ان اُوپر جاتی ہوئی گول گول اور سبزہ زار سڑکوں کو سکائی لائن ڈرائیو

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

SKYLINE DRIVE کہتے ہیں، جو دیکھتے دیکھتے اتنی بلندی پر لے جاتی ہیں کہ زمین ایک ننھے نکتے کی طرح نظر آنے لگتی ہے۔ آسمان کے اودے نیلے کنارے قریب آجاتے ہیں۔ یہاں نظر اٹھا کے آدمی جھپک نہیں سکتا۔ یہاں درخت اَن چھوئی کنواریوں کی طرح شرمائے سے کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں ہوا چلتی نہیں لڑکھڑاتی ہے۔

یہاں سناٹا موسیقی کی طرح بج اُٹھتا ہے۔

یہاں سچّا اور کچّا حُسن ہے۔

اس وادی کو غیر قدرتی عناصر سے پاک رکھنے کے لیے یہاں گرد و نواح میں ہوٹل اور موٹل بنانے کی اجازت نہیں دی گئی... رات ٹھہرنے کے لیے کوئی سرائے بھی نہیں... خوفناک اور دلدوز غاریں ہیں.... شوقین ان کے اندر جا سکتے ہیں.... مگر ریستوران، مشروبات، مکروہات کچھ بھی تو یہاں دستیاب نہیں... لوگ موٹروں میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ نظارہ کرتے ہیں... گھومتے ہیں... محسوس کرتے ہیں.... اور لوٹ جاتے ہیں۔ نہ یہاں فلک بوس رہائشی عمارتیں ہیں نہ خطرناک قسم کا ٹریفک۔ یعنی اس وادی کو دانستہ جدید تہذیب سے بچا کر رکھا گیا ہے جس طرح کسی باعصمت لڑکی کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ وادی ابھی تک کنواری ہے۔ مہذب دنیا کے دستِ گستاخ نے اس کے قدیم اور قدرتی پیراہن کو چاک نہیں کیا۔ اس کے اندر وہ خوشبو ہے، جو کنواریوں کے جسم سے آتی ہے۔ اس کے اندر وہ حُسن ہے جو الھڑ مٹیار کے چہرے میں ہوتا ہے۔ اس کے نظاروں میں وہ بے ساختگی ہے جو گاؤں کی کچّی ڈیوڑھی کے باہر کھیلنے والے معصوم بچوں میں ہوتی ہے۔

ساحلِ مراد :

اتوار کے روز ہم نے بیچ پر جانے کا پروگرام بنایا اور ہمارا خیال ہے کہ ہفتے اور اتوار سے بہتر ان جگہوں پر جانے کے لیے کوئی اور دن موزوں بھی نہیں ـــــ گھر سے ناشتہ کر کے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ ناہید جنجوعہ، رفیق جنجوعہ اور ان کے دونوں بچے تھے۔ رفیق جنجوعہ انگریزی بولتے بولتے ایک پنجابی طرز کی ٹھنڈی آہ بھر کے لالہ موسیٰ کو یاد کرنے لگتے تھے اور اسی وقت ان کی بیگم ناہید جنجوعہ تمام امریکی سہولتیں اور امریکی آسائشیں گنوانا شروع کر دیتیں گو رفیق جنجوعہ صاف لفظوں میں نہیں کہتے تھے کہ انھیں اپنا دیس یاد آرہا ہے اور نہ ناہید جنجوعہ کھُلم کھُلا امریکہ میں رہنے پر زور دیتی تھیں ـــــ مگر باتوں باتوں میں بات آپ ہی آپ سمجھ میں آجاتی تھی۔ ایسے میں ہم دانشور بنے دونوں کے دلائل سُنا کرتے کہ بیچ کو جاتے وقت میاں بیوی کے بیچ بولنا عقل مندی نہیں۔

راستہ انتہائی دلچسپ اور خوب صورت گفتگو میں کٹا۔ ہیمپٹن روڈز HAMPTON ROADS کے مشہور مقامات سے گزرتے وقت ہم نے ایک پُراسرار گول مٹول سی عمارت دیکھی تو حیران رہ گئے ـــــ عمارت ایسی تھی جیسی دُور سے گندم کی ڈھیری نظر آتی ہے۔ قریب جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس عمارت کو یہاں "کالے سیئم" COLLESIUM کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کے کلچر سنٹر یا کمیونٹی سنٹر ہوتے ہیں۔ ان میں اِن ڈور گیمز اور اس قسم کی تفریحات کا بندوبست ہوتا ہے۔ "کالے سیئم" بنانے کا تصور امریکیوں نے رومیوں سے لیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ قدیم روم سے اپنی نسبت جوڑنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ اب ان کالے سیئم جیسی جگہوں میں انسانوں کو شیروں کے آگے نہیں ڈالا جاتا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بلکہ حسینوں کے پیراکی کے مقابلے، ٹینس، سکوائش اور اس قسم کی دوسری بدنی ورزشوں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اسی ہیمپٹن روڈز پر ہم نے سیمنٹ کی بنی ہوئی ایک اتنی خوبصورت عمارت دیکھی کہ بے اختیار کہہ دیا ـــــ "سبحان اللہ! کسی انجینیر نے کنکریٹ میں شاعری کی ہے۔" یہاں رہنے والے پاکستانی مسلمان ان خوب صورت عمارات کے آس پاس ایک شاندار مسجد بنانا چاہتے ہیں مگر تاحال مناسب چندہ اکٹھا نہ ہو سکا تھا۔ ساحل کی طرف جاتے جاتے اور ارد گرد کی خوبصورت عمارات کا معائنہ کرتے کرتے

یکایک ہم سمندر کے جگر میں اُتر گئے۔ بس ـــــ لمحہ بھر کو ہماری اوپر کی سانس اوپر اور تلے کی تلے رہ گئی ہمیں اپنے سامنے نیلا، نکھرا اور بپھرا ہوا سمندر صاف نظر آ رہا تھا۔ اوپر کوئی پل نہ تھا، اس پر کوئی سڑک نہ تھی ـــــ مگر جنجوعہ صاحب اندھا دھند موٹر بھگائے لیے جا رہے تھے۔ جب وہ سمندر کے اندر گھسنے لگے تو ہم نے آنکھیں بند کر لیں سوچا اب ہمارے ارد گرد اوپر نیچے پانی ہی پانی ہوگا اور جانے اس کے بعد کیا ہوگا ـــــ؟ کیا ہوگا ـــــ اور اور جب کافی دیر بعد ناہید اور رفیق کے قہقہے سنائی دیے تو ہم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں... ہم تو ایک چکا چوند قسم کی صاف ستھری سُرنگ میں سے گزرے چلے جا رہے تھے ـــــ جگہ جگہ روشنی کے قمقمے جل رہے تھے اور ہدایات درج تھیں تمام موٹریں ایک خاص رفتار سے سکون کے ساتھ آ جا رہی تھیں ـــــ یہ کیسے دیوانے ہیں جو پانی کا کلیجہ چیر کے راستے بنا لیتے ہیں.... حیرت نے ہمیں خاموش رکھا ـــــ باہر نکلنے سے پہلے ایک بورڈ سامنے آ گیا جس پر لکھا تھا:

"ابھی بتیاں نہ بجھائیے...."

باہر نکلنے کے کافی دیر بعد ایک اور بورڈ نظر آیا۔ لکھا تھا:

"مہربانی کر کے اب بتیاں بجھا لیجیے۔"

اور سب کاروں کی بتیاں بجھنے لگیں۔ تب ہم نے اردگرد آویزاں بڑے بڑے بورڈوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔

زیادہ تر ہوٹلوں کے اشتہار تھے اور اشتہار بھی اس قسم کے:

"کیا آپ لہروں کے ساتھ سونا چاہتے ہیں؟ ہمارے ہوٹل کا انتخاب کیجیے۔"

"پانی سر پر رکھ کر خواب دیکھنا چاہتے ہوں تو ہمارے ہوٹل سے موزوں ترین جگہ کوئی نہیں۔ اپنا ساتھی لائیے اور خواب دیکھیے ـــــ"

ان فلک بوس عمارات اور چاندی جیسی روشوں کو دیکھ کر ہم نے پہلی بار سوچا کہ سچی قسم صرف انجینیر کی ہوتی ہے۔ یہ شاعر تو بس جھوٹ موٹ فلک کے تارے توڑ کر اوڑھنی کو سنوارنے کی باتیں کرتے ہیں۔ انجینیر وہ مستانے ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں کا دل چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ پانی میں راستے نکال لیتے ہیں۔ آندھی میں دیا روشن کر دیتے ہیں۔

بحرِ اوقیانوس کے ارد گرد جو شہر آباد ہے۔ اسے دنیا کے نقشے پر "چیز پیک بے" CHEASPEAK BAY کہتے ہیں ـــــ سمندری سرنگ سے نکلتے ہی اس شہر کی حدود شروع ہو جاتی ہیں ـــــ اور اس شہر میں داخل ہوتے ہی بیچ کی متحرک نشانیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔

ربڑ کی گڑیاں اور گڈے ... بکنیاں لفافے جیسے شامیانے نواڑ کی آرام کرسیاں ... بدن ... بدن ... اور گلبدن!

یوں لگتا ہے جیسے مادر پدر آزاد آدم و حوا کی اولاد کو آج ہی اسی سرزمین پر اتارا گیا ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سامنے سے بکنی میں ملبوس ایک گُل رُخ آرہی تھی۔ سینے کی پٹی پر لکھا تھا:

"آجکل میرے حالات گمبھیر ہیں۔ مجھے نہ چھیڑیئے۔"

ہماری پنجابی زبان میں اسے کہتے ہیں:

"توں مینوں چھیڑیں گا۔"

ساحل کے قریب پہنچے تو جگہ جگہ گلابی گوشت کی ڈھیریاں نظر آئیں۔ کہیں کہیں پر کپڑے کے گل رنگ خیمے بھی لگے تھے۔ خیموں کے اندر بھی ڈھیریاں ہی تھیں ——— کچھ ڈھیریاں نواڑ کی آرام کرسیوں پر بے سُدھ پڑی تھیں... ہم نے سارا ساحل گھوم کر دیکھا... عام زندگی میں یہاں کی عورت بے حجاب اور بے لباس رہتی ہے مگر ساحلِ سمندر پر مرد بھی اس کی تقلید کرتا ہے... بس یہی ایک فرق نمایاں ہے، بیچ پہ

دونوں ہی دھجیّاں پہن کر یہاں آتے ہیں۔

شادی شدہ جوڑے اپنے بچوں سمیت یہاں آئے تھے... بوڑھے اور بوڑھیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کے ساتھ آتی ہیں۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ سامنے جھاگ جھاگ سمندر میں جو ساٹھ سالہ بڈھا نہا رہا ہے، اس کے قریب بکنی میں اس کی بائیس سالہ بیٹی اس کے ساتھ چہلیں کر رہی ہے۔

ایک نسواری رنگ کے خیمے میں ایک کالی میم اور کالا صاحب ایکدوسرے کو سانس دلوانے کی پریکٹس کر رہے تھے اور معصوم بچّہ جھالروں والی کاٹ میں پڑا بے اختیار رو رہا تھا ———

دو نوجوان لڑکا لڑکی ریت پر اوندھے مُنہ پڑے تھے۔ ان کے مُنہ کان ناک میں ریت ہی ریت تھی۔ ان کے پاس بیئر کی خالی بوتلوں کا ڈھیر پڑا تھا لیکن وہ یوں سوئے تھے جیسے صورِ اسرافیل سُن کر ہی جاگیں گے ———

لوگ پہلے پانی کی سرکش اور تیز تر لہروں سے کھُل کھیلتے اور پھر آکر بے اختیار گرم گرم ریت پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے ——— پھر کوئی وحشت سوار ہوتی تو دوبارہ سمندر کی طرف دوڑ جاتے۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے فوم کے نرم گدے اور آرام دہ چھپر کھٹ ایجاد کیے ہیں۔ آسائشوں سے بھرے ہوئے گھر بنائے ہیں... زندگی کو مہذب اور منور کیا ہے۔ مگر لوٹ لوٹ کر غاروں کی طرف جاتے ہیں۔ چیتھڑوں میں ملبوس یہاں جو انسان نظر آرہا تھا، وہ بنی نوع انسان ہرگز نہیں لگ رہا تھا ———

ہم جو امریکہ کی وادیوں میں مردانہ وار گھوم رہے تھے، اس ایک نظارے نے ہماری فطرت کو مجروح کر کے رکھ دیا۔ چپ چاپ ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ اور اپنے آپ کو کوسنے لگے کہ قصاب کی دکان پر کوئی بھی زیادہ دیر نہیں رُک سکتا۔

اتنے میں چار مستانیاں اُبلتی جوانیاں بے خودی کے چھینٹے اڑاتی..... ہنسی کے گھونگھرو بجاتی بالکل ہمارے قریب آکر ریت پر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ پہلے انھوں نے ہمارے لباس پر تنقید کی پھر دوپٹے کو ہدف بنایا۔ اس وقت ہمیں اچانک خیال آیا... اس بے حجاب نگری میں ہمارا ملبوس ہونا ضرور کھٹک رہا ہوگا۔

ہم نے مسکرا کر نازنینوں کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ بھی مسکرائیں۔

پھر ہم نے ہمت کر کے کہا:

"کیا آپ ہمارے ساتھ تصویر اتروانا پسند کریں گی؟"

بولیں "شوق سے!"

دو چار تعارفی فقروں کے بعد وہ ایک دم سینہ تان کر کھڑی ہو گئیں جب تصویر اتر چکی تو پوچھنے لگیں:

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"آپ اِس تصویر کا کیا کریں گی ؟"

ہم نے کہا :

"ملبوس اور غیر ملبوس کا فرق دیکھا کریں گے۔"...

جیری رامان :

یہاں ایک محفل میں ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انگریزی امریکیوں کی طرح بولتے تھے۔ کھونٹے پر ایک طویل القامت بے ہنگم سی گوری باندھی ہُوئی تھی۔ دو گنگا جمنی بچے تھے ـــــ چہرے پر بنیے جیسی ہوشیاری تھی۔ جیب کو مضبوطی سے پکڑتے تھے۔ ان کا تعارف جیری رامان کہہ کر کرایا گیا ـــــ

جب وہ رفتہ رفتہ پنجابی پر اتر آئے اور پاکستان پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگے تو ہمیں ان کا محل وقوع اور حدود اربعہ معلوم کرنے کا شوق ہوا ـــــ شوق کا کیا ہے؟ یہ تو ہمیشہ بے سروسامان ہی نکلتا ہے ـــــ معلوم ہوا کہ جب پاکستان سے چلے تھے تو ان کا اصل نام جلیل الرحمٰن تھا.... انھیں سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی عادت نہیں ـــــ انگلی ٹیڑھی کرنے کے عوض انھیں اپنا نام رہن رکھنا پڑا ـــــ یہودی امریکیوں کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں، جب سے جیری رامان ہوئے ہیں ـــــ میم بھی نصیب ہوئی ہے اور دھن بھی ع تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

نکیل :

ایک دن بیٹھے بیٹھے ناہید نے کہا ـــــ "میری امریکی ہمسائی کے گھر

بچہ پیدا ہُوا ہے، میں اسے دیکھنے جا رہی ہوں۔ آپ اگر امریکہ کی کسی گھریلو عورت سے ملنا چاہیں تو چل سکتی ہیں۔

امریکہ میں بیٹھ کر ہم کسی گھریلو عورت کا تصور نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں گھر والیاں باہر ہی نظر آتی ہیں، اس لیے اٹھ کر چل دیے گوری ایک چھوٹے سے خالی خالی گھر میں رہتی تھی۔ علیک سلیک کے بعد یہ جان کر تعجب ہوا کہ گوری نے پانچویں بچے کو جنم دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے کم بچے خوشحال گھرانہ کے سارے حربے ایجاد کیے ہیں۔ ہمیں بے وقوف بنا کے خود مزے لوٹ رہے ہیں۔ ہم نے چھٹتے ہی یہی سوال کر دیا۔

وہ مسکرا کر بولیں :

"امریکی مرد کو پھنسانے کا گر یہی ہے۔ ہم عورتیں باہر کی مشقت سے تھک گئی ہیں۔ اب گھر میں رہنا چاہتی ہیں لیکن امریکہ کی سوسائٹی میں مرد مہنگا اور عورت سستی ہے۔ جن دفتروں میں خوشحال امریکی کام کرتے ہیں وہاں خوش ادا سیکرٹریوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہر ملک کی سیکرٹری کا آئیڈیل اس کا باس ہوتا ہے۔ وہ باس کو پھنسانے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔ امریکی عورت بھی سیکرٹری کے چکر سے خائف رہتی ہے۔ اسی لیے وہ دھڑا دھڑ بچے پیدا کرتی ہے تاکہ اس کے شوہر کی توجہ اِدھر اُدھر نہ ہو ـــــ"

ہم نے گھوم پھر کر دیکھا، ان کے گھر میں کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم میں صرف قالین بچھا تھا اور باورچی خانے میں بس ضرورت کا سامان تھا۔

گوری ہنس کر بولی :

"صرف ایک آدمی ہے کمانے والا... ہمیں زندگی کی سب آسائشیں حاصل نہیں ہیں... رفتہ رفتہ پس انداز کر کے گھر کی سب چیزیں خرید لیں گے پھر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کندھے اچک کر بولی ـــــ "مجھے کوئی خاص پروا بھی نہیں۔ گھر میں تنگی ہو تو مرد کولہو کا بیل بن کے جُتا رہتا ہے ـــــ پیسہ فالتو ہو تو اِدھر اُدھر منہ مارتا ہے ـــــ اس لیے مرد کو زیادہ پیسہ کمانے کے لیے مجبور بھی نہیں کرنا چاہیے بعد میں عورت کو بھگتنا پڑتا ہے۔"

ہم نے کہا "یہ نکتہ تو سونے کی روشنائی سے لکھنے کے قابل ہے۔ لائیے ہم اسے اپنے ملک میں لے جائیں جہاں ہر دوسری عورت محلے میں نام اونچا کرنے کے لیے اپنے شوہر کو پردیس کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور کرتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں جو دولت مند نہیں ہوتے، انھیں شوہر نہیں سمجھا جاتا۔"

اتنے میں نومولود کے چیخنے کی آواز آئی۔ گوری نے جھٹ دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا اور بولی:

"بچے کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔"

پھر ہماری موجودگی کو نظر انداز کر کے اس نے بچے کو کاٹ میں سے نکالا۔ قالین پر آلتی مار کر بیٹھ گئی اور بچے کو دُودھ پلانے لگی۔

ہم سے نہ رہا گیا ـــــ ہم نے کہا:

"آپ بچے کو اپنا دودھ پلاتی ہیں! حالانکہ آپ انگریزی بولتی ہیں؟"

کہنے لگی:

"بچے کے لیے ماں کا دُودھ اکسیر ہوتا ہے۔ میں کم از کم چھ ماہ بچے کو اپنا ہی دودھ دیتی ہوں۔ یہ تو ایک قدرتی نعمت ہے اور بچے کو اس سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ جدید ریسرچ نے یہ بھی ثابت کیا ہے۔"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں چونکہ بہت سے ملکوں کے بچے بچائے دُودھ کے ڈبے پہنچ رہے ہیں اس لیے آپ کی ریسرچ ایک سو سال بعد ہمارے ہاں پہنچے گی۔"

دانستہ شرارت:

جس دن سے ہم رچمنڈ آئے تھے، ناہید ہمیں یہاں آ کر بسنے والے پاکستانیوں کے رُوح فرسا اور اندوہناک قصّے سُنا رہی تھی۔ وہی داستانِ الم کہ پہلے پہل یہاں آ کر کس نے کیا کھویا کیا پایا ـــــ خودی بیچی تو کیا خریدا ـــــ؟ ان غیر ممالک میں یہ قصّے تقریباً سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ غربت کے خوف سے بھاگے ہوئے لوگوں کے ساتھ یہ ممالک سوتیلی ماں والا برتاؤ کرتے ہیں۔ جب ایک جیسی کہانیاں سُن سُن کر ہم کراہنے لگتے تو پھر ناہید ہمیں ایک نشہ آور قسم کا ڈوز دے دیتی یہ کہہ کر "میری بہت سی سہیلیاں آپ سے ملنے کی مشتاق ہیں۔ آپ کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہیں... کیوں نہ ایک دن ان کو جمع کیا جائے ـــــ"

واشنگٹن سے آنے کے بعد ہم نے سوچ رکھا تھا کہ ہم وطنوں کے قریب جانے سے پرہیز ہی کریں گے... مگر بُرا ہو اس دل کا ـــــ ناہید کی چکنی چپڑی باتوں میں آ ہی گیا۔

معاملہ محبتیں لٹانے کا ہو تو شاعر و ادیب دریا دل بن جاتے ہیں۔ ایک صرف واہ واہ کی خاطر شام سجا لینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب جلنے والے اسے جو بھی کہتے رہیں۔ دل میں خواہش ابھری کہ مداحوں کے درمیان بیٹھیں۔ کچھ جھوٹی سچّی سنیں۔ اپنی ذاتِ بدذات کو تھوڑا سا کلف لگائیں۔ امریکہ سے ہو کر جا رہے ہیں۔ زادِ راہ کچھ تو لے کر جائیں اسی وقت بخدا اسی وقت مسز مارکھنی ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ پتہ نہیں مسز مارکھنی جنات کی نانی ہیں کہ انھیں ہمارے ہر خطرناک ارادے کا علم ہو جاتا ہے،

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تنک کر بولیں :

"واشنگٹن میں جو پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی تھی کیا اس سے آپ کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا؟"

"آپ کو اس سے کیا، خواہ ہم ساری دنیا کے نقشے پر سے پاکستانیوں کو چُن چُن کر ملیں۔"

ہنس کے کہنے لگیں :

"جیری رامن سے ملی تھیں... کیسی تواضع کر رہا تھا اپنے دیس کی؟"

ہم نے کہا :

"اس بدنصیب کو جگہ بھی تو یہودیوں کے قدموں میں ملی ہے۔"

کہنے لگیں :

"یہ بھی امریکہ ہے۔ باز آجائیں اپنے ارادے سے۔"

ہم نے کہا :

"جب سے ہم امریکہ آئے ہیں، آپ ہمارے اعصاب پر سوار ہیں۔ خدا کے لیے ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

طے پایا کہ ہفتے کی شام پاکستانی دوستوں کو بلایا جائے گا۔ اور آمنے سامنے بیٹھ کے کہا اور سُنا جائے گا....

جمعہ کے روز ناہید نے ٹیلی فون کھڑکانے شروع کر دیے اور اِک اِک کو ہماری آمد کی نوید دے کر کہا کہ "کل شام ہمارے ساتھ چائے پیجیے اور نظروں کی پیاس بجھائیے۔"

ہفتے کے روز صبح ہی سے ہم بھی ناہید کے ساتھ باورچی خانے میں گھُس گئے۔ آخر مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمارے اعزاز میں اتنی بڑی پارٹی

ہو رہی تھی، ہاتھ بٹانا تو ویسے بھی واجب ہو گیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر دیسی اور ولایتی پکوان اس طرح پکائے کہ دیسی پر ولایتی کا اور ولایتی پر دیسی کا گمان ہونے لگا۔ اس بات کو ہم دونوں نے اپنی اپنی استادی اور مہارت گردانا۔

شام کے پانچ بجے ہم دونوں قرینے سے تیار ہوئیں۔ بہترین ملبوسات پہنے، نوک پلک کو سنوارا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مہمانوں کا انتظار کرنے لگیں۔

ہم نے تو کئی بار بے چینی سے نشست کو بدل کر دیکھا کہ جب امریکہ میں بسنے والے مشتاقانِ دید اندر داخل ہوں گے تو ہم کس رُخ بیٹھے ہوں کہ زیادہ سے زیادہ متاثر کر سکیں۔ ہم کئی بار مختلف صوفوں پر اُٹھتے اور بیٹھتے رہے —— شام کے چھ بج گئے —— چھ سے آٹھ اور بالآخر دس —— مگر کوئی نہیں آیا۔

ہم نے ناہید سے کہا —— "اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چلو چائے پی لیں" ——

ہم دونوں نے سجی سجائی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پی —— اپنے اپنے پکوان کو خود ہی سراہا۔ ایک دوسرے کے کپڑوں کی تعریف کی۔ حالاتِ حاضرہ پر دانش ورانہ تبصرہ فرمایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ہاں رفیق جنجوعہ صاحب، جن کے سپرد بچے کر رکھے تھے، ایک بار ہماری اس خاموش محفل کو دیکھنے آئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک طنزیہ چمک تھی۔ اس چمک کو انھوں نے کسی فقرے میں نہیں ڈھالا —— سیانے آدمی ہیں اور انھیں ہمارے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کا پردہ بھی منظور تھا۔ بس صرف مُسکرا کر اتنا پوچھا :

"کیا مہمان اتنی جلدی چلے گئے ——؟"

ہم نے چہرہ شگفتہ بنا کر کہا :

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"مہمان آئے ہی نہیں۔"

اس پر ناہید ایک دم پھٹ پڑی اور لوگوں کی مادہ پرستی پر نفرین بھیجنے لگی۔ پتہ یہ لگا کہ ہفتے کی شام صرف ذرا سی چائے پینے کے لیے لوگ اپنا پٹرول نہیں ضائع کرنا چاہتے۔ ہاں کھانے کی دعوت ہوتی تو وہ آسکتے تھے....

چنانچہ ایاز کو بھی اپنی قدر معلوم ہوگئی۔ باقی کا پورا ہفتہ ہم مسز مارکہنی سے نظریں چراتے پھرے۔ دوسرے روز ہمیں یاسیت کا ایسا دورہ پڑا کہ سارا دن کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے.... یوں بھی اتوار کا روز لوگ یہاں سو کر اور اِک دو جے میں کھو کر منانا چاہتے ہیں لیکن خلافِ معمول ناہید ہانپتی ہُوئی آئی اور ہمارا دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔

جب ہم نے دروازہ کھولا تو اکھڑی سانسوں کے درمیان بولی:

"ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں بس جلدی آجایئے۔"

حیرت کے مارے ہم بغیر مناسب تیاری کے باہر نکل آئے۔

وہ ایک ناکتخدا قسم کی خاتون تھیں۔ جس طرح تاریخ ساز کنوارے ہوتے ہیں۔

ہمیں دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

"کیسی گزر رہی ہے؟"

ہم نے کہا "الحمدللہ.... شادی سے پہلے یارحیم کہتے گزر رہی تھی۔ شادی کے بعد یارحمٰن کہتے گزر رہی ہے۔"

ہماری بات ہوا کے جھونکے کی طرح اِدھر سے اُدھر ہوگئی۔ وہ اپنی دُھن میں بولیں:

"آپ کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔" انھوں نے زور اشتیاق پر نہیں

بلکہ "دیکھنے" پر دیا۔ ہمیں یاد آگیا۔ ان کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو ناہید سے ہوچکی تھی اگر ان کی آمد کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آجاتی تو ہم بھی اس "اشتیاق" کو اپنے مداحوں کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ موصوفہ کو امریکہ آئے ہوئے سولہ سال ہوچکے تھے۔ شروع سالوں میں تو ٹھکانہ بنانے اور ڈالر جمع کرنے میں مصروف رہیں۔ اب جب عمر کے گھڑیال کی سوئی چالیس سے اوپر ہوگئی تھی، یکایک انھیں احساسِ زیاں ہونے لگا تھا۔ شکل وصورت کے لحاظ سے وہ اوائل جوانی میں بھی قابلِ توجہ نہ رہی ہوں گی۔ اب تو خیر سورج ڈھلنے کا موسم تھا۔ پھر بھی گرین کارڈ اور انگریزی کے زور پر کوئی بھولا بھالا مفلس پاکستانی درکار تھا۔ یوں وہ جانتی تھیں کہ یہ جو تازہ واردانِ بساطِ امریکہ ہوتے ہیں وہ ہر قسم کے مسائل سے بوکھلائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر نووارد کی شنید پر کسی بہانے اسے ملنے ضرور جاتیں۔ گزشتہ سال صاحب عالم آئے ہوتے تھے۔ اس ضمن میں موصوفہ کی ان سے ملاقات ہوچکی تھی۔

یہ سب ناہید کی شرارت تھی۔ وہ ان کی کمزوری سے واقف تھی۔ اس لیے فون اٹھا کر ایسی تعریفیں کر ڈالیں کہ وہ پلکوں کے بل ملنے چلی آئیں۔ ملنے کیا دیکھنے بھی آگئیں اور دیکھا بھی یوں کہ پسند کرلیا۔ ناہید نے انھیں دانستہ نہیں بتایا تھا کہ صاحبِ عالم خیر سے شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کے باپ بھی ہیں۔

اب اس کا علاج تو دنیا کے کسی چارہ گر کے پاس نہیں کہ صاحبِ عالم اپنی تمام تر شاطرانہ فسوں سازیوں اور آمرانہ کج ادائیوں کے باوجود صورت سے ایسے معصوم اور بھولے بھالے نظر آتے ہیں جیسے زمانے کی ہوا ہی نہ لگی ہو۔ اور اگر دل میں آجائے تو کسی عشوہ طراز بتِ طناز کو مزید معصوم بن کر دکھا دیتے ہیں.... دکھانا تو رہا الگ، شیشے میں بھی اتار لیتے ہیں۔ مگر اتنے بدذوق بھی نہیں کہ آں محترمہ پر وقت اور ذہانت ضائع کرتے۔ جب موصوفہ اپنا تمام تر اپنا بجھا ہُوا اسلحہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

استعمال کرنے کے باوجود ادھر کوئی شعلہ نہ بھڑکا سکیں تو پھر ناہید نے ان کی مشکل یہ کہہ کر آسان کر دی کہ

"یہ تو شادی شدہ ہیں اور اتنے عرصے سے یہ شادی کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں جتنے عرصے سے آپ عزلت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔"

چنانچہ صاحب عالم کی بے اعتنائی کا مطلب ان کی سمجھ میں آ گیا۔ پھر موصوفہ کے دل میں خواہش جاگی کہ ان صاحب کی بیوی کو دیکھا جائے جو پرائی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور عورت بھی ایسی جو TOLET کا بورڈ لٹکائے پھرتی ہو، حالانکہ تجربہ کار بزرگوں نے کہا ہے کہ شادی شدہ مرد کو اپنی بیوی کے سوا ہر عورت اچھی اور پُرکشش لگتی ہے۔

بات یہ نہ تھی صاحب عالم کو ہر بدصورت اور بیمار شے سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ موصوفہ اگر ذرا سی خوش شکل ہوتیں تو صاحب عالم ڈھیر سارا وقت ضائع کر سکتے تھے کیونکہ انگریزی بولنے والی خواتین کے وہ سات خون معاف کر سکتے ہیں۔ پر افسوس! یہاں ان کی انگریزی بھی صورت تلے دب گئی۔ اور یہی تجسس انھیں ہم تک لے آیا۔ ہمارا اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد بولیں

"آپ کے شوہر بہت اچھے ہیں ... میں ان سے مل چکی ہوں۔"

یہ پہلی خاتون تھیں بخدا جن کے مل چکنے کو ہم نے شک اور حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ اللہ کا شکر ادا کیا کہ امریکہ میں بھی انھیں جلی ہوئی مونگ پھلی ہی نصیب ہوئی۔

اس موقع پر ہم نے مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا تو انھوں نے جلدی سے وہ سوال کر ڈالا جو انھیں بے چین کیے ہوئے تھا یعنی

"آپ کی شادی کیسے ہوئی ــــ ؟"

اب وہ اپنی ناشاد حسرتوں کو کچھ اور ناشاد کرنا چاہتی تھیں اس لیے ہم نے ان کا جلا ہوا دل اور جلانا مناسب نہ سمجھا اور بس اتنا کہا

"جس طرح ہمارے ہاں شادی ہو جاتی ہے۔ کارڈ چھپتے ہیں ... زردہ پلاؤ کھاتے ہیں قاضی صاحب آتے ہیں ... اور"

"نہیں نہیں۔ میرا پوچھنے سے یہ مطلب نہیں تھا۔ کچھ آپ کی پسند ناپسند کو بھی اس میں دخل تھا یا نہیں ؟"

شاید وہ اپنے دل نا صبور کو یہ کہہ کر تسلی دینا چاہتی تھیں کہ یہ محض ایک اتفاقیہ شادی تھی۔ اتفاقیہ شادی میں ہر چند کہ معاملات مل جاتے ہیں، دل نہیں ملتے۔ دونوں کے دلوں میں ایک کمی سی رہ جاتی ہے۔ مرد اس کمی کو عام طور پر اِدھر اُدھر منہ مار کے پورا کرتا رہتا ہے۔ عورت کو منہ مارنے کی عادت نہیں ہوتی، اس لیے وہ بچوں کو مارتی رہتی ہے۔

"ارے ان کی شادی ..." ناہید بیچ میں ٹپک پڑی "ان کی شادی تو ایک قصہ ہے ... ایک فسانہ ہے ... ایک الف لیلوی داستان ہے ... اس کی روداد سننی ہو تو کسی دن رحمٰن صاحب کے منہ سے سُنیں۔ حقائق کو بیان کرنے کا جو ملکہ انھیں حاصل ہے، وہ کسی اور کو کہاں ــــ !"

یہ صریح اشارہ ہماری طرف تھا۔ خواتین اپنے معاملاتِ دل بیان کرنے میں حجاب اور بخل سے کام لیتی ہیں۔

"اچھا۔ اچھا" موصوفہ کا بجھا ہوا چہرہ اور بجھ گیا مگر اپنے آپ کو سہارا دے کر کمزور سی آواز میں بولیں :

"آپ نے انھیں پہلے دیکھا تھا یا انھوں نے آپ کو ؟"

"دراصل تقدیر دونوں کو بیک وقت تاڑ رہی تھی اور تقدیر اللہ دی نوں کون

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

موڑے....

ہم نے بات کا رُخ پلٹنے کے لیے ان کے پیشے کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے اور وہ فوراً اپنی مشکلات اور فتوحات کی کہانیاں بیان کرنے لگ گئیں....

یوں ہم اپنا آپ بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپنی رام کہانی سنانے کے بعد جیسے انھیں کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگیں :

"میں تو عرصۂ دراز سے وطن سے باہر ہُوں، بتائیے تو سہی اب تک پاکستان کس کس چیز میں خود کفیل ہوا ہے۔"

ہم نے ایک بڑا سا گھونٹ نگلا اور خود کفالت والی خود اعتمادی پیدا کر کے بولے : "شاعروں اور ادیبوں میں۔"

اے دلِ آوارہ چل :

صبح ہی صبح فخر بھابھی کا فون آ گیا۔ کہنے لگیں :

"آپ تو صرف دو دن کا کہہ کر گئی تھیں۔ وہاں آپ کا دل لگ گیا...؟"

ہم نے کہا :

"دل ہم نے ایک ہی جگہ لگایا تھا۔ اب اس کا خطرہ نہیں۔ مگر کیا کریں ناہید اور رفیق جنجوعہ ہماری کوئی فریاد نہیں سُنتے۔"

اس پر فخر بھابھی نے کہا :

"تین دن کے بعد عید ہے اور یہ عید آپ ہمارے ساتھ منائیں گی۔"

لیکن ہم نے بہت دنوں سے سوچ رکھا تھا کہ یہ عید ہم اپنی بہن کے ساتھ

منائیں گے جو ٹورانٹو میں رہتی ہیں اور جنھیں ہم نے اپنے پروگرام سے مطلع بھی کر دیا تھا۔ ہم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو فخر بھابھی کچھ برہم، کچھ شاکی ہوئیں۔

جوں جوں عید قریب آ رہی تھی، ہم پر قنوطیت کے بادل چھا رہے تھے بچوں سے اور گھر سے دور یہ ہماری پہلی عید تھی۔ اگر ہم اپنی بہن اور اس کے بچوں کے پاس نہ جاتے تو غالباً جس گھر میں ہوتے سب گھر والوں کو کبیدہ خاطر کر دیتے۔

ہم نے یہ ساری باتیں فخر بھابھی کے گوش گزار کیں۔ وہ ہماری مجبوری کو سمجھ گئیں۔

"آپ نے ٹورانٹو جانا ہو تو واشنگٹن سے ہو کر جائیے۔"

ہم نے کہا :

"منظور ہے، اس شرط پر کہ آپ ہمیں کل ہی کینیڈا کا ویزا لگوا دیں گی۔"

وہ بولیں :

"ہم ضرور کوشش کریں گے۔"

"تو ہم آج ہی واشنگٹن پہنچ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر ہم نے فون بند کر دیا۔

پاکستان سے کینیڈا کا ویزا نہیں لگوا سکے تھے۔ ساری تیاری تین دن میں ہُوئی تھی۔ یہی ارادہ تھا کہ امریکہ سے کینیڈا کا ویزا لگوا لیں گے۔ مگر اب دل میں ڈر بھی رہے تھے کہ اگر کل ویزا نہ مل سکا تو کس طرح عید پر اپنی بہن کے یہاں پہنچ سکیں گے۔

بہر حال اسی دوپہر ہم واشنگٹن کے لیے روانہ ہو گئے۔

"مَیں تھاں مرجانی آں...!"

رات کو واشنگٹن پہنچ گئے۔ گپ شپ لگانے کے بعد آرام کیا اور دوسرے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دن ناشتے کے بعد ہم فخر بھابھی کے ساتھ کینیڈا کے سفارت خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

"یہ لوگ کتنے چکر لگواتے ہیں؟"

"کینیڈا کے سفارت خانے کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں، مگر یہاں کام گھنٹوں میں ہوتے ہیں دنوں میں نہیں۔"

ہم نے کہا:

"ہماری صورت کو غور سے دیکھیے۔ کیا ہم قابلِ اعتبار نظر آتے ہیں؟"

اس پر فخر بھابھی نے ہماری صورت دیکھنے کی بجائے سامنے سڑک پر دیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ موٹر بھی وہ چلا رہی تھیں اور ہمارا دل بھی رکھنا چاہتی تھیں۔

ہمیں سفارت خانوں کے اندر جاتے ہوئے بہت ڈر لگتا ہے۔

سنا ہے یہاں سائلوں کو دھتکارنے کا عام رواج ہے اور جس قسم کے قصے ہم نے سن رکھے تھے، وہ ہمارے رونگٹے کھڑے کرنے کو کافی تھے... تاہم.... بیرونی ملکوں میں سفر کے دوران خوف کی ایسی کئی ندیاں پار کرنی پڑتی ہیں نو بجے ہم سفارت خانے میں پہنچ گئے۔ اور جب "صاحب" کے روبرو ہماری پیشی ہوئی تو ہماری جان ہوا ہوئی جا رہی تھی۔

"صاحب" مسکراتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم نے ہکلاتے ہکلاتے مدعا بیان کیا اور جس طرح پہلی جماعت کا بچہ اپنے ہوم ورک کی کاپی پیش کرتا ہے، اس طرح اپنا پاسپورٹ اور اس کے ساتھ ضروری کاغذات ان کی طرف بڑھائے۔

انھوں نے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات پر بس سرسری نظر ڈالی اور پھر

اپنی گہری گہری نظریں ہمارے چہرے پر گاڑ دیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک غیر محسوس دھار تھی مگر ان کی آنکھیں تلوار کی طرح تھیں۔

نرم نرم لہجے میں بولے۔

"آپ پہلی مرتبہ کینیڈا جا رہی ہیں؟"

عرض کیا۔

"جی ہاں۔"

پھر پوچھا۔

"وہاں پر کہاں قیام ہوگا؟"

عرض کیا۔

"ہماری سگی بہن ٹورانٹو میں رہتی ہیں، ان کے ہاں قیام ہوگا۔"

پوچھنے لگے۔

"اندازاً کتنا عرصہ قیام کریں گی؟"

ہم نے لرزتے ہوئے کہا۔

"جتنے عرصے کا آپ ودانہ ہوگا۔"

بولے۔

"آپ لوگ گول مول سی بات کیوں کرتے ہیں۔ حتمی بات کیجیے نا؟ یہی بتائیں آپ وہاں کتنا عرصہ رہنا چاہتی ہیں؟"

ہم نے پھر ڈرتے ڈرتے کہا....

"دو ہفتے کم از کم ——"

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیے اور کہنے لگے۔

"آپ اپنی سگی بہن کے پاس جا رہی ہیں اور پہلی مرتبہ جا رہی ہیں،

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایک مہینہ تو ان کے پاس رہیے"

ہمارا سر چکرایا اور ہم نے بے ہوش ہونے سے پہلے ان کی طرف دیکھا، وہاں خلوص کا اجالا تھا۔

"تو پھر جناب عالی ایک مہینے کا ویزا دے دیجیے..." ہم نے اپنی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ ہم نے پاسپورٹ اور کاغذات کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"یہ بھی دیکھ لیجیے۔"

انھوں نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ یہ بتائیں... آپ کب جانا چاہتی ہیں؟"

ہم نے بے تابی سے کہا۔

"کل ہی جناب... اگر ہو سکے تو کل ہی حضور...."

ہنس دیے اور بولے۔

"آج شام چار بجے آپ کو ویزا مل جائے گا... آ کر پاسپورٹ لے جائیے گا..."

شکر یہ ہمارے ہونٹوں پر تھرکتا رہ گیا اور وہ چل دیے۔

باہر نکل کر ہم نے فخر بھابھی سے کہا۔

"ہمارے ہاتھ پر چٹکی کاٹیے تاکہ ہمیں اپنی بصارت اور سماعت پر یقین آجائے۔ بھلا اتنی جلدی کہیں ویزا لگ جاتا ہے.... دو چار چکر نہ لگوائیں تو سفارت خانوں کا وقار مجروح ہو جاتا ہے... یہاں جان نہ پہچان... فقط

ایک میٹھی مسکان....

فخر بھابھی نے کہا۔

"آپ کو آم کھانے سے غرض یا پیڑ گننے سے ـــــ چلیے آپ کو واشنگٹن ڈی۔ سی کے بڑے بڑے شاپنگ سنٹر دکھلاؤں... پھر وہیں کسی ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھائیں گے..."

جب ہم ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھنے لگے تو وہ بولیں۔

"اگر ہم گھر چلے گئے تو چار بجے تک یہاں نہ پہنچ سکیں گے۔ بہتر ہے کہ یہیں گھومتے رہیں اور پاسپورٹ لے کر ہی گھر جائیں۔ اسی صورت میں آپ کل روانہ ہو سکتی ہیں۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں

مگر بے یقینی نے ہمیں کہیں چین نہ لینے دیا۔ نہ تو ہم کچھ خرید سکے اور نہ یکسوئی سے کھانا کھا سکے۔ بس یہی فکر ستائے جا رہا تھا کہ کہیں انھوں نے ہمیں ٹالا نہ ہو....

اسی اُدھیڑ بُن میں ہم ٹھیک ساڑھے تین بجے کینیڈا کے سفارت خانے میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر بھی یہی خیال تھا کہ دو چار گھنٹے تو یہ لوگ ضرور بٹھائیں گے ـــــ اندر داخل ہوئے تو سامنے کوئی بھی نظر نہیں آیا.... اس وقت دل میں وسوسوں کا طوفان اُٹھا۔

"دیکھا یہ چابکدست لوگ ہمارا پاسپورٹ بغل میں دبا کے.... دفتر بند کر کے چلے گئے ہیں۔ آخر انھیں کیا پڑی ہے کہ ہماری مجبوریوں پر نظر رکھیں۔ کم از کم ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا جوتے گھسانے میں ـــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عید الفطر کی جگہ ہم اپنی بہن کے ساتھ عید الاضحیٰ ہی منا سکیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

خیر اب پاسپورٹ تو پھنسا ہی بیٹھے ہیں۔ سب سہنا پڑے گا . . . "

اسی وقت در و دیوار کے اندر سے ایک آواز نکلی۔

"کیا آپ پاسپورٹ لینے آئی ہیں ؟"

ہمیں ایک جھرجھری آئی اور ہم نے سہمے ہُوئے اندر میں چاروں طرف دیکھا ——— نہ کوئی آدم نہ آدم زاد ——— دیواریں ساکت ——— اور چکنے فرش سُن، جیسے ان پر کسی نے قدم نہ رکھا ہو۔ پتہ نہیں یہ آواز کہاں سے آرہی تھی۔ ایک تو ان کی بلند و بالا عمارتیں دیکھ کر ویسے ہی جی ہولانے لگتا ہے جیسے اُچک کر آسمان کو ہاتھ لگانا چاہتی ہوں۔ اس پر پسینہ چھڑا دینے والی آواز ———

نہ ہاں کہہ سکتے تھے نہ انکار کر سکتے تھے ——— نہ آگے بڑھ سکتے تھے ——— نہ پیچھے جا سکتے تھے ——— ہال کے وسط میں کھڑے پتھر ہوا چاہتے تھے کہ دوبارہ وہی آواز آئی :

"اگر آپ پاسپورٹ لینے آئی ہیں تو دائیں طرف کمرے میں تشریف لے جائیے۔"

جیسے کوئی کسی جادوگر کے زیرِ تحت حرکت کرتا ہے، اسی طرح رینگتے ہوئے ہم دائیں طرف کو مڑے۔ سامنے واقعی ایک کمرہ تھا۔ جلدی سے اس کی طرف بڑھے۔

اور سوچ رہے تھے۔ ہم جیسے غریب الوطن غریبوں کو پھنسانے کی ایک خوبصورت چال ہے تاکہ پھر اُدھر کا رُخ نہ کریں... ایسے لگ رہا تھا جونہی ہم دروازے کے اندر قدم رکھیں گے، چاروں طرف سے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونا شروع ہو جائیں گی اور پھر بھیانک قہقہوں کا ایک طوفان آجائے گا

اس لیے دائیں دروازے کے اندر قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح اِدھر اُدھر، اُوپر نیچے دیکھتے جا رہے تھے۔ اس وقت اچانک ہمیں بیا ہی ٹائل شیشے کی دیوار کے پیچھے بیٹھا ہُوا گورا نظر آگیا۔ اس کے سامنے مائیکروفون نصب تھا۔ باہر سے آنے والوں کو وہ نظر نہیں آتا تھا، مگر ہر آنے جانے والے پر نظر رکھے ہُوئے تھا اور وہیں سے ہدایات جاری کر رہا تھا۔

یہ سب دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی اور ہم کمرے میں داخل ہو گئے صبح جب ہم آئے تھے تو یہاں عملے کے بے شمار لوگ تھے۔ اب شاید عملہ بدل گیا تھا یا اس وقت کم لوگ ڈیوٹی پر تھے۔ کیونکہ ہدایات تمام دیوار کے پیچھے سے آرہی تھیں۔

کمرے میں پہنچ کر ہمیں کچھ تسلی ہوئی کہ وہاں ہم جیسے دو چار سائل بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی بیٹھ گئے۔ پھر حسبِ عادت سوچنے لگے کہ کیا پتہ یہاں اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے ہی عمر عزیز گزر جائے... جس جگہ نہ کوئی آہٹ ہو نہ سنسناہٹ اس جگہ سے کوئی امید وابستہ کیسے کریں ——— ؟

ایک دم اللہ دین کے جن کی طرح ایک صاحب نمودار ہوئے۔ انھوں نے ایک خاتون کا نام پکارا۔ خاتون کھڑی ہو گئی۔

پوچھا "آپ کو ساڑھے تین بجے کا وقت دیا تھا ؟"

بولی "جی ہاں"۔

وہ بولے "اندر آکر پاسپورٹ لے جائیے"۔ پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئے...

خاتون اندر گئی، پاسپورٹ لائی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ جو امیدوار سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے، غالباً سب مراقبے میں تھے۔ کوئی بات نہیں کر رہا تھا...

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کوئی مسکرا نہیں رہا تھا... عجیب لوگ ہیں یہ.... ہم نے دل میں سوچا....
اتنا فالتو وقت ملا ہے مگر باتوں میں نہیں گنوا رہے۔

اس سناٹے میں دیوار پر لگے کلاک کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی۔ جس وقت ٹھیک پونے چار ہوئے تو وہی صاحب پھر نمودار ہوئے۔ ایک نام پکارا اور ان سے پوچھا:

"آپ کو کون سا وقت دیا تھا؟"

"انھوں نے کہا" پونے چار بجے"

کہنے لگے "آکر اپنا پاسپورٹ لے جائیے اور پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئے۔

پھر وہی جان لیوا خاموشی چھا گئی۔ ہمارا دل گھبرا رہا تھا اور ہمیں یقین تھا یہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو غریب رشتہ داروں کے ساتھ کیا جاتا ہے ——— بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر سامنے لگی ہوئی گھڑی کو دیکھتے تھے اور ہاتھوں میں آیا پسینہ پونچھتے تھے ——— ہر بار نظریں گھڑی کی لمبی سوئی کا تعاقب کرتی تھیں... ٹک ٹک.... ایک ایک منٹ گزر رہا تھا... اور ہمارا دل ڈوب رہا تھا ——— چار تو بج ہی جائیں گے۔ پتہ نہیں یہ ہمیں بلائیں گے یا نہیں

ٹھیک چار بجے۔ نہ ایک سیکنڈ کم نہ زیادہ ——— وہی صاحب نمودار ہوئے جنھیں ہم اپنا پاسپورٹ تھما گئے تھے۔ وہی چمکتی چبھتی تیز آنکھیں وہی نرم نرم مسکراہٹ... بہت ہولے سے.... بہت دھیرے سے.. انھوں نے ہجے کر کے ہمارا نام پکارا....

ہائے ———

جدوں ہولی جئی لیندا اے میرا ناں
میں تھاں مرجانی آں.....

ہم ان کے پیچھے بوکھلائے ہوئے اسی صبح والے کمرے میں داخل ہوئے، پاسپورٹ لیا۔ ٹوٹا پھوٹا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہماری لکنت کو نظر انداز کر کے دوڑے گئے اور بہت سی ضخیم کتابیں، کتابچے، نقشے اور کارڈ اٹھا لائے۔ ہمارے سامنے رکھ کے بولے:

"کینیڈا کے سفر میں یہ کتابیں آپ کی رہنمائی کریں گی... ان کا مطالعہ کرنے سے کینیڈا کو دیکھنے اور سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ کینیڈا ایک خوبصورت ملک ہے ہماری خواہش ہے کہ آپ اس کی خوب صورتی سے محظوظ ہوں"

ہم نے چند ایک کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا.... با تصویر کینیڈا.....
معلومات... تاریخ... جغرافیہ... علم... علم...

ہم نے محجوب سا اور مشکور سا چہرہ اوپر اٹھایا تو آنکھوں میں مسکراہٹ بھر کے بولے:

ہمیں امید ہے آپ کا کینیڈا کا تفریحی سفر انتہائی خوش گوار اور یادگار ہو گا اور آپ آئندہ سال بھی آنے کی زحمت فرمائیں گی"

اور ظالم کی اولاد! یہ کیا کہہ دیا تم نے ———
جانے کے قابل ہوں گے تو دوبارہ آسکیں گے

گلوں میں خار ہوتے ہیں

ہم نے ٹرانٹو جانے کے لیے ایئر امریکہ سے سیٹ بک کروائی اور سامان

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پیک کرنے لگے۔ واشنگٹن سے کوئی فلائٹ سیدھی ٹرانٹو نہیں جاتی تھی۔ یہ فلائٹ بھی نیویارک سے ہاتھ ملائے بغیر آگے نہیں جا سکتی تھی۔ اسی خاطر رات بھر فخر بھابھی ہمیں اپنی ہدایات سے نواز کر اور بھی بوجھل کرتی رہیں کیونکہ ٹرانٹو تک کا سفر پھر تنہا طے کرنا تھا اسی وقت فخر بھابھی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ٹرانٹو سے کوئی فلائٹ ڈائریکٹ پاکستان نہیں جاتی، زیادہ تر مسافر نیویارک کے رستے روانہ ہوتے ہیں اور نیویارک شہر آفت کا پرکالا ہے، اس لیے آپ اس رستے سے ہرگز اپنی بکنگ نہ کروائیں، واپسی پر واشنگٹن سے ہو کر جائیں۔ وغیرہ وغیرہ....

اب ہم فخر بھابھی کو کیا بتاتے کہ ہم بے شک امریکہ میں بیٹھے ہیں مگر ہماری ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے ——— ہماری زندگی کے تمام فیصلے گارڈن ٹاؤن لاہور کے ہیڈ کوارٹر سے صادر کیے جاتے ہیں۔ وہاں سے اگر حکم آگیا کہ اپنے زورِ بازو سے اُڑ کر آجاؤ تو ہمیں آزمائے ہوئے بازو آزمانے پڑیں گے۔

تاہم ہم نے ان سے وعدہ کر لیا کہ واپسی پر واشنگٹن ضرور آئیں گے اور یہیں سے صاحبِ عالم کو فون کر کے آگے کے معاملات طے کر لیں گے۔

دوسری صبح ہم اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھائے واشنگٹن کے نیشنل ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ ابھی حواس باختہ کھڑے اپنی چوکی ڈھونڈھ رہے تھے کہ ایک دم مسز بار کہیں سے نکل آئیں اور ہماری کہنی تھام کر بولیں :

"چپکے چپکے امریکہ سے بھاگی جا رہی تھیں...؟"

"نہیں تو ———" ہم نے ہکلاتے ہوئے کہا "ایک مرتبہ پھر آنے کا ارادہ ہے۔"

"آپ لوگوں کے ارادوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں... آپ لوگوں کو تو کبھی ارادہ باندھنا ہی نہیں آیا ——— تھالی کے بینگن ہیں آپ لوگ ———

جس نے چمکارا ادھر لڑھک گئے۔"

"ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اور ہم نے سنا ہے، جو لوگ امریکہ آتے ہیں جانے کا نام نہیں لیتے۔ یہیں چپک جاتے ہیں... مگر قسم لے لیجیے۔ ہم عمر بھر یہاں رہنے نہیں آئے تھے۔"

"ہم کونسا آپ کو روکنے کے خواہش مند ہیں اور جن کو روک رکھا ہے وہ کونسا ہماری بگڑی بنا رہے ہیں..."

"تو پھر آپ نے یوں سرِ راہ ہمارا بازو کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

انھوں نے ہماری کہنی چھوڑ دی اور کہنے لگیں :

"آپ کی ناقدری تو آپ کے ہموطنوں نے کی ہے۔ ہمیں کم از کم اتنا تو بتاتی جائیں کہ آپ کو امریکہ کیسا لگا ——— ؟"

ہم نے کہا "سچی بات بتائیں کہ مسکا لگائیں؟"

بولیں "سچ بولنے کی جرأت ہے تو اس کا اظہار کیجیے۔"

ہم شروع ہو گئے :-

Q آپ کی خوبی ہی آپ کی سب سے بڑی خرابی ہے یعنی آسائشوں اور عیش و عشرت کی فراوانی ———

(افسوس جس کی اندھی تقلید میں ہماری نئی نسل دیوانی ہو رہی ہے)

عیش و عشرت کی فراوانی اور ضروریات کی افراط جنسی بے راہ روی کو جنم دیتی ہے۔ لوگ چھ دن جان توڑ کر محنت کرتے ہیں۔ اچھی خاصی رقم کما لیتے ہیں اور پھر دو دن دل کھول کر عیاشی کرتے ہیں اور ساری رقم اُڑا دیتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر ہے ؏

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

○ اخلاقی قدریں تو پہلے بھی آپ کے پاس نہیں تھیں مگر آپ کی نئی نسلیں تو اخلاقی طور پر بالکل دیوالیہ ہیں۔ آپ کے ہاں چالیس فیصد بچے غیر قانونی ہوتے ہیں جن کی کفالت حکومت کرتی ہے اور یہ بچے زیادہ تر تیرہ سال سے لے کر اٹھارہ سال تک کی لڑکیوں کے ہاں جنم لیتے ہیں۔ ان میں اکثریت حبشی لڑکیوں کی ہوتی ہے ——— یعنی سیاہ و سفید مل کر سیاہ و سفید میں مگن ہیں۔ محبت کو آپ نے مادر پدر آزاد کر دیا ہے

○ آپ کے ہاں فیشن اتنی جلدی نہیں بدلتے جتنی جلدی اخلاقی قدریں بدل جاتی ہیں۔ پرسوں ہی ہمیں ایک محفل میں ایک ضعیف و کرم خوردہ گوری ملی تھی۔ وہ ہر مہمان کے پاس جا کر فریاد کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی :

" دیکھیں تو میری سوزی کتنی احمق ہے۔ اس نے اچانک ایک ایسے آدمی سے شادی کر لی ہے جس کے ساتھ ایک رات بھی نہیں گزاری.... جنسی تجربے کے بغیر شادی کر لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جلد ہی یہ بے وقوف لڑکی پچھتائے گی... "

" اس کا کیا مطلب ہے ؟ " ہم نے ایک معزز خاتون کے کان میں پوچھا

وہ بولی " یہ عورت بھی عجیب ہے۔ دو سال پہلے اس کی بڑی لڑکی اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتی تھی اور یہ عورت ہر روز اسے لعنت ملامت بھری چٹھیاں لکھا کرتی تھی اور ساتھ ہی کہتی تھی شادی سے پہلے میاں بیوی بن کر رہنا ناکامی کا سبب ہوتا ہے۔ آج اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے اس کے خیالات بدل گئے ہیں "

○ کل جب ہم بازار میں گھوم رہے تھے تو ایک خوش پوش سی معمر سی گوری سے ملاقات ہو گئی... اس کے ساتھ ایک لونڈا تھا ——— ہماری نگاہ بار بار اس عجیب جوڑی کی طرف اُٹھ جاتی... اس نے ہماری نگاہ کے شک کو پڑھ لیا ———

لونڈے کا ہاتھ پکڑ کر قریب آ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی " ان سے ملیئے ہی از مائی سن اِن لا HE IS MY SIN-IN-LAW پھر آنکھ مار کر گویا ہوئی :

" میری بیٹی اس خوبرو نوجوان کے ساتھ رہتی ہے۔ اُمید ہے۔ کچھ دنوں تک یہ میرا داماد یعنی SON-IN-LAW بن جائے گا "۔

○ آپ کا ملک غریبوں اور ضعیفوں کے لیے نہیں ہے۔ بڈھوں اور مفلوک الحال لوگوں کو چُن چُن کر نکال دیجیے... لوگ یہاں بڑھاپے سے خوف زدہ رہتے ہیں... ویسے تو بڑھاپا ہے ہی بڑا اندوہناک مگر یہاں انھیں زندہ گھروں سے نکال کر سرد " کہولت خانوں " میں رکھا جاتا ہے۔ وہاں وہ زندگی سے زندگی کی دلچسپیوں سے عزیز و اقارب سے دور چلے جاتے ہیں... گویا انھیں موت کا انتظار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے ان کی جان جاتی ہے کئی جگہ ہم نے دیکھا کہ ضعیف و ناتواں خواتین مصنوعی دانت لگا کے، شوخ و شنگ کپڑے پہن کے، میک اپ سے چہرہ مزین کر کے چست و توانا نظر آنے کی کوشش کرتی ہیں بلکہ دمِ آخر تک ملازمت کو نبھانے کی کوشش کرتی ہیں.... یہی حال بڈھوں کا بھی ہے ——— آپ نے طبّی

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

ایجادات سے عمروں کو بڑھا دیا ہے۔ اب آپ کوئی ایسی گولی ایجاد نہیں کر سکتے جو انسانوں کو ایک خاص عمر سے آگے بڑھنے ہی نہ دے۔

○ آپ کی نئی نسل نے خوش حالی میں آنکھ کھولی ہے۔ انھیں ہر طرف ہر شے کی زیادتی نظر آئی ہے، اس لیے آپ کی نئی نسل عیش پسند، کاہل اور کام چور بنتی جا رہی ہے.... اسے بھی کچھ سکھائیں نا ــــــ؟"

"اچھا ــــــ" مسز مارکہنی ایک دم چمک کر بولیں "آپ کی نئی نسل نے تو خوشحالی میں آنکھ نہیں کھولی ــــــ آپ نے تو اپنی نئی نسل کو کھانے اور اوڑھنے کو وافر نہیں دیا ــــــ آپ تو ابھی تک اناج بھی مانگ مانگ کر کھاتے ہیں ــــــ آپ کی نئی نسل عیش طلب، کاہل اور کام چور کیوں ہے ــــــ؟"

مسز مارکہنی کی اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا ــــــ

ہم نے کہا:

"پلیز اب ہمیں جانے دیں ... ہمارا جہاز نہ چھوٹ جائے۔"

انھوں نے کہا "آپ بڑے تنگ دل ہیں۔ آپ کی نظر صرف برائیوں پر ہوتی ہے۔"

ہم نے کہا:

"نہیں۔ پہلے پہل تو ہمیں دوسروں کی اچھائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ مگر جب ان کا موازنہ اپنے ساتھ کرتے ہیں تو مارے حسد کے سُکڑ جاتے ہیں لیکن اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں جائیں گی، نیشنل ایئرپورٹ پر ہی ہمیں خدا حافظ کہہ دیں گی تو پھر ہم ایمان داری سے اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔"

انھوں نے کہا۔ "منظور ہے۔"

ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور کہنا شروع کیا:

○ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ لوگ محنتی ہیں۔ مشقت پسند ہیں۔ مہم جو ہیں۔ کسی کام کو معیوب نہیں سمجھتے۔ جہاں پر بھی کام کر رہے ہوں، انتہائی دلجمعی اور دیانت داری سے کام کرتے ہیں۔

○ آپ کی زندگی ڈسپلن کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ ڈسپلن کا مظاہرہ پیدائش سے لے کر مرگ تک کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں تنظیم اور تلقین نظر آتی ہے۔ ریستوران، تفریحی مقامات، کھیل کے میدان، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، ریلوے سٹیشن، ہوائی اڈے، بازار ــــــ ہر جگہ تنظیم کارفرما ہے۔ شاید آپ لوگ پیدا ہوتے ہی بچوں کو ڈسپلن کی گھٹی پلا دیتے ہیں

○ بچے والدین پر اپنا غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالتے۔ اٹھارہ سال کے ہوتے ہی اپنا بوجھ خود اٹھا لیتے ہیں

○ سادگی آپ کی زندگیوں کا خاصہ ہے۔ لباس میں سادگی، خوراک میں سادگی، آداب اور رہن سہن میں سادگی!

○ اپنے ملک اور اپنی زمین کے ساتھ آپ لوگ دیانت دار ہیں۔ اس لیے یہاں سب قانون اور زمین کا احترام کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں قانون کی بالادستی ہے۔ اس لیے کوئی قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

نہیں کرتا۔ اعتماد اور یقین کا سبق سکھایا جاتا ہے یہاں ـــــ مثال کے طور پر ـــــ ایک دن ہم نے ایسی جگہ کار پارک کر دی جہاں خودکار میٹر سسٹم خراب تھا۔ سکہ اندر ڈالتے تو وہ باہر نکل آتا۔ ہم ہراساں اور پریشاں کھڑے تھے کہ سامنے والے دفتر سے ایک خاتون نمودار ہوئی۔ ہم نے اپنی پریشانی بیان کی تو بولی :

"گھبرائیے نہیں ... کار یہیں کھڑی رہنے دیں۔ بس ایک چٹ لکھ کر میٹر پر چپکا دیں کہ" یہ میٹر خراب ہے اس لیے ہم نے پیسے نہیں ڈالے"۔ پولیس افسر یہاں پر آپ کا انتظار کرے گا ـــــ"

وہی ہوا۔ ہم ایک گھنٹے بعد واپس آئے تو پولیس افسر ہماری کار کے نزدیک ہمارا منتظر تھا۔

○ دیانت داری اور بھروسے کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے سٹور کھلے رہتے ہیں اور لوگ چوری نہیں کرتے۔ سزا کے خوف کے علاوہ ایک اور خیال محلِ نظر ہوتا ہے۔ اگر چوری کرنے کی وجہ سے سٹور دیوالیہ ہو گیا تو وہ سب چیزوں کی قیمتیں بڑھا کر گاہکوں کی جیب سے نقصان پورا کریں گے۔ یوں بھی نقصان اپنا ہی ہو گا۔

چوتھا پڑاؤ

کینیڈا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کنیڈا کوچ !

اس بار ہمیں گیٹ نمبر دس کو ڈھونڈنا تھا۔ دس نمبر ہماری فطرت سے تو نہیں، ہمارے ستاروں سے ضرور میل کھاتا ہے۔ اس لیے اس نمبر کو تائیدِ غیبی جانا اور دروازہ دروازہ تلاش کرنا شروع کر دیا ——— جس وقت گیٹ نمبر دس کے ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی مچھلی بازار میں آ گئے ہوں.... پسماندہ قومیں تو بیچاری یونہی بدنام ہیں۔ یہاں زیادہ امریکن گورے اور گوریاں تھیں۔ لاؤنج لبالب بھرا ہوا تھا۔ سیٹوں پر تو جو بیٹھے تھے سو بیٹھے تھے، اس سے دُگنے کھڑے ہوئے تھے اور ہر مرد و زن اپنی آواز کی فل ولیوم پر گفتگو کر رہا تھا۔ دو ٹیلی فون بوتھ تھے۔ دونوں کے ساتھ دو نرم نرم گوریاں چمٹی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں وقتِ سفر کس قسم کی ہدایات دے رہی تھیں یا شکایات کر رہی تھیں۔ ان سب مسافروں میں ہمارا حلیہ اور ہماری صورت جُدا تھی۔ ہم تنہا سفر کر رہے ہوں تو ہمارے چہرے پر ہوائیاں اڑتی رہتی ہیں۔ لاؤنج میں ہم اپنی عادت سے مجبور ہو کر بہت پہلے آ گئے تھے، اس لیے بہت سوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا تھا.... کھڑے تھے اور ٹک ٹک ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے

تھے۔ مائیکروفون پر کوئی بھی اعلان ہوتا، کان ادھر لگا دیتے.... ذرا ذرا دیر بعد دل دھڑکتا اور یہ وہم ہوتا کہ آج ہم کسی غلط جہاز پر سوار ہو جائیں گے۔

لیکن تمام وسوسوں کے باوجود ہم صحیح جہاز پر سوار ہو گئے۔ ایئر امریکہ کے اس جہاز میں سیٹوں کے نمبر نہیں تھے اور ایک ہی کلاس تھی۔ انسانوں کا ایک ریلا اندر آیا اور جہاں جی چاہا سما گیا۔ دو ایئر ہوسٹسیں بھی تھیں مگر وہ دور کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ہم بھی ایک خالی سیٹ کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی ساتھ دل میں دُعا بھی کرتے رہے کہ اس سفر میں کوئی معقول ہمسفر نصیب ہو جائے۔

جب بیٹھ چکے۔ دم لے چکے۔ جہاز پرواز کر چکا تو اطمینان کا سانس لیا۔ اس بار ہمارے ساتھ ایک نوجوان نازک سی گوری آ کر بیٹھی تھی۔ اس عمر میں تھی جس عمر میں محبوب کے خط کے سوا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اسی لیے اپنے سفری تھیلے میں سے ایک لفافہ نکالتی۔ اس میں تہہ کیا ہوا چھ صفحوں کا خط نکالتی۔ اسے پڑھتی.... اور دھیمے دھیمے مسکراتی، لجاتی، پلکیں جھپکاتی۔ پھر بیر بہوٹی بن جاتی اور خط دوبارہ لفافے میں رکھ کے لفافے کو تھیلے میں ڈال دیتی.... جب اس نے تیسری بار خط نکال کر پڑھا تو ہمیں بہت تکلیف ہوئی۔ ہم نے کن اکھیوں سے زرد صفحوں والا خط پڑھنے کی کوشش کی۔ ذرا سی "نظیر" لگاتے تو غالباً پڑھ بھی لیتے۔ اُسی وقت مشروبات کی تقسیم شروع ہو گئی۔ معشوقہ نے خط مٹھی میں دبا لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ اس کے چہرے پر وصل کا اُجالا تھا۔ ہمارا دل چاہا ہم اس سے کہیں "... یہ عاشق سارے بدذات ہوتے ہیں۔ مشرق کے ہوں یا مغرب کے۔ شمال کے ہوں یا جنوب کے شادی سے پہلے آسمان سے ستارے توڑ توڑ کر قدموں میں لا بچھاتے ہیں۔ الفاظ کے محل کھڑے کر دیتے ہیں اور جذبوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں.....

اس طرح مست کرتے ہیں کہ لڑکی سے اس کا اپنا آپ چھین لیتے ہیں... بچو! تمھاری آنکھ اس وقت کھُلے گی جب خدانخواستہ اس سے شادی ہو گئی۔ شادی کے ٹھیک تیسرے دن ان کی نزدیک کی نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ ہر سامنے سے نظر آنے والی خاتون زیادہ خوب صورت، زیادہ ذہین اور زیادہ سمارٹ نظر آتی ہے۔" اپنا جوس کا گلاس ختم کرنے کے بعد وہ چوتھی بار لفافہ کھول کر پڑھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ ہم بالکل برداشت نہ کر سکے اور پوچھ ہی لیا کہ:

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

حالانکہ اس جہاز نے ایک گھنٹہ نیویارک رُک کر سیدھا ٹرانٹو جانا تھا۔ مگر پوچھنے میں کیا حرج تھا۔ ممکن ہے وہ شوقیہ ہی چکر لگانے کے لیے جہاز میں آ بیٹھی ہو۔

وہ بولی "میں ٹرانٹو جا رہی ہوں۔"

بس.... پھر ہم نے سوچا۔ اس کے ساتھ چپک جائیں۔ پار کرا دے گی۔

اس نے مزید بتایا کہ وہ دوسری بار ٹرانٹو جا رہی ہے۔ پھر جب ہم نے بڑی مشاقی سے گفتگو کو آگے بڑھایا تو اس نے اپنا مکمل تعارف کرا دیا۔ اس کا نام کیتھرائن کلائیو تھا۔ برطانیہ سے آ رہی تھی۔ ساؤتھ ہال کے ایک سکول میں اُستانی تھی۔ ہر سال چھٹیوں میں سفر کرنا اس کی ہابی تھی۔

"ٹرانٹو میں آپ کا کون رہتا ہے؟"

ہم نے پوچھا۔

بولی "کوئی نہیں۔ ہم بہت سی لڑکیوں نے مل کر ایک جگہ رہنے کا بندوبست کیا ہے۔ وہ تمام لڑکیاں وہیں ہیں۔ میں چند دنوں کے لیے امریکہ آ گئی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تھی۔ اب واپس جا رہی ہوں۔"

اب ہم چونکہ خط کا بھید جاننا چاہتے تھے۔ اس لیے معصوم سی شکل بنا کر پوچھا:

"کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

ہنس کر بولی۔

"نہیں ____"

پوچھا "منگنی ہو چکی ہے یعنی کسی کو پھانس چکی ہیں؟"

اس پر وہ ایسے مسکرائی کہ چاروں طرف پھولوں کی بارش ہونے لگی ہو۔ جلدی سے مٹھی کھول کے ہمیں زرد لمبا لفافہ دکھایا اور کہنے لگی "دیکھو یہ میرے بوائے فرینڈ کا خط ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں ابھی وہ اپنے کیریئر کا آغاز نہیں کر سکا' اس لیے شادی نہیں کر سکتے....

(جی ہاں ضرورت بھی کیا ہے فی الحال..... ہم نے دل ہی دل میں کہا)

مگر وہ مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔ پچھلے ایک مہینے سے میں امریکہ کے دورے پر ہوں اور وہ ہر روز بلاناغہ مجھے ایک خط لکھتا ہے۔ پرسوں اس کا خط نہیں آیا تھا تو میری جان نکلی جا رہی تھی۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ تھوڑا سا پتہ غلط تھا۔ کل دونوں خط ایک ساتھ مل گئے تو مجھے چین آ گیا..."

ہائے ہائے۔ ہم نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر کر سوچا.....

ان مردوں کا طریقۂ واردات ایک ہی ہوتا ہے۔ ہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور سالوں پیچھے لوٹ گئے۔ ایسے خط لکھتے ہیں جیسے محبوب کا چہرہ نہ دیکھا تو دل ڈوب جائے گا.... ہر روز اس طرح ایک معطر معطر لفافہ گود میں آ گرتا ہے جس طرح زنجیر ہلانا سائل کی عادت ہو۔ کس کس طرح گھائل کرتے

ہیں....

کیا کیا روپ نہیں اختیار کرتے.... کس کس طرح مجبور نہیں کرتے.... مگر صرف شادی ہونے تک.....!

پھر وہ چہک کر بولی۔

"میں نے اپنے محبوب کے لیے امریکہ سے ایک تحفہ بھی خریدا ہے دکھاؤں آپ کو؟"

ہم نے حامی بھری تو اس نے کپڑے کے تھیلے میں ہاتھ ڈال کے سب کچھ باہر نکالنا شروع کر دیا۔ فلالین کی دو قمیضیں اور ایک پرفیوم ہماری طرف بڑھا کر بولی "یہ اس کے لیے ہے ____"

ہم نے اس کی خوشی کی خاطر قمیضوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور اس کے انتخاب کی داد دی۔

پھر حسبِ روایت تھوڑی سی گفتگو شاپنگ کے بارے میں ہوئی۔ ہم چونکہ ایک بار برطانیہ جا چکے تھے' اس لیے مصنوعات اور ترجیحات پر کھل کر گفتگو کی۔ گفتگو میں ہم نے مار کبھی نہیں کھائی۔ خاتون نے جلدی سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اپنا پتہ اور فون نمبر لکھ دیا اور بولی اگر اب آپ برطانیہ میں آئیں تو میرے غریب خانہ پر ضرور آئیں۔

ہم نے سن رکھا تھا کہ ساؤتھ ہال میں زیادہ تر پاکستانی اور ہندوستانی آباد ہیں۔ اس لیے جب فضا دوستانہ ہو گئی تو پھر سنجیدگی کے ساتھ تلخ سا سوال کر ڈالا:

"آپ اپنے ہاں غیر اقوام کو برداشت کیوں نہیں کر سکتے.... خصوصاً آپ لوگ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے مخاصمت کیوں رکھتے ہیں؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"میں چونکہ سکول میں پڑھاتی ہوں اور میرے پاس ہر ملک اور ہر قوم کے بچے پڑھنے آتے ہیں، اس لیے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ لوگ کیسے ہوتے ہیں ـــــ!"

"کیسے ہوتے ہیں ـــــ؟" ہم نے فوراً سوال کر دیا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں صاف صاف کہوں گی کہ ہم پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں رہتے ہیں مگر ہمارے معیار اور ہماری روایات کو نہیں اپناتے.... ہمارے ملک میں اپنے اپنے طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ سکولوں میں ہم اپنے کلچر کے مطابق تعلیم دیتے ہیں۔ گھروں میں ماں باپ ان پر اپنا کلچر ٹھونستے ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کو آپس میں خلط ملط ہونے کی آزادی نہیں دیتے۔ گھروں کو بے انتہا گندہ رکھتے ہیں۔ بڑی عجیب و غریب خود ساختہ زبان بولتے ہیں۔ ہمارے ملک میں انھوں نے اپنے ملک آباد کر رکھے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمارے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے۔"..

جب وہ یہ سب کہہ رہی تھی تو ایک انجانی سی نفرت اس کے چہرے سے جھانک رہی تھی....

ہاں ـــــ کونسا ملک ہے جس پر آپ نے قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور قبضہ کرنے کے بعد کس ملک میں اپنا ملک آباد نہیں کیا تھا ـــــ یہ تو ابھی تک آپ کے بنائے ہوئے قوانین اور آپ کی بخشی ہوئی علتوں کے اسیر ہیں۔ کس کا کلچر آپ نے تباہ نہیں کیا تھا ـــــ

ہاں ـــــ کبھی آپ نے قبضہ کیا تھا، آج اُنھوں نے کر رکھا ہے ـــــ کبھی آپ نے دوسرے کے ملک میں اپنا ملک آباد کیا تھا ـــــ

کبھی آپ نے ان کے بچوں کو دوغلا بنایا تھا ـــــ کبھی آپ نے ان کا کلچر تباہ کیا تھا ـــــ

ان کے کلچر کے جسدِ خاکی سے تو آپ کی رُوح نہیں نکلی اب تک!

محترمہ! کہتے ہیں سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا ـــــ آپ نے اُس طرح لُوٹا، یہ اِس طرح لُوٹ رہے ہیں بلکہ یہ بچارے تو اپنا آپ لُٹا بھی رہے ہیں۔

تین چوکیاں:

ہمیں اپنی شرافت پر اس لیے ناز ہے کہ وہ ہمارے بشرے سے ٹپکتی ہے۔ اس لیے ایئرپورٹ کی چوکیوں سے بالکل نہیں ڈرتے۔ یوں بھی ہم نے اصول بنا رکھا ہے کہ سامان مختصر ہو تو سفر آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب امیگرانٹس کی چوکی آئی تو مسکراتے دندناتے آگے بڑھ آئے۔ ایک دو ضروری سوال پوچھنے کے بعد گورے نے ہمیں ایک گلابی کارڈ دے دیا جس پر ایک ننھا سا نیلا کارڈ چسپاں تھا.... ہم نے اس ننھے سے نیلے کارڈ کو دیکھ کر سوچا کہ یہ تو اس نے کوئی معرفت کا نشان لگا دیا ہے....

اپنے کارڈ کو نمایاں انداز میں پکڑے ہوئے سب مسافروں کے ساتھ ہم یوں تیز تیز چلے جا رہے تھے جیسے بھینسوں کا ریوڑ ایک دوسرے کے پیچھے چلتا ہے۔ ایکدم کسی نے ہمیں روک لیا۔ ہم نے نظر اٹھا کے دیکھا، سامنے ایک چوکی تھی۔ پھر حسرت سے مُڑ کر سب مسافروں کی طرف دیکھا۔ کسی کے پاس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

نیلا نشان نہ تھا۔ وہ سب باہر چلے گئے اور ہمیں اس گورے کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے تھے۔

اس گورے نے ہمارے کارڈ کو خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر بڑی کرخت سی شکل بنا کر اندر جانے کے لیے کہا۔

اندر ایک اور چوکی تھی۔ وہاں ایک کھردری سی گوری منکر نکیر بنی بیٹھی تھی۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ شکوک و شبہات کی منزلیں کیا ہوتی ہیں اور تابڑ توڑ جملے کسے کہتے ہیں۔ ابھی ہم ایک سوال کے جواب سے سرخرو ہوتے تو وہ دوسرا سوال داغ دیتی.... ایسے اندرونی سوال کر رہی تھی جیسے ہمارے خاندان کے ساتھ کوئی ناطہ جوڑنا چاہتی ہو.... اور جب بہت سے ضروری و غیر ضروری سوالات کر کر کے اس نے ہمارا بھرکس نکال دیا تو بولی :

"آپ واپس کیسے جائیں گی ؟"

دل تو چاہا، کہہ دیں کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ جس طرح ہمارا جی چاہے گا واپس جائیں گے.... جہاز سے جائیں یا بیل گاڑی سے ـــــ بہت غصہ آگیا تو پیدل ہی چل پڑیں گے مگر اس شہرِ خرابی میں ہرگز نہ ٹھہریں گے۔

اسی وقت ہمیں خیال آگیا کہ ان کا کوئی قصور نہیں ـــــ ہموطنوں نے ایسی فضا بنا رکھی ہے کہ یہ ہر شریف صورت پر شک کرنے لگتے ہیں ـــــ ہم نے طیش میں آکر اسے اپنا واپسی کا ٹکٹ دکھایا.... پتہ نہیں وہ شرمندہ ہوئی یا نہیں ـــــ مگر اس نے ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دی ـــــ یہاں ہمارا سامان ہمارا منتظر تھا۔ ہم نے سوٹ کیس اٹھایا اور دل میں سوچا کہ نجات مل گئی۔ اسی وقت ایک حبشی نژاد لمبا تڑنگا بندہ ہمارے سامنے آگیا اور بولا : "ادھر تشریف لے چلیے ـــــ"

افوہ ! ابھی کسٹم کا مرحلہ باقی تھا۔

یہاں جو گوری بیٹھی تھی اس نے ہماری صورت اور ہماری زبان پر بالکل یقین نہیں کیا۔ بولی۔ "سوٹ کیس کھول کر دکھاؤ" ـــــ پھر اس نے ایک ایک کپڑے کو یوں کھنگالا جیسے چرس برآمد کرنا چاہتی ہو.... سوٹ کیس کے اندر ہاتھ ڈالا تو دور تک لے گئی۔ جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ اسے روز کس قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہوگا.... وہ تو سارے خفیہ خانوں اور ٹھکانوں سے واقف معلوم ہوتی تھی۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے ہمیں پسینہ آگیا اور اس خیال سے بھی طبیعت مضطرب ہو رہی تھی کہ گھنٹہ بھر سے ہماری بہن مسرت اور بہنوئی شمشاد باہر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان پر کیا بیت رہی ہوگی ؟

ملاقاتِ مسیحا و خضر :

پورے ایک گھنٹے کے بعد جب ہم نے ایئرپورٹ کا خارجی دروازہ کھولا تو سامنے اپنی بہن پر نظر پڑ گئی.... ایسا لگتا تھا۔ اگر ہم دو منٹ اور باہر نہ آتے تو وہ رو رو کر ہلکان ہو جاتیں۔ مسرت ہماری بڑی بہن ہیں۔ عرصہ سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ان کے تینوں خوبصورت اور صحت مند بچے ماہ رُخ، جواد اور حماد ان کے ساتھ حیران و پریشان کھڑے تھے اور شمشاد بھائی اِدھر اُدھر دوڑ کر انکوائری سے پتہ کر رہے تھے کہ جب سارے مسافر آگئے ہیں تو ایک غریب مسافر فی کو اندر کیوں روک رکھا ہے ـــــ ؟"

ایک نظر میں ہم نے یہ سارا معاملہ بھانپا.... ایک نظر میں ان سب نے ہمیں دیکھا ـــــ پھر چیخوں کے ساتھ کچھ آنسو نکلے ـــــ جدائی کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بعد ملن کا عجیب منظر ہوتا ہے... اور دور دیس میں بسنے والی اپنی کسی پیاری بہن کے گلے لگ جانا دنیا کا سب سے دلآویز منظر ہے۔ اس ملاقات کی خوشبو آج تک دل کے اوراق میں ہے....

ماں جائی سے ماں کی خوشبو آتی ہے۔

ٹرانٹو کی عید :

جی بہت مسرور ہوا یہ سن کہ کہ ٹرانٹو میں مقیم پاکستانی ہر سال دو عیدیں پڑھتے ہیں۔ ایک گروہ کو چاند نظر آجاتا ہے اور دوسرا گروہ عینی شاہد ڈھونڈتا رہ جاتا ہے کیونکہ یہاں پر بھی دو مختلف الخیال مذہبی گروہ ہیں اور ان کے پیروکار ان کی پیروی کرتے ہیں۔ کچھ ایسے مصلحت پسند لوگ بھی ہیں جو دونوں دن دونوں گروہوں کے ساتھ نماز پڑھ لیتے ہیں اور سرخرو ہو جاتے ہیں۔ ہم واشنگٹن سے بھاگم بھاگ اس لیے نکل آئے تھے کہ وہاں لوگ جمعے کو عید منا رہے تھے۔ یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک عید جمعے کو ہوگی اور دوسری ہفتے کو

ہم نے اپنی بہن کی طرف دیکھ کر پوچھا :

"آپ کیا کریں گی ؟"

انھوں نے کہا "اصولاً تو ہم ہفتے کے روز ہی عید منا رہے ہیں مگر وہ لوگ جو جمعۃ المبارک کو عید ملنے آئیں گے، ہم ان کو بھی خوش آمدید کہیں گے کہ یہاں دستور ہی ایسا ہے۔"

ہم نے کہا : کیا دوغلے پن کا یہ دستور وہیں سے آیا ہے۔ الحمدللہ کہ ٹرانٹو پہنچتے ہی ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ پہلی خبر نے ہی ساری اُداسیاں دُور کر دیں۔

کینیڈا یا چُوں چُوں کا مُربّہ

کینیڈا ایک ایسا خطۂ ارض ہے جہاں تقریباً دنیا کے ہر ملک کا باشندہ نظر آتا ہے۔ دستور ہے کہ جب کوئی سرزمین دریافت ہوتی ہے تو دنیا بھر کی مخلوق کا رُخ اس جانب ہو جاتا ہے۔ آج کینیڈا میں دنیا کی بیشتر اقوام آباد ہیں، فرنگی، فرانسیسی، یوکرینین، پولش، ہنگرین، پرتگالی، یونانی، جرمن، جاپانی، چینی، کورین، ہسپانوی، فلی پینو، میکسیکو اور اٹلی کے باشندے ـــــ پاکستانی، ہندوستانی، ترکی، عربی، فلسطینی، مصری، یہودی اور حبشی وغیرہ....

اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی اقوام اس طرف آنا نہیں چاہتیں ... ؟ گاہے گاہے نئی اقوام کی آمد بھی جاری رہتی ہے۔ مثلاً اب ویت نامیوں کے ادھر آنے کا موسم ہے اور ان کو آتے ہی اس قسم کے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو یہاں ہر قوم کا مقدر رہے ہیں۔

کینیڈا میں ایک ظالم رسم ہے کہ جب بھی کسی نئے ملک کے باشندے اس سرزمین پر قدم رکھتے ہیں، ان کو سوچی سمجھی سکیموں کے تحت ستایا جاتا ہے ہراساں کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ ان کو جانی و مالی نقصانات پہنچائے جاتے ہیں اور ان کی راہ میں مختلف نوعیت کی مشکلات کھڑی کر کے ان کو بھگانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

مگر یہاں کے لوگ نہیں جانتے کہ یہ رہ نوردانِ شوق، اپنے ماضی کی کشتیاں جلا کر اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نئی زمین پر قدم رکھتے ہیں۔ اس لیے بڑے صبر کے ساتھ دو تین سال ان مظالم کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ ٹوٹتے پھوٹتے ہیں۔ اپنی خودی کا رستا ہوا لہو دیکھتے رہتے ہیں اور جدوجہد

جاری رکھتے ہیں۔ اس طرح دو تین سال میں ان کے قدم جم جاتے ہیں۔ اچھی نوکریاں بھی مل جاتی ہیں اور ستانے والے بھی ان کے عزم کے آگے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یا ان کو ستانے کے لیے نو وارد مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جوان، سنگین حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے اپنے وطن کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔

ویسٹرن گارڈ :

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ آخر یہ کس کی کارستانی ہے۔ یہاں ایک زیر زمین جماعت ہے جسے ویسٹرن گارڈ کہتے ہیں۔ WESTREN GUARD گو علی الاعلان کوئی بھی اس جماعت کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی حکومتی سطح پر اس جماعت کے وجود کو مانا جاتا ہے مگر غنڈہ گردی کے تمام تر عناصر اور قتل و غارت کی وارداتیں اسی جماعت کی کارروائیاں ہیں۔

ویسٹرن گارڈ کا کہنا ہے کہ وہ اپنی زمین پر رنگ برنگا کلچر برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے مسلسل ہراساں کرنے پر یا تو لوگ واپس چلے جاتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو ان کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں مثلاً عورتیں بال کٹوا کے پتلونیں پہن لیتی ہیں۔ سب لوگ انگریزی زبان بولنے لگتے ہیں اور ان کے بچے اپنی فرسودہ روایات ترک کر کے انہی کی اداؤں کو اپنا لیتے ہیں۔

اس ویسٹرن گارڈ کے مظالم سے تنگ آ کر اقلیتوں نے فیڈرل گورنمنٹ کو درخواستیں دی تھیں۔ ان درخواست دہندگان میں زیادہ تر پاکستانی، بھارتی، جاپانی، ویسٹ انڈین، اٹلی اور جمیکا کے نمایندے شامل تھے۔ ان نمایندوں نے

باقاعدہ حکومت کے ساتھ گفت و شنید کر کے اپنی شکایات کا کتابچہ پیش کیا تھا اور زیر لب یہ بھی کہہ دیا تھا۔ اگر حکومت نے ویسٹرن گارڈ کو تنبیہہ نہ کی تو اقلیتیں اس کا منہ توڑ جواب دیں گی۔

گو حکومت نے ویسٹرن گارڈ کی زیر زمین تخریبی کارروائیوں کو بالکل تسلیم نہیں کیا تھا مگر اقلیتوں کے مطالبات ضرور تسلیم کر لیے تھے جس کی وجہ سے ویسٹرن گارڈ کی سرگرمیوں میں نسبتاً کمی آ گئی ہے۔

یوں بھی یہاں اقلیتوں کے حقوق صرف کاغذ پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ عام زندگی میں ان کے ساتھ جانب دارانہ سلوک کیا جاتا ہے مثلاً ان کے آئین میں درج ہے کہ اقلیتی باشندوں کو ان کی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق ہر شعبے میں نوکریاں دی جائیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ فوقیت ہمیشہ اپنے باشندوں کو دی جاتی ہے۔ سکولوں میں بھی غیر ملکی بچوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ خواہ کسی بھی ملک کا باشندہ ہو، اسے اپنے آپ کو کینیڈین کہنا اور تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہر غیر ملکی کے پاس کینیڈین شہریت کا کارڈ ہوتا ہے۔ اس کارڈ کو حاصل کیے بغیر یہاں نوکری نہیں مل سکتی۔ ہر شعبے میں یہاں گوروں کی بالادستی ہے۔ کاروباری دنیا میں کالا رنگ آڑے آتا ہے۔ خصوصاً الیکشن کے دنوں میں کالوں کے مقدر میں روسیاہی ہی آتی ہے۔

ناحق کی تہمت :

ایک اندازے کے مطابق کینیڈا میں پچیس تیس ہزار پاکستانی اور اسی ہزار ہندوستانی آباد ہیں لیکن اگر سارے مسلمانوں کو جمع کر لیا جائے تو ان کی کل تعداد ساٹھ ہزار کے قریب بن جاتی ہے۔ بازار کا کاروبار زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے کہ یہ جہاں

PUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بھی جاتے ہیں، بازار کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ پاکستانی زیادہ تر نوکریاں کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کاروبار نہیں کرتے، کچھ دوکانیں، ڈرگ سٹور اور جنرل سٹور پاکستانیوں کے بھی ہیں۔ یہاں اکثریت چونکہ فرنگیوں اور فرانسیسیوں کی ہے اس لیے فرانسیسی اور انگریزی سرکاری زبانیں ہیں۔

ایک روز ہم نے اپنے ہم وطنوں سے سوال کیا :

"اچھے لوگو! تمھاری بدنامیاں یہاں چار سو پھیلی ہوئی ہیں کہ ہم جیسے فقیروں کو بھی کسٹم کی تیز آنکھ نے نک کے شیشے سے دیکھا تو اس کی کیا وجہ ہے؟"

اُنھوں نے بتایا :

"یہاں زیادہ تر قانون شکنیاں اور بے ہودگیاں اٹلی اور جمیکا کے باشندے کرتے ہیں مثلاً سمگلنگ، چوری، چھینا جھپٹی، اِدھر کا مال اُدھر..... مگر عتاب ہمیشہ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں پر نازل ہوتا ہے۔ اسے عرفِ عام میں کہتے ہیں : بدا چھا بدنام بُرا"

ہم نے پھر کہا :

"اچھے لوگو! اگلوں نے کچھ بدنامیاں ضرور کمائی ہوتی ہیں جو پچھلوں کے دامن پر آپ ہی آپ آلگتی ہیں۔"

لیکن سب سے عجیب بات جو کینیڈا میں دیکھی۔ وہ ایک دوسرے کو چڑانے کا رواج ہے۔ ہمارا خیال تھا یہ طرزِ ادا صرف ہمارے ہاں ناکام سیاسی پارٹیوں کی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالتی ہیں اور ایک دُوسرے کے نام دھرتی ہیں مگر کینیڈا میں یہ رواج ان کی قومی عادت بن گیا ہے۔

مثلاً پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو "پیکی" PAKI کہہ کر بُلاتے ہیں۔ اٹلی کے باشندوں کو یہاں WHOPS کہتے ہیں۔ جمیکا کے حبشیوں کے لیے لفظ

NIGGERS, مخصوص ہے۔ سکاٹ لینڈ اور برطانیہ کے لوگوں کو LIMIES, کہہ کر چڑایا جاتا ہے۔ چین، جاپان اور کوریا کے باشندوں کو CHINKS, کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اگر کسی جرمن نژاد کو دیکھ لیں تو فوراً ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی ہے اور بے اختیار چلا اُٹھتے ہیں : HI HITLER.

ہم نے یہ سب سُن کر کہا :

چلیئے، پاکستانی تو بے چارے صُورت سے ہی دلگیر اور اٹھائی گیر نظر آتے ہیں اس لیے ان کو چھیڑا گیا مگر کیا ساری قوموں کے لوگ ایسے ہی بے غیرت ہیں کہ سب سنتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا..... دنگا فساد تو قانون شکنی کی شق میں آجاتا ہے۔ جوابی حملے کا بہتر طریقہ یہی تھا کہ کینیڈا کے لوگوں کو بھی ایک "نک نیم" عطا کیا جائے..... کیا نام دیا ہے ان کو آپ نے؟.... ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

بولے :

ہم سب انھیں BANNA FACE. کہتے ہیں۔

بے رحم کہانیاں :

ہمیں ٹرانٹو میں وقتاً فوقتاً اپنے ہم وطنوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس پورے سفر میں ہمارا سب سے اچھا وقت ٹرانٹو میں گزرا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہاں ہماری بہن مقیم ہیں مگر ٹرانٹو میں بسنے والے پاکستانی بھی خلوص کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان ملکوں میں چونکہ ایک دن میں ایک جم غفیر کو اکٹھا کر لینا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے ہماری بہن نے مختلف ٹولیوں میں لوگوں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کو مدعو کیا اور یوں ملاقاتیں جاری رہیں۔ لیکن ایک مُشکل پیدا ہو گئی ہر ملنے والے نے گھر بلایا۔ اصرار کیا..... دعوتیں کھلائیں اور ہمارا وزن بڑھانے میں ہماری مدد کی ہم بھی بہت انکار کرتے تھے مگر کہاں تک؟ خاص طور پر قریشی صاحب اور ان کی بیگم نے تو دفتر سے ایک دن کی چھٹی لے لی اور ہمیں تقریباً آدھا ٹرانٹو دکھایا۔ ٹرانٹو میں بسنے والے پاکستانی وطن کے بارے میں مضطرب رہتے ہیں اور آنے والوں سے بے چین ہو ہو کر ہر بات دریافت کرتے ہیں۔ ہم سب جب مِل کے بیٹھے تو بالکل ایک گھریلو فضا سی بن گئی۔ اس میں ہر کوئی اپنے زخم پر سے پردہ اُٹھانے لگا۔ ان سب کی داستانِ غم تقریباً ایک جیسی ہی تھی۔ پہلے پہلے جب یہاں وارد ہوئے تو کن نامساعد حالات کے ہاتھوں پستے رہے۔ نوکریاں ڈھونڈنے میں کتنی تکلیف ہوئی اور پیٹ بھر کر کھانا کب نصیب ہوا....؟ ہم اپنے مُلک میں بیٹھے ہوئے ان کی تکالیف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم جب انھیں خدا حافظ کہہ کے جہاز پہ چڑھا دیتے ہیں تو سوچ لیتے ہیں کہ ہم نے انھیں ڈالروں کے باغ میں چھوڑ دیا ہے جہاں سونے کے پھل اُگتے ہیں اور چاندی کی نہریں بہتی ہیں اب یہ غوطہ خور ہر بار ہیرے جواہرات کا طشت لے کر باہر نکلیں گے اور یہاں سے فرمائشوں کے لفافے جانے لگتے ہیں اور امیدوں کی سبیل لگ جاتی ہے

ذرا ایک خاتون کی زبانی اس کا گریۂ غم سُنیے :

"پاکستان میں ہمارے معاشی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ ٹرانٹو میں ہماری ایک عزیزہ رہتی تھیں۔ وہ تین چار سال بعد پاکستان آتیں اور اس طرح آتیں کہ ہمارے مُنہ میں پانی بھر آتا۔ وہ بھی ہر بار جاتے ہوئے ہمارے شوق کو ہوا دے جاتیں اور کہتیں" یہاں کیا فقیروں کی طرح پڑے ہوئے ہو۔ کینیڈا آجاؤ۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گی۔"

"ایک روز ہم نے کینیڈا جانے کا ارادہ کر لیا۔ سب کچھ بیچ دیا۔ ویزا حاصل کیا اور تینوں بچوں کی انگلی پکڑ کر وطن سے نکل آئے۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ ان ملکوں میں مُفت برستا ہے۔ جاتے ہی ہماری جھولی بھر جائے گی۔ سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ عیش ہی عیش ہوں گے۔ مگر یہاں آتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہماری وہ عزیزہ جس نے بڑی محبّت سے بڑا اصرار کر کے ہمیں بلایا تھا، ایک ہفتے میں ہی ہم سے بیزار ہو گئی اور بات بات میں روٹی کھلانے کا طعنہ دینے لگی کیونکہ یہاں تو سگی ماں کو روٹی کھلانا بھی مصیبت ہی لگتا ہے۔ ہمارے پاس نقد پیسہ نہیں تھا، ٹھکانا نہیں تھا، کھانے کو نہیں تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچّے تھے۔ سارا سارا دن میرا شوہر نوکری کے لیے مارا مارا پھرتا۔ حتّٰی کہ اگر ذلیل سے ذلیل کام بھی مل جاتا تو وہ چند ڈالروں کی خاطر کر لیتا۔ میں اپنی عزیزہ کے برتن مانجھا کرتی۔ اس پر بھی میری عزیزہ کا غصّہ سوا نیزے پر رہتا۔ روٹی اس طرح دیتی جیسے کتّے کے آگے ڈالتے ہیں اور طعنوں سے کلیجہ الگ چھلنی کرتی۔ ایک ایک نوالے کے ساتھ مجھے کئی کئی آنسو نگلنے پڑتے اور میں سوچا کرتی۔ پردیس میں ذلّت کی اس روٹی سے کیا اپنے دیس کی روکھی سُوکھی اچھّی نہ تھی جہاں اپنی عزت نفس محفوظ تھی۔ ہمدرد بھی تھے اور پرسانِ حال بھی بہت دنوں کے دھکّے کھا کر میرے شوہر کو ایک معمولی سی ملازمت مل گئی۔ اس کے آسرے پر ہم نے ایک سستا سا اپارٹمنٹ لے لیا اپارٹمنٹ کیا تھا، بس سر چھُپانے کا آسرا تھا۔ نہ اس میں بوریا بستر اور نہ فرنیچر..... کئی روز تک کھردری زمین پر سونا پڑا۔ بچّوں کو سکول میں داخل کرا دیا اور ہم روکھی سُوکھی پر صبر کرنے لگے۔ کیونکہ میرے شوہر کی تنخواہ بہت کم تھی اس لیے میں سارا سارا دن سڑکوں پر ملازمت کی تلاش میں ماری ماری پھرتی۔ میرے پاس کوئی ڈگری نہ تھی۔ ویسے بھی یہاں کے لوگ ملازمتیں دینے کے معاملے میں متعصّب

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہیں۔ آہ کی صورت گلیوں گلیوں منڈلا منڈلا کر جب میں بیدم ہو جاتی تو کسی بڑے پلازہ کے آگے بھکارنوں کی طرح جا کر بیٹھ جاتی اور زار و قطار رونا شروع کر دیتی.... اکثر لوگوں نے میرے بہتے ہوئے آنسو دیکھے مگر کوئی آنسو پونچھنے نہ آیا.... یہاں آنسو پونچھنے کا رواج نہیں ہے یہاں ہمدردی بہت مہنگی پڑتی ہے..... یہاں کسی کو دو میٹھے بول بولنے کی فرصت نہیں ہے..... یہاں تو صرف ڈالر کی حکمرانی ہے۔ ڈالر جیب میں ہو تو ہمدرد بھی مل جاتے ہیں۔ دوست بھی اور آنسو پونچھنے والے بھی.... جیب خالی ہو تو کوئی آپ کے لیے وقت ضائع نہیں کر سکتا.... مجھے اپنے ماں باپ بہن بھائی دوست و احباب یاد آتے تھے۔ اپنا دیس یاد آتا تھا اور میں سوچتی تھی اے کاش! میں نے اپنے وطن کی سڑکوں پر جھاڑو لگایا ہوتا اور یہاں نہ آئی ہوتی.... راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر باہر دوڑ جاتی۔ آگے کوئی رستہ نہ تھا اور پیچھے کے سب دروازے ہم بند کر آئے تھے.....

یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے بے شمار سٹور ہیں۔ ایک لیدر سٹور کا مالک مسلمان جوڑا تھا۔ اس کی دوکان کے باہر خالی اسامیوں کے لیے اشتہار لگا ہوا تھا۔ میں اندر چلی گئی۔ مگر ان میاں بیوی نے مجھے ملازم رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے مذہب اور ملک کے نام پر بھیک مانگی تو بھی ان کا دل نہ پسیجا.... میں روتی ہوئی وہاں سے نکل آئی.... دوسرے دن انھوں نے دو کینیڈین لڑکیاں وہاں رکھ لیں۔

ایک سال تک ہم سب نے بڑی اذیت ناک زندگی گزاری۔ پھر مجھے بھی ملازمت مل گئی۔ اس طرح زندگی کی باقی ضروریات خریدنے کے قابل ہو گئے۔ یہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مصیبت میں ہم وطن بھی ہاتھ تھامنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں اس لیے ملنے سے کتراتے ہیں مبادا انھیں کسی قسم کی مدد کرنی پڑ جائے.... بلکہ بعض ہم وطن جو ذرا خوش حال ہو جاتے

ہیں باقاعدہ مذاق اڑاتے ہیں اور کچوکے لگاتے ہیں..... تاہم" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں..." جب روٹی اور نوکری کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر مقامی لوگوں نے طرح طرح سے ستانا شروع کر دیا۔ ہمارے بچے جو اس ماحول سے نامانوس تھے، سکول میں جایا کرتے تو مقامی بچے موقع پا کر انھیں سکول کے اندر پیٹا کرتے۔ وہ ہر روز لہولہان ہو کر آتے۔ ایک روز سکول سے واپسی پر کینیڈین بچوں نے میرے بڑے بچے کی سائیکل چھین لی جو ہم نے اسے قسطوں پر خرید کے دی تھی۔ میں نے جا کر سکول کے پرنسپل سے شکایت کی تو اس نے صاف کہہ دیا..." جو کچھ سکول کے گیٹ کے باہر ہوتا رہتا ہے میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں"

چونکہ مقامی بچوں کو علم ہو گیا تھا کہ میں ان کی شکایت کر چکی ہوں اس لیے روزانہ شام کو وہ سب اکٹھے ہو کر ہمارے گھر کے قریب آ جاتے اور پھر میرے بچوں کو گھیر گھار کر مارنا شروع کر دیتے۔ اور جب کبھی میں اپنے بچوں کی چیخیں سن کر باہر دیوانہ وار دوڑتی۔ وہ بچے مجھے دیکھ کر بھاگ جاتے..... میں اپنے لہولہان بچے کو اٹھا کر اپارٹمنٹ میں لے آتی اور پھر آسمان کی طرف منہ کر کے دھاڑیں مار مار کر رویا کرتی.....

"لیکن پھر....." ایک سوگوار مسکراہٹ اس کے لبوں پر چھا گئی" رفتہ رفتہ حالات بدلتے گئے۔ ہم اس ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے.... ایک سال گزرا، دوسرا، تیسرا..... اور اب تو چھ سال ہو گئے ہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ اپنا ایک گھر ہے۔ اچھی نوکری ہے۔ عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں..."

ایک اور خاتون بولیں" ایک بار ان مقامی بچوں نے ان کے بچے پر مٹی کا تیل چھڑک دیا تھا اور اسے آگ لگانے والے تھے کہ ایک جمیکا کا باشندہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پہنچ گیا اور اس طرح ان کے بچے کی جان بچ گئی۔"

"ہاں۔" ایک تیسری خاتون نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ہمارے بچوں کی چیزیں تو اکثر چھین کر لے جاتے ہیں۔"

"اور آپ کے بچے احتجاج نہیں کرتے؟" ہم نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولیں "ہمارے بچے اس وقت احتجاج کرتے ہیں جب انھیں "پکی" کہا جاتا ہے..... "پکی" ایک طرح کی گالی بن چکی ہے۔ اس پر ہمارے بچے بپھر اٹھتے ہیں۔ جھڑپ ہو جاتی ہے اور معاملہ سکول کے ہر پرنسپل تک پہنچ جاتا ہے۔"

"تو پرنسپل صاحب کیا کرتے ہیں؟"

"وہ یہ تو جانتے ہیں کہ مقامی بچوں میں بہت زیادہ تعصب ہے لیکن ساتھ ہی یہ معذوری بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

ایک اور خاتون جو ڈاکٹر تھیں، انھوں نے اپنی کہانی سنائی۔ وہ بھی پہلے عزیزوں کی اور پھر مقامی لوگوں کی زخم خوردہ تھیں۔ اپنے پاؤں جمانے کے لیے انھیں بھی ایک آگ کے دریا سے گزرنا پڑا تھا۔

اور پھر جو زبانیں کھلیں تو ورق ورق آنسوؤں سے تر ملا۔ مگر اب یہ سارے خاندان خوشحال تھے اور عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بظاہر مطمئن اور مسرور نظر آتے تھے۔

اس لیے ہم نے محفل کی اداسی دور کرنے کے لیے کہا۔

"یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ مشکلات پر قابو پا چکے ہیں اور اب خوش و خرم ہیں۔"

"خوش؟"

پھر ایک معنی خیز سی چپ چھا گئی جسے ایک معزز اور بزرگ شخص نے توڑا

بولے:

"صحیح معنوں میں تو یہاں کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ بھلا اپنے وطن سے دور، اپنے عزیزوں سے دور کوئی خوش رہ سکتا ہے؟ ہاں اب اپنے حالات سے مطمئن ضرور ہیں اور پھر یہاں جتنے بھی آسودہ حال لوگ نظر آ رہے ہیں۔ انھوں نے اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے انتھک محنت اور بے حد جدوجہد کی ہے۔ مشکلات سے باقاعدہ جنگ کی ہے۔ پانچ چھ سال بعد ہی تو بار آور ہونے کا وقت آتا ہے۔ ایسے میں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔

"اصل بات میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔"

ایک صاحب جو کافی دیر سے خاموش بیٹھے سب کی گفتگو سن رہے تھے ایک دم گویا ہوئے۔

"بات یہ ہے کہ ہم یہ ملک چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ہماری روح ان آسائشوں کی اسیر ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

بولے "یہ خوبصورت اور ترقی یافتہ ملک جادو کی نگریاں ہیں۔ یہاں بڑے دلآویز طریقے سے قید کیا جاتا ہے۔ اتنی محبت سے ادھار لینے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کی نیت پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوتا۔ سارے بنک اس انداز سے قرضے کی پیشکش کرتے ہیں جیسے ہم سے زیادہ قابلِ اعتبار شخص انھیں آج تک نظر نہیں آیا تھا.... مکانات، دکانیں، کاریں اور سب آسائشی مصنوعات قسط وار خریدنے کی ایسی ایسی لاجواب سکیمیں پیش کرتے ہیں کہ ہم جیسے فاقہ مست بغیر سوچے سمجھے، سکیموں کے اس جال میں پھنسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ جو آپ ہمارے آرام دہ اور دیدہ زیب

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

گھر دیکھ رہی ہیں، یہ سب اس قرضے کی جکڑ بندیاں ہیں۔ پھر ان گھروں کو جدید سہولتوں سے آراستہ کرنے کے لیے ہم لوگ نت نئے جال میں پھنسنے کو تیار رہتے ہیں۔ ہمارا نفس نفس سہولتوں کا رسیا ہو جاتا ہے اور بال بال قرضے میں پھنس جاتا ہے۔ پھر ہم لہو کی بوند بوند سے یہ قرضے چکاتے رہتے ہیں۔ اپنی رضا سے یہ پھندے گردن میں ڈالتے ہیں، تو کیسے واپس جا سکتے ہیں؟"

ان کی تائید میں سب اہلِ محفل نے نظریں جھکا لیں۔ مرد حضرات اب بالکل خاموش ہو چکے تھے۔ خواتین دھیمی دھیمی لَے میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ہم نے ان کی جانب دیکھا تو ایک خوش پوش سی خاتون بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائیں اور پھر کہنے لگیں:

"ہمارے یہاں ٹک جانے کی وجہ مردوں سے جداگانہ ہے۔"

"اچھا ... وہ کیا ہے؟" ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

تھوڑا سا جھجکیں ... ذرا لجائیں پھر بولیں "وہاں ہمارے ملک میں خانگی آزار بہت ہیں۔"

"خانگی آزار کیا ہوتے ہیں محترمہ؟" ہم نے پھر پوچھا۔

"یہی آزار جی ساس بہو کے بھائی بھاوج کے رشتوں ناطوں کے وہاں تو لڑکی ایک مرد سے نہیں پورے خاندان سے بیاہی جاتی ہے جس کو خوش نہ رکھ سکے وہی صورت سے بے زار نظر آتا ہے۔ جس عزیز کے گھر جائے وہ سلام دعا سے پہلے طعنوں کا ہار گلے میں پہنا دیتا ہے۔ ہر کوئی ہر کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ میاں بیوی اپنی مرضی سے خوش رہنا بھی چاہیں تو ارد گرد کے لوگ ایسا نہیں کرنے دیتے۔ یہاں کم از کم ہم عورتوں کو ذہنی سکون ہے۔ ساس نند کا کوئی جھگڑا نہیں۔ اپنے چھوٹے سے گھر کا تھوڑا سا کام ہوتا ہے۔ ساری توجہ اپنے بچوں

اور اپنے گھر پر ہوتی ہے۔ شوہر کہیں سے کان بھر کے نہیں آتے۔ فضول قسم کے اخراجات سے بچ جاتے ہیں۔ دو چار سال بعد جب ایک ماہ کے لیے پاکستان جاتے ہیں تو سب رشتہ دار سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں خوب دعوتیں کرتے ہیں سسرالی جنجالوں سے دور ہم عورتیں تو یہاں بہت خوش ہیں۔"

یہی بات ہم نے امریکہ میں مقیم پاکستانی خواتین کے منہ سے سُنی تھی اور اسی قسم کا اظہارِ خیال یورپ میں بسنے والی پاکستانی خواتین نے کیا تھا۔

ہم نے اس بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا اور ہمارے پاس کہنے کو تھا بھی کیا؟ ابھی ہم سوچ کے دریا میں ڈبکیاں لگا کے کوئی نیا سوال پوچھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب نہایت جوش سے بولے:

"کبھی کسی حکومت نے پاکستان سے باہر مقیم پاکستانیوں کے مسائل کا جائزہ نہیں لیا حالانکہ ہماری وجہ سے وہ اتنا زرِ مبادلہ کماتی ہے۔"

"آپ کے مسائل کیا ہیں؟" ہم نے یوں پوچھا جیسے حکومت کے خاص الخاص نمائندے ہوں۔

"یہی دیکھ لیجیے" وہ بولے "کینیڈا میں داخل ہونے کے لیے ویزے کی قید ہے لیکن کینیڈا کے باشندے پاکستان جانا چاہیں تو انھیں ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آزادی کے بعد سے ہمارے کینیڈا کے ساتھ بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ ایسے میں ویزے کی دیوار ہٹا کیوں نہیں دیتے۔"

ہم نے مسکرا کر کہا:

"برادرِ عزیز! آپ بھی کتنے معصوم اور انجان ہیں۔ دستور ہے کہ ہمیشہ غریب اجازت لے کر امیر کے گھر جاتا ہے۔ امیر پر کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ اس کا جب جی چاہے وہ اٹھ کے چلا آتا ہے اور اس کے آنے پہ ہمیشہ سو بسم اللہ جی آیاں نوں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کہتے ہیں۔

پھر ہم نے حسبِ توفیق دانشور بننے کی کوشش کی اور ایک خواہ مخواہ قسم کا سوال کر ڈالا.... کہ

آپ سب پاکستانی جو عرصۂ دراز سے یہاں مقیم ہیں۔ آپ کے بچّوں کا مستقبل کیا ہوگا.... ؟"

اس پر پوری محفل میں اداسی چھا گئی۔ گو اس کا جواب واضح تھا مگر ہر کوئی جواب دینے سے کترا رہا تھا۔

پھر ایک صاحب نے ہمّت کی اور بولے :

" بحیثیت مسلمان ہمارے بچوں کا مستقبل نہایت تاریک ہے۔ ہم اگر واپس جانا چاہیں تو جا نہیں سکتے۔ ہمارے بچے جو یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں پلے بڑھے ہیں۔ اسی کلچر میں ضم ہو رہے ہیں۔ اسی زبان سے اپنی پہچان کراتے ہیں۔ اپنی مذہبی اور معاشرتی روایات سے بے بہرہ ہیں۔ ہمارے پاس اِتنا وقت نہیں کہ انھیں مذہبی تعلیم دے سکیں۔ وہ بڑی شدّت سے اپنے اردگرد کا اثر قبول کر رہے ہیں۔ ہماری آیندہ نسلوں کا کیا ہوگا.... ؟ ہم خود نہیں جانتے۔"

ہاں۔ یہ بات تو ہم نے آتے ہی بھانپ لی تھی کہ پاکستانیوں کے بچّے صرف شکل وصورت سے ہی پاکستانی لگتے ہیں ورنہ ان کا لب ولہجہ، نشست وبرخاست پسند وناپسند بالکل مقامی لوگوں جیسی ہے۔ خصوصیّت سے جو لوگ اندرونِ شہر یا قصبوں سے گئے ہیں وہ اپنے بچّوں کے ساتھ اردو بولنا بھی باعثِ شرم سمجھتے ہیں۔

ہمیں اپنی ایک پُرانی سہیلی کا دلچسپ قصّہ یاد آگیا جو اُنھوں نے ہمیں خود سُنایا تھا۔ بیاہ کے بعد وہ امریکہ جا بسی تھیں۔ وہیں پر ان کے دو بیٹے ہُوئے۔

ان کے سُسر شکر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ بڑا ارمان تھا انھیں اپنے پوتے دیکھنے کا.... خدا خدا کر کے انھیں بہو اور پوتوں کے آنے کی نوید ملی۔ خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے۔ گاؤں کے چھوٹے سے گھر کو جنّت کا ٹکڑا بنانے پر تُلے ہُوئے تھے اور پوتوں کو سینے پر لٹا کر ان کی توتلی باتیں سننے کو بیتاب وار پھر رہے تھے..... مگر جب امریکہ پلٹ پوتے کو اُٹھا کر بے اختیار سینے سے لگایا اور پھر اس کا منہ چُوم لیا تو وہ خالص امریکی لہجے میں اپنی ماں سے بولا :

WHO IS THIS DIRTY OLDMAN MAMA.

(یہ غلیظ بُڈھا کون ہے ماں ؟)

وہ تو اچھا ہوا کہ دادا کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ پھر تعلیمیافتہ بہُو نے ان کی کسمپرسی دیکھ کر انھیں انگریزی کا ابتدائی قاعدہ لا دیا۔ تاکہ وہ اتنی انگریزی سیکھ جائیں کہ اپنے پوتوں کے ساتھ لیس نو کر سکیں۔

بڑی بی کا دیدار :

کہتے ہیں گیدڑ کی موت آئے تو شہر کی جانب جا نکلتا ہے۔ جی نہیں ہماری ایک اور مجبوری ہے..... ہم جس ترقی یافتہ شہر میں جا نکلیں اس کا اندرون شہر ضرور دیکھنا چاہتے ہیں کسی بھی ملک کا مزاج یا کلچر اس کے اندرونِ شہر میں ملتا ہے نئی آبادیاں چونکہ جدید طرز پر بنائی جاتی ہیں۔ اس لیے وہاں پر ایک سی تہذیب کی چکاچوند ہوتی ہے۔

ایک دن جی میں آئی کہ چل کے ٹرانٹو کا اندرونِ شہر دیکھا جائے.....

ہماری بہن نے ازراہِ محبّت ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم گم ہو جانے والی شے نہیں ہیں۔ مگر احتیاطاً انھوں نے ہمارے ساتھ جانے کا ارادہ باندھ لیا۔

گھر سے ہم بس میں سوار ہوئے جس نے ہمیں ریلوے سٹیشن پر اُتار دیا جس طرح پیرس میں میٹرو۔ لندن میں ٹیوب ٹرین اور جاپان میں بلٹ ٹرینیں چلتی ہیں، اسی طرح کینیڈا میں "سب وے سسٹم" ہے۔ بجلی سے چلنے والی زمین دوز گاڑیاں ہر منٹ کے بعد ہر سٹیشن سے مل جاتی ہیں۔ ان گاڑیوں میں سوار ہونے کے لیے بھی لوہے کا کلیجہ درکار ہے۔ ہم اپنی بدحواسی پر قابو پانے میں بہت ماہر ہیں، اس لیے لوگوں کی دیکھا دیکھی جھپٹ کر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ڈبے میں زیادہ رش نہیں تھا۔ بہت سی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور کونے والی سیٹ پر ایک لمبے دانتوں والی بڑی بی سکڑی سمٹی بیٹھی تھیں۔ ہم ان کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور غور سے دیکھنے لگے کہ ان کے دو دانت جو پورے مُنہ میں ان کا واحد سرمایہ تھے، اصلی ہیں یا نقلی ہیں اور جب اچھی طرح تسلی کر چکے کہ یہ بھی اپنے دیس کی ہیں تو حسبِ عادت گفتگو میں ابتدا کر دی۔

"آپ اتنی صبح کہاں جا رہی ہیں؟"

ہم نے پوچھا۔

"جاب پر....."

وہ خوش دلی سے بولیں۔

"جاب پر....." ہم نے حیران ہو کر کہا۔ "اس عمر میں جاب..... اور وہ بھی یہاں کینیڈا میں.... بلاشبہ اس عمر کے بزرگ ہمارے ملک میں بس اللہ اللہ کیا کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ خیر صلا کر لیتے ہیں ؎

ظالم خیال کر تیرا عہدِ زوال ہے

بڑی بی نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی اور اپنے دو دانتوں پر دوپٹہ پھیر کر بولیں:

"دو سال پہلے میرے بیٹے نے مجھے لاہور سے بُلوایا تھا۔ بہُو کا بچہ ہونے والا تھا۔ اب بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ گھر میں بھی زیادہ کام نہیں ہوتا تو میرے بیٹے نے مجھے شیشیاں صاف کرنے والی ایک فیکٹری میں ملازم کرا دیا ہے۔ اچھی خاصی رقم کما لیتی ہوں۔"

"آپ اس رقم کا کیا کریں گی.... اس عمر میں تو آپ کو صرف آرام کی ضرورت ہے۔ آپ کی بہو اور بیٹا خاصے کما لیتے ہوں گے۔"

"ہاں...." انھوں نے ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا..." مگر ان ملکوں میں فارغ بیٹھنا بہت معیوب ہے۔ پھر میرا جی نہیں چاہتا بیٹے پر بوجھ بنوں۔ کچھ میں بھی ان کی جھولی میں ڈال ہی دیتی ہوں۔ پیچھے جا کر کیا کروں گی۔ وہاں کون مجھے سنبھالنے والا ہے...."

یہ کہہ کر انھوں نے کھڑکی کے شیشے کی جانب منہ کر لیا تاکہ آنکھ میں آیا پانی چھپا سکیں۔

ہم آگے بڑھ کر انھیں گلے سے لگانے والے تھے کہ ہماری بہن مسرت نے ہمیں بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔ غالباً ہمارا اسٹیشن آ گیا تھا۔

BUTHURST. کے اسٹیشن پر ہم اتر گئے اور وہاں سے پیدل ہی بازار کی جانب رُخ کیا۔

یہاں کا مشہور اور سستا بازار یہودیوں کا بازار ہے۔ ریستوران، سبزی ترکاری، مٹھائی، پھل، ملبوسات، زیورات، ہر قسم کی دکانوں کے مالکان یہودی ہیں اور عام طور پر یہودی کی بیوی یا بیٹی سودا بیچنے پر مامور ہے۔ یہ لوگ سیاحوں کی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

خُوب کھال اتارتے ہیں۔ صورت سے گاہک کو پہچان لیتے ہیں۔ دم گھٹانا بڑھانا ان کی عادت ہے۔ اس لیے مقامی لوگ ان دکانوں سے خرید و فروخت کرنے سے کتراتے ہیں۔

جوان گلی :

جب سے ہم نے ینگ سٹریٹ YOUNG STREET. کا نام سُنا تھا وہاں جانے کے لیے مچل رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا جو شخص ایک بار اس گلی سے گزر جاتا ہے، ہمیشہ جوان رہتا ہے مگر یہاں پہنچے تو معلوم ہُوا کہ یہ تو ایک مصروف تر بازار ہے۔ بڑے بڑے پلازوں کی نسبت یہاں چیزیں سستی دستیاب ہو جاتی ہیں یہاں انارکلی والی بھیڑ ہوتی ہے۔ بوڑھے، بچے، جوان سب آتے رہتے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بچے جوان جوان بُوڑھے اور بُوڑھے ضعیف ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں پر تھوک و پرچون کی ایک منڈی بھی ہے جس کا نام "جراڈ سٹریٹ" ہے مگر لاہور کے لوگ اسے اکبری منڈی کہتے ہیں۔ اس منڈی میں دنیا بھر کی اجناس مل جاتی ہیں۔ یار لوگوں نے ایک خوب صورت چوک کا نام چاندنی چوک رکھ چھوڑا ہے یہاں ایک سینما ہال میں اردو فلم لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہاں اردو فلمیں نہ صرف سینما ہالوں میں بلکہ ٹی وی پر بھی ہفتہ وار دکھائی جاتی ہیں۔ ٹرانٹو ریڈیو سے ایک اردو کمرشل سروس بھی ہوتی ہے۔

چائنا ٹاؤن : CHINA TOWN.

چلتے چلتے ہم "چائنا ٹاؤن" میں پہنچ گئے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ چینیوں کا بازار ہے۔ چینی یہاں خوب قدم پھیلا رہے ہیں۔ پُرانی عمارات و دوکانیں سستے داموں خرید کر اُنھوں نے ایک جدید ترین چینی طرز کی مارکیٹ بنالی ہے جس میں دوکانیں، فلیٹ اور ریستوران سب چینیوں کے ہیں۔ ویسے چپٹی ناک اور ادھ کھلی آنکھوں والے اتنے باشندے ہیں یہاں کہ تفریق کرنا مشکل ہے۔ اس میں کتنے چینی ہیں۔ ہمارے لیے یہ بات باعثِ تعجب تھی کہ اگر چین ایک خوش حال ملک ہے تو اتنے چینی وہاں سے نکل کر اِدھر اُدھر کیوں آباد ہو رہے ہیں۔ چینیوں کا ایکا اور بھائی چارہ مثالی ہے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل حل کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی ساکھ پر آنچ نہیں آنے دیتے۔

یہاں جتنی بھی غیر ملکی اقوام آباد ہیں، ایکا کر کے اپنے قدم جما رہی ہیں اور مستقل اپنے ہم وطنوں کو بلا رہی ہیں۔ ان کے لیے سہولتیں اور آسانیاں فراہم کر رہی ہیں۔

اگرچہ جمیکا کے باشندوں کو یہاں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن ان کا آپس میں ایسا اتحاد ہے کہ سب اس اتحاد سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ انہی دنوں ایک دلخراش واقعہ بھی ہوا تھا۔ پولیس کے ہاتھوں ایک بے گناہ حبشی مارا گیا تھا جس کے چار بچے تھے۔ سارے حبشی کائیں کائیں کر کے متحد ہو گئے۔ ہڑتالیں کیں۔ جلوس نکالے۔ اخبارات کے دفتر پر ہلہ بول دیا۔ عوام کو للکارا اور ایسا ہنگامہ کھڑا کیا کہ حکومت کی مشینری حرکت میں آ گئی۔ قاتل پکڑے گئے۔ جُرم کا اعتراف کر لیا اور مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا۔ ایسے میں عوام کی تمام تر ہمدردیاں مقتول کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ساتھ تھیں۔

ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے قصّے سُن کر ہم نے ایک محفل میں اپنے ہم وطنوں سے سوال کیا:

"کیا پاکستانیوں نے بھی کوئی انجمن بنائی ہے اور کیا متحد ہو کر اپنے ہم وطنوں کے لیے آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرنے کی کوئی سکیم چلا رہے ہیں؟"

اس پر محفل میں خاموشی طاری ہو گئی اور سب ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ ہمیں اپنے اس بے ہودہ سوال پر بڑی کوفت ہوئی اور ہم نے فوراً اپنا سوال بغیر جواب کے واپس لے لیا۔

گیسو سنوار ہرنی:

ایک دن ہماری بہن اور بہنوئی اپنے اپنے کام پر چلے گئے اور ہم سے کہتے گئے کہ "آج تم آرام کرو۔ جب سے تم آئی ہو گھوم پھر رہی ہو۔"

ان کے سامنے ہم نے وعدہ کر لیا کہ سارا دن سوئیں گے یا کھائیں گے۔ لیکن ان کے جاتے ہی شوقِ آوارگی کچوکے لگانے لگا۔ چند دن ملے ہوں کینیڈا میں اور وہ بھی سو کے گنوا دیے جائیں۔ کیا وطن میں سونے کے مواقع کم ہیں... اجی وہاں تو بس سونا ہی سونا ہوتا ہے۔ سو ہم نے اپنی چودہ سالہ بھانجی ماہ رُخ کو بلوایا اور سرگوشی کے انداز میں کہا:

"تمھیں ٹرانٹو شہر کے سب راستوں کا علم ہے نا؟"

"ہاں ہاں" وہ حیرت سے بولی "مگر کیا بات ہے؟"

"آج ذرا پیدل ہی آوارگی کرنے چلتے ہیں۔"

"آہا! بہت مزہ آئے گا" رُخی نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔

"مگر ایک خیال رکھنا۔ تمھاری امّی ابّا کے آنے سے پیشتر ہم گھر آ جائیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے...." وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ پھر ایک دم رُک گئی اور بولی "بشی خالہ! ایک وعدہ کریں۔ آج آپ میرے بال بھی کٹوا دیں گی' کئی دنوں سے امّی ابّا سے کہہ رہی ہوں انھیں فرصت ہی نہیں ملتی اور دیکھیں میرا سر جنگل بن گیا ہے...."

"تم بھی کیا یاد کرو گی رُخی" ہم نے اس کے بال چھُو کر کہا "آج تمھیں ہر قسم کی آزادی ہو گی۔ بال کٹواؤ۔ بال سیٹ کرواؤ۔"

"واہ۔ واہ...." رُخی خوشی سے تالیاں بجاتی ہمارے ساتھ ہی باہر نکل آئی....

ان ترقی یافتہ ملکوں کے جن شہروں میں بھی نکل جائیں، بازار ہی بازار نظر آتے ہیں۔ ہر محلّے اور ہر علاقے میں شاپنگ پلازا ہوتا ہے۔ آدمی نہ بھی چاہے تو سجی بنی دکانیں اندر بلاتی ہیں۔ ہم بارہ بجے تک صرف دو دکانیں ان کی سجاوٹیں اور مصنوعات کا بانکپن دیکھتے رہے۔ ایک ٹورسٹ شاپ پر چپٹی ناک والی گوری کھڑی تھی۔ ہم نے تکا لگا کر پوچھا۔

"آپ چین کی ہیں؟"

بولی "نہیں۔ میں کوریا کی ہوں۔"

بچوں کی کچھ ٹی شرٹس لٹکی ہوئی تھیں جن پر کینیڈا کے SUVENIORS. بنے ہوئے تھے..... ہم بے اختیار اس طرف بڑھے تو وہ بولی:

"آپ کس ملک سے آئی ہیں؟ کون ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟"

خاتون ہماری طرح باتونی تھی۔ ایک سانس میں کئی سوال پوچھتی تھی۔ ہم نے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مسکرا مسکرا کر ہر سوال کا جواب دیا۔

تو وہ ہنس کر بولی "یہ ٹی شرٹس جو آپ خریدنے والی تھیں، پاکستان کی بنی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں ان پر صرف چھاپا لگاتے ہیں اور امپورٹڈ کہہ کر بیچ دیتے ہیں۔"

اس وقت جی اتنا نہال ہوا کہ ایک دم یہ ننھی منھی بنیانیں چوم لینے کو جی چاہا۔

ہمیں حیرت میں ڈوبا دیکھ کر پھر گویا ہو گئی . . .

"اصل میں جب میں اپنے وطن واپس جاتی ہوں تو سب عزیزوں کے لیے تحفے خرید کر لے جاتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے نا! جب آدمی اتنے عرصے کے بعد پردیس سے جائے تو لوگ ملنے آتے ہیں۔ پھر انھیں کوئی تحفہ دیں تو بے حد خوش ہوتے ہیں۔ شروع میں مجھے کوئی خاص پہچان نہ تھی۔ میں کوریا کی بنی ہوئی چیزیں ہی خرید کر کوریا لے جاتی تھی اور وہاں جا کر شرمندگی ہوتی تھی۔ لوگ کہتے تھے اُلٹے بانس بریلی کو اس لیے آپ کو ٹوک دیا کہ کہیں آپ بھی"

"نہیں نہیں" ہم نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ایسا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم تو یہ قمیضیں خرید کر اپنے بچوں کو دکھانا چاہتے ہیں کہ پاکستانی مال کینیڈا میں بھی فروخت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اتنی بڑی مارکیٹ میں بہترین چیزیں بنا کر بھیجنی چاہئیں"

اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر اُبھرا، جسے محسوس کر کے ہم نے کہا۔

"خاتونِ محترم! یہ حرکت صرف آپ سے سرزد نہیں ہوتی۔ مڈل ایسٹ سے جتنی خواتین آتی ہیں، تقریباً پاکستانی مصنوعات ہی خرید کر پاکستان میں لے آتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان مصنوعات پر دوسرے ملکوں کی مہریں لگی ہوتی ہیں۔ خود پاکستان کے اندر پاکستانی مصنوعات پر غیر ملکی مہریں لگا کر بیچنے کا رواج ہے۔"

وہ اور حیران ہوئی۔ بولی:

"کیوں ؟"

ہم نے کہا "بس ذرا غیر ملکی مہریں لگ جانے سے ہماری مصنوعات پوتر ہو جاتی ہیں۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سعودی عرب میں پاکستانی کپڑا کوریا کا کہہ کر بیچا جا رہا تھا۔"

اس پر وہ بے تحاشا ہنسی . . . اور کہنے لگی:

"بالکل نئی بات سُنی ہے"

ہم نے کہا "سُنانے والے کی خیر مانگ۔"

بولی:

"آپ کے کتنے بچے ہیں . . . ؟"

ہم نے کہا "ماشاء اللہ چار بچے ہیں!"

بڑی حیران ہوئی۔ کہنے لگی:

"ابھی تک پاکستانی خواتین اتنی پسماندہ ہیں؟"

ہم نے کہا:

"ایک ہی تو کھیتی ہمارے ملک میں ہری ہے۔ اسی جنس میں تو ہمارا ملک خود کفیل ہے۔ اسی معاملے میں تو خود مختاری اور آزادی ہے۔ کوئی فرد کچھ اور کرے یا نہ کرے، اسے بچے پیدا کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ بچے پیدا کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی کام بھی کیا جائے یا اسے بہتر زندگی کی ضمانت دی جائے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ ہے جو صرف بچے پیدا کرتا ہے۔ ہمیں اب بھی اپنی کم ہمتی کا احساس ہے۔ مگر آپ کون ہوتی ہیں جرح کرنے والی ہمارا جی چاہے گا ہم اور بچے پیدا کریں گے۔ کوئی آپ کے گھر سے اُدھار لینے تو نہیں آتے۔"

کہنے لگی:

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"اگر آپ کینیڈا میں ہوتیں تو بڑی مشکل ہوتی آپ کے لیے یہاں چار بچوں کو سنبھالنا اور پالنا بہت مشکل ہے۔"

ہم نے پوچھا:

"آپ کے کتنے بچے ہیں...؟"

بولی:

"صرف دو...." اور بعض اوقات میں ان سے بھی تنگ آجاتی ہوں... یہاں اتنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے کہ بچے بوجھ لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔

"ہمارے ہاں کیسے بھی حالات کیوں نہ ہوں، بچوں کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا..."

بولی:

"یہاں کینیڈا میں بچے پیدا کرنے کا رجحان دن بہ دن کم ہو رہا ہے... بعض شادی شدہ جوڑے تو بچوں کے حق میں ہی نہیں ہیں۔ نتیجتہً ان کی آبادی بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے۔ اور غیر ملکی آکر یہاں آباد ہو رہے ہیں۔ بعض علاقوں میں بچوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ انھیں اسکول بند کرنا پڑ رہے۔ اساتذہ زیادہ ہیں اور بچے کم ہیں۔"

ہم نے کہا:

"ذرا سی ہمت کر کے یہ استاد خود ہی بچے کیوں نہیں پیدا کر لیتے۔ گھر کی بات گھر میں رہے گی۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو ہمیں مسز مارکھنی بہت یاد آئیں۔ اگر وہ سامنے ہوتیں تو ہم پوچھتے کہ بھئی وہ حکومت کے سپوت کہاں ہیں یعنی محبت کے

بچے جو کنواری جھولیوں میں آگرتے ہیں اور حکومت جھٹ ان کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیتی ہے۔ ایسے بچے پیدا کرنے کی تو یہاں عام اجازت ہے پھر آبادی پر اس کا اثر کیوں پڑ رہا ہے....؟

مگر افسوس مسز مارکھنی کو تو ہم نے واشنگٹن ڈی۔سی میں ہی خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب جلے دل کے پھپھولے کہاں پھوڑتے....؟

رُخی نے اچانک ہمارا بازو کھینچا اور بولی.... "بشیٰ خالہ! آپ اس سوکھی ماری عورت سے چمٹ گئی ہیں۔ بارہ بج رہے ہیں اور ایک بجے ہیئر ڈریسر کی دوکان میں وقفہ ہو جائے گا۔"

"اوہو"... ہم نے اپنی چیزیں اُٹھائیں اور پھپھینی خاتون کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئے۔

ماہ رُخ ہمیں اس دوکان میں لے گئی جہاں سے وہ عام طور پر بال ٹھیک کروایا کرتی تھی۔ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا ایک سیاہ ہرنی تیزی سے قینچی پکڑے ایک خاتون کے بالوں پر مشقِ ستم کر رہی تھی۔ جتنی تیزی سے قینچی چل رہی تھی، اس سے کئی گنا تیز اس کی زبان کی رفتار تھی۔ سنا تھا حجام باتونی ہوتے ہیں.... لیکن اگر اتفاق سے خاتون حجام ہو تب...

ہم زبان اور قینچی کی رفتار کا تقابل کرنے کے لیے راستے میں ہی ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے چونک کر ہمیں دیکھا..... اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ قینچی کی طرح اس کی زبان بھی ٹھہر گئی تھی۔ اس کو یوں حیرت سے اپنی جانب دیکھتا پا کر وہاں موجود تمام خواتین نے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے گھبرا کر خود اپنی طرف دیکھا اور اپنے سر کو ہاتھوں سے چھُوا کہ کہیں ہمارے سینگ تو نہیں نکل آئے؟

اس پر سیاہ ہرنی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور خندہ پیشانی سے بولی:

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کی صورت میری ساس سے اتنی مشابہ ہے کہ میں آپ کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر دنگ رہ گئی۔"

"ہماری ساری خوش فہمیوں پر اوس پڑ گئی۔ ہم نے مری ہوئی آواز میں اتنا ہی کہا..... "اچھا....."

اس نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا "تشریف رکھیے۔"

اور پھر اس کی قینچی اور زبان نئے سرے سے چالو ہو گئیں۔

فارغ ہو کر سیاہ ہرنی سیدھی ہمارے پاس آئی اور مسکرا کر بولی:

"میرا نام ایو ہے۔ میں جمیکا کی رہنے والی ہوں لیکن اپنی ساس کی باتوں سے جلی ہوئی ہوں..."

"لیکن اس کے باوجود آپ ہماری صورت اپنی ساس سے ملا رہی ہیں؟"

وہ ہنس پڑی اور بولی:

"میری ساس کو اپنی جوانی کے قصّے سُنانے کا بہت شوق ہے۔ ہر وقت مجھے ٹوکتی رہتی ہے اور کہتی ہے جوانی میں میں ایسی تھی ویسی تھی وغیرہ وغیرہ..... ویسے ہر بوڑھی عورت کو اپنی جوانی بڑی شاندار نظر آتی ہے۔ میں روز اس کی باتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ مگر آج اچانک آپ کو دیکھا تو یوں لگا میری ساس جوان ہو کر آ گئی ہے۔"

"کہاں کی ہیں آپ کی ساس.....؟" ہم نے بمشکل تھوک نگل کر پوچھا۔

"اوہ....." ہنس کر بولی "مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ میری ساس ہندوستان کی ہیں۔ میں نے ایک مسلمان سے شادی کر رکھی ہے۔ باقی تو سب ٹھیک ٹھاک ہے میرا شوہر ماں کا بڑا احترام کرتا ہے اور اس کی بات خوب سُنتا ہے۔ جن دنوں میری ساس ٹرانٹو آ جاتی ہے۔ میری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ لیکن آج میں یہاں سے

جا کر اسے خط ضرور لکھوں گی اور کہہ دوں گی کہ میں نے تمھارا ماضی دیکھ لیا ہے.....

افوہ! یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے آئی ہیں؟"..... اس چرب زبان خاتون نے ذرا کی ذرا دم لیا۔ ابھی ہم جواب نہ دے پائے تھے کہ ایک کیبن کا پردہ اٹھا کر ایک سُوکھی ماری مدقوق سی گوری باہر نکل آئی:

"ایو تم اتنی تیز رفتاری سے کس کے ساتھ باتیں کر رہی ہو؟" اس نے قینچی پکڑی ہُوئی تھی۔

"دیکھو نیلسی۔ اس خاتون کو دیکھو۔ کتنی مشابہ ہے میری ساس سے"..

"ہاں!" مدقوق گوری نے ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے۔ مگر اپنی ساس کو تو تم اتنا پسند نہیں کرتیں لیکن انھیں دیکھ کر مسلسل اُسی کا ذکر کر رہی ہو..."

ایو کھسیا گئی۔ بولی "نہیں۔ آج کے بعد میں اُسے بہت اچھا سمجھوں گی۔ بس اگر وہ ہر وقت بک بک نہ کرے تو بہت اچھی ہے۔"

ہمیں یکایک اس کی ساس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ بیچاری اپنے چاند سے بیٹے کے لیے پری جیسی دُلہن کے خواب دیکھتی ہو گی۔ مگر لاڈلے میاں کو کالی حوا بھا گئی..... اب بڑی بی کو کون سمجھاتا کہ عشق کے معاملے اُلٹ ہوتے ہیں۔

حوا نے ازراہِ عنایت ہم سے پوچھا... "آپ کی کیا تواضع کریں؟"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بس اتنا کہا "ماہ رُخ کو جلدی فارغ کر دیں کیونکہ شام کو ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔ بس یہی آپ کی تواضع ہو گی۔"

اس نے ماہ رُخ کو بازو سے پکڑ کر نیلسی کے حوالے کیا اور بولی "جلدی جلدی اس کے بال ٹھیک کر دو۔"

اسی وقت ایک اِنتہائی خوبرو لڑکی دکان میں داخل ہوئی۔ یہ پہلی اچھی شکل تھی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جو ہم نے ٹرانٹو میں دیکھی۔

حوّا اسے دیکھ کر ایک دم کھِل اُٹھی اور جلدی سے اسے آئینے کے آگے بٹھا لیا۔ لڑکی کے شانے ننگے تھے اور اس نے برائے نام سا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ حوّا نے اس کے بال کھولے تو چٹکی لے کر بولی :

"تم تو خود اتنی خوبصورت ہو۔ جسم کی نمائش کیوں کر رہی ہو ؟"

لڑکی ادا سے مسکرائی اور بولی :

"گرمی بہت لگتی ہے۔"

"ہاں۔ اس عمر میں گرمی بہت لگتی ہے۔"... حوّا نے معنی خیز انداز میں کہا "کہاں کام کرتی ہو....؟"

"فرانسیسی سفارت خانے میں۔" وہ بولی۔

"افوہ"... حوّا نے ایک چیخ ماری۔ تبھی تبھی.... تمھیں گرمی زیادہ لگتی ہے۔ خوب مزے ہوں گے... ہے نا ؟ تمھارے اوپر تو مرد دیوانہ وار فدا ہوں گے ؟"

"اونہہ...." اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر کندھے اُچکائے :

"سارے مرد وہاں شادی شدہ ہیں ؟"

"بے وقوف...." حوّا نے اس کے کندھے پر کنگھی ماری "شادی شدہ مرد ہی تو خطرناک ہوتے ہیں۔ عاشق مزاج بھی ہوتے ہیں اور لڑکیوں سے آنکھ مٹکا کرنے کے سو حیلے جانتے ہیں بلکہ شادی شدہ مردوں کو تو ہر جوان لڑکی اچھی لگتی ہے خواہ بدصورت کیوں نہ ہو۔"

وہ لڑکی شیشے میں دیکھ کر پھر ادا سے مسکرائی اور بولی :

"سارا وقت تو ان کی بیویاں دفتر میں فون کرتی رہتی ہیں۔"

"ہاں۔ تم جیسی بلا اگر ان کے شوہروں کے گرد منڈلا رہی ہو تو انھیں خطرہ ضرور محسوس ہوتا ہوگا۔"

"مگر مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے...." خوبصورت لڑکی نے ناک سکوڑ کر کہا

اس لڑکی کو اپنی خوب صورتی کا بے حد احساس تھا۔ کیونکہ جب کسی عورت کو اپنے حسین ہونے کا یقین ہو جائے تو وہ اِرد گرد کم اور آئینے میں زیادہ دیکھتی ہے۔ وہ باقاعدہ نرگسیت کی ماری لگ رہی تھی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھے بغیر کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی..:

حوا نے اس کے لمبے بال کھول دیے اور قینچی چلانے لگی۔ قینچی کے ساتھ ہی پھر اس کی زبان چالو ہو گئی۔ اس بار ہمیں ان کی آواز نہیں آئی تو ہم اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگے۔

اس دکان میں زیادہ تر ادھیڑ عمر عورتیں تھیں یعنی چالیس سے اُوپر اُوپر۔ کوئی رولرز لگائے بیٹھی تھی۔ کسی نے بال رنگوائے ہوئے تھے۔ کوئی چہرے پر ماسک لگوا رہی تھی۔ ہم نے ان کی گفتگو کی طرف کان لگائے تو وہ آپس میں اس قسم کی گفتگو کر رہی تھیں :

"اس مرتبہ پھر تمھاری بہن کی لڑکی ہو گئی ہے ؟"

"ہاں۔" دوسری بولی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا اس کی لڑکی ہو گی۔"

"ہاں ! واقعی تم نے کہا تھا... مگر تمھیں کیسے اندازہ ہو گیا تھا۔"

"بس ہے ایک ٹوٹکا میرے پاس...."

"پلیز مجھے بھی بتاؤ نا...؟"

کہنے لگی "تمھیں یاد ہے تمھاری بہن بیف زیادہ کھاتی تھی ؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"ہاں ہاں!"

"تو بس یاد رکھو جو عورت بیف زیادہ کھائے اس کی لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ جو عورت حمل کے دوران سٹیک پسند کرے تو اس کا لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ میری یہ بات پلّے سے باندھ لو..."

اس پر وہاں موجود سب خواتین اپنے اپنے تجربات پر سیر حاصل بحث کرنے لگیں.... رُخی فارغ ہو چکی تھی۔ ہم نے ان خواتین کے مشوروں سے استفادہ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور باہر نکل آئے۔

افریقن لائن سفاری : AFRICAN LION SAFARI.

افریقن لائن سفاری خونخوار جانوروں کا ایک مہذب جنگل ہے۔ یہ ٹرانٹو سے قریباً ساٹھ ستّر کلو میٹر دور ہے۔ ایک غیر آباد سرسبز علاقے کی احاطہ بندی کر کے یہاں دُنیا بھر کے جانور بسا دیے گئے ہیں۔ یہ نئی صدی کا ایک عجوبہ ہے کہ نیلے آسمان تلے سب جانور کھُلے پھرتے ہیں۔ انھیں پنجروں یا زنجیروں میں بند نہیں کیا گیا۔ نہ ان کے لیے بڑی بڑی فصیلیں ہیں اور نہ آہنی تالے لگے ہیں۔ ہر جانور کے علاقے کی حد مقرر ہے اور کمال یہ ہے کہ ہر جانور اپنی حد کے اندر رہتا ہے۔ شیر ریچھ کی حد کے اندر نہیں جاتا.... چیتا بھیڑیے کی زمین پر ناجائز قبضہ نہیں کرتا۔ گینڈا ہاتھی سے الگ رہتا ہے۔ ہرن نیل گائے کی باڑھ نہیں پھلانگتے۔ بارہ سنگا جنگلی بھینسے کے گھر نہیں جاتا... ہر کوئی اپنی اپنی منڈلی میں مست مگن رہتا ہے۔

ہاں جو بات یہاں بڑی عجیب لگتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس جنگل کے اندر حضرت انسان کو بند کر کے لایا جاتا ہے۔ پنجرے میں نہیں موٹر میں.... جہاں سے

لوگ ٹکٹ خریدتے ہیں، وہیں باہر بڑی بڑی ہدایات لکھی نظر آتی ہیں "جانوروں کو مت چھیڑیے گا..." "ہاتھ باہر نکال کر انھیں کچھ کھلانے کی کوشش نہ کریں..." "کار کے شیشے بند رکھیں..." "جن موٹروں کی چھت کپڑے کی ہے وہ اندر نہ جائیں" "جانوروں کو غصّہ نہ دلائیں" وغیرہ وغیرہ.... اتنی ہدایات پیشِ نظر رکھ کے جب ہم اندر گئے تو مارے خوف کے دل دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اتفاق سے پہلے شیر ببر کی حدُود شروع ہو گئیں۔ کتنے ہی شیر اور شیرنیاں اپنی کھچاروں سے باہر نکل کر درختوں کے سائے تلے سستا رہے تھے۔ شیر کے انداز میں وہی نخوت، وہی برہمی، وہی خود مختاری والی ادا تھی.... اپنی غصیلی آنکھوں سے لدی ہوئی موٹروں کو دیکھتا اور غرّانے کی بجائے صرف دُم ہلا دیتا.... پتہ نہیں انھوں نے شیر کو اپنے نفس پر قابو پانا کیسے سکھایا ہوگا۔ مگر ہم نے تھوڑی دیر کے لیے یہ ضرور سوچا.... کہ اس آزاد اور جمہوری فضا میں جہاں ہر جانور کو الگ الگ ریاستیں و اجگذار کی گئی ہیں۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے یا نہیں اگر نہیں تو یہ صورتِ حال اس نے کس طرح قبول کی ہے؟

کینیڈا کی جنگلی بھینس کی صورت اس قدر بھیانک ہے کہ ایک بار اس کی طرف دیکھ کر دوسری بار دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ جس وقت ہم بندروں کے علاقے میں پہنچے تو چاروں طرف سے بندر نکل نکل کر ہماری طرف آنے لگے بلکہ جو موٹر بھی آئی، انھوں نے اس کا گھراؤ کر لیا۔ باوجود شدید ترین ہدایات کے.... لوگوں نے ہاتھ باہر نکال کر بندروں کو چنے اور مونگ پھلیاں کھلانی شروع کر دیں۔ یُوں لگتا تھا بندر اس تواضع اور تپاک کے عادی ہیں کیونکہ وہ اپنا سوالیہ چہرہ لے جا کر ہر موٹر کے آگے کھڑے ہو جاتے.... چھت پر چڑھ جاتے.... شیشے کے اوپر پنجے رگڑنے لگتے.... ہمارے پیچھے ایک موٹر آ گئی جس کی چھت کپڑے کی تھی اور پھر ایک عجیب منظر سامنے آیا.... تمام بندر دوڑ کر اس موٹر کی چھت پر چڑھ گئے اور پلک جھپکتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

میں انھوں نے اپنے دانتوں اور پنجوں سے اس گاڑی کی چھت کی دھجیاں بکھیر دیں۔۔
.... اس کے بعد نمعلوم وہ مسافروں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے۔ اسی وقت جنگل کی کھچار میں سے ایک ڈنڈا بردار شخص نکل آیا جس نے سفید اور سیاہ دھاریوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بندر چھلانگیں لگا لگا کر اُترنے لگے اور اِدھر اُدھر چھُپنے لگے۔ اس نے بمشکل راستہ بنا کے اس موٹر کو واپس بھیجا۔۔۔ خطرناک جانوروں کے آس پاس لائن سفاری کی اپنی موٹریں گھُومتی رہتی ہیں۔ ان پر سفید اور کالی دھاریاں ہوتی ہیں۔ عجیب بات دیکھی۔ جانور غصّے سے غرّاتے ہوئے موٹر کی طرف بڑھتے تو وہی گاڑی سامنے آجاتی۔ جانور لائن سفاری کی موٹر کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹ جاتے۔ اس موٹر میں ہمیشہ دو آدمی بیٹھے ہوئے نظر آتے ایک موٹر میں ایک عورت بھی نظر آئی۔ تب ہم نے اس کی بے خوفی کو سراہا۔ لیکن دوسرے لمحے ہمیں خیال آگیا کہ یہاں کی عورت مردوں سے نہیں ڈرتی، خونخوار جانوروں سے کیا ڈرے گی؟ اس جنگل میں صرف چوپائے ہی نہیں ہیں۔ آبی پرندوں کے لیے ایک الگ حصّہ مخصوص ہے۔ وہاں ایک مصنوعی جھیل بنا دی گئی ہے۔ جس میں بطخیں تیرتی رہتی ہیں..... شتر مُرغ، کلنگ، سارس، ہنس اور بگلے سب اس جھیل کے آس پاس نظر آئے۔ پھر اس سے اگلی حدُود میں اُڑنے والے پرندے تھے۔ خدا جانے انھوں نے انھیں کس طرح سدھایا تھا کہ باوجُود پر اور طاقتِ پرواز رکھنے کے، وہ اس کھلی فضا میں ایک درخت سے دوسرے درخت پر اُڑتے اور چہچہاتے پھرتے تھے..... دنیا بھر کے جانور اور خوش شکل پرندے یہاں دیکھے..... حتیٰ کہ ایک جگہ ہمیں ایک صحت مند سا گدھا گھاس چرتے ہوئے نظر آگیا۔ اس کو دیکھ کر جی اتنا خوش ہُوا کہ ہم نے بے اختیار کہہ دیا...

"اللہ کا شکر ہے یہاں بھی گدھے ہیں۔"

اس پر ہمارے ایک میزبان نے آوازہ کسا۔

"محترمہ! یہ گدھا آپ کے ملک سے آیا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک فرمایا محترم۔" ہم نے پلٹ کر جواب دیا "ویسے بُرا نہ مانیں، گدھے کس ملک میں نہیں ہوتے....؟ ہم نے تو پیرس میں بھی گدھا دیکھ لیا تھا.... فرق صرف یہ ہے کہ آپ اپنے گدھے کلیجے سے لگا کے رکھتے ہیں اور ہم انھیں تحفتہً بھیج دیتے ہیں۔"

پھر ہم نے ان سے پوچھا کہ "اس اتنی بڑی راجدھانی کا نظام کون چلاتا ہے؟ یہاں کوئی سیاسی پارٹی ہے یا نہیں؟..."

وہ بولے:

جہاں کوئی سیاسی پارٹی ہو، وہاں اتنا امن کیسے ہو سکتا ہے؟ یہاں کا امن ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کر لینے کی وجہ سے ہے۔"

بچّوں کی دنیا:

لائن سفاری سے باہر نکلیں تو بچّوں کے لیے ایک خوبصورت پارک اور میوزیم ہے۔ یہاں ریستوران بھی ہے اور بچّوں کے لیے بجلی کی گاڑیاں اور جھُولے بھی.... پورے امریکہ اور کینیڈا میں ایک چیز بہت بھلی لگی۔ یہ لوگ بچّوں کی تفریح کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بچّوں کے پارک، جھُولے اور تفریحی گاڑیاں رنگ آمیز اور دیدہ زیب ہوتی ہیں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پائنیر ویلیج : POINEER VILLAGE

ہم جب سے ٹرانٹو آئے تھے ہر ایک سے بے تاب ہو کر پوچھتے کہ بھئی کینیڈا کے قدیم اور اصلی باشندے کہاں ہیں جنھیں عرف عام میں انڈین کہا جاتا ہے۔ ہم نے ٹرانٹو کی بعض آرٹ گیلریوں میں ان کی تصویریں دیکھی تھیں۔ فلموں میں انھیں دیکھا تھا۔ مگر کینیڈا کے مہذب شہروں کی چکا چوند میں تہذیب میں ڈوبے رنگ برنگے انسان تو نظر آتے تھے۔ بچارے انڈین نظر نہیں آتے تھے.... ہمارے عزیزوں اور میزبانوں میں سے کوئی بھی ان کا صحیح اتہ پتہ نہیں بتا سکا تھا۔ بس سب نے یہی کہا :

"یہاں ایک انڈین ویلیج ہے..INDIAN VILLAGE وہاں قدیم باشندوں کو رکھا گیا ہے۔"

"یہ باشندے ہیں یا جانور ؟"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

پھر ایک سیانے نے ہمیں بتایا کہ کسی کو مارنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ گولی استعمال کی جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ منشیات اور لغویات فراہم کر کے عضوِ معطل کر دیا جائے۔ یہی گورے کی پالیسی ہوتی ہے۔ چنانچہ کینیڈا کے قدیم باشندوں کو جنھیں ریڈ انڈین کہتے ہیں، اسی راہ پر لگا دیا گیا ہے... حکومت نے ان کے سرداروں کے ساتھ ایک معاہدہ کر رکھا ہے جس کے تحت انھیں وظائف دیے جاتے ہیں۔ ایک جدا خطۂ زمین بھی ان کو بخشا گیا ہے لیکن وہ حکومت کے معاملوں میں دخل اندازی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اپنے حال میں مست ہو گئے ہیں۔

ویسے کینیڈا کی آرٹ گیلریوں میں ان کی تصاویر لگی ہوتی ہیں اور صنعتی نمائشوں میں ان کی دستکاریوں کے نمونے اکثر پائے جاتے جنھیں لوگ خوشی خوشی خرید لیتے ہیں۔

سولھویں صدی کے اختتام تک یہی انڈین کینیڈا کے اصل باشندے تھے۔ پھر اس کے بعد برطانوی اور فرانسیسی وارد ہونا شروع ہو گئے۔ بالآخر انھوں نے ان کو دُودھ کی مکھی کیطرح نکال باہر کیا۔ اب یہ لوگ تاریخ کی کتابوں اور آئین میں تو نظر آتے ہیں مگر زمین پر کہیں نظر نہیں آتے۔ یہاں اکثر ایک عجیب لطیفہ رونما ہوتا ہے جب کوئی آدمی جل کر کسی کینیڈا کے باشندے سے کہتا ہے "تم تو کینیڈا کے نہیں ہو.... چلے جاؤ یہاں سے۔" تو وہ پلٹ کر جواب دیتا ہے "اگر میں کینیڈا کا باشندہ نہیں ہوں تو تم بھی نہیں ہو.... تم کیوں نہیں چلے جاتے۔" اس لیے یہاں کوئی کسی سے نہیں پوچھتا کہ کینیڈا کے اصلی باشندے کون ہیں ؟

ہم نے جب یہ سوال کیا تو ہمیں لوگوں نے یوں دیکھا جیسے ہم سے بڑا احمق کوئی نہیں دنیا میں....!

ہماری بے چینی کو محسوس کر کے ایک دن ایک میزبان نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ POINEER VILLAGE دیکھیں جا کر..... یہ ایک قدیم ترین گاؤں ہے۔ وہاں سے آپ کو اصلی اور پُرانے باشندوں کا سُراغ ملے گا۔ کم از کم آپ ان کی تہذیب کا تو اندازہ لگا سکیں گی۔

یہ ابتدائی زمانے کا گاؤں ٹرانٹو شہر کے مضافات میں بنایا گیا ہے۔ ہمارا خیال تھا اس گاؤں میں پُرانے باشندے بھی ہوں گے۔ مگر یہ ایک ایسا گاؤں ہے جس میں سب کچھ ہے مگر باشندے نہیں ہیں۔ اس گاؤں میں سولھویں صدی کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھر ہیں اور گھروں کے اندر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ضروریاتِ زندگی کی ہر شے رکھی ہوئی ہے جو اس زمانے کے مطابق قابلِ استعمال یا دستیاب تھی۔ یہ گھر سولھویں صدی ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ وہی طرزِ تعمیر ہے اور وہی رہائش کا انداز یوں لگتا ہے یہاں بھی گاؤں میں جاگیردارانہ نظام رائج تھا کیونکہ ان تمام گھروں میں سب سے خوبصورت اور کشادہ گھر گاؤں کے نمبردار کا ہے۔ ان کے کھانے کے برتن، پہننے کے کپڑے اور بستر وغیرہ قیمتی اور خوبصورت ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤں میں ایک گرجا ہے۔ ایک ڈاکخانہ ہے جس میں پوسٹ بکس بنے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں لوگ اپنی ڈاک لینے کے لیے خود ڈاک خانے میں جاتے تھے۔ گاؤں میں بچوں کا ایک اسکول ہے۔ ایک موچی کا گھر ہے۔ سنار کی دوکان ہے۔ لوہار کی دوکان ہے۔ گاؤں میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مطب ہے ... مطب اسی انداز کا ہے جیسے ہمارے گاؤں میں اب بھی ہوتے ہیں البتہ آلاتِ جراحی بالکل بدل گئے ہیں۔ کسانوں کے گھر نمایاں نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے گھروں میں کھیتی باڑی کے آلات پڑے ہوئے ہیں اور ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کے آلات ابھی تک ہمارے گاؤں میں استعمال کیے جاتے ہیں.... ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے یہاں ایک لمبی ٹرین مع انجن کے کھڑی ہے۔ یوں لگتا ہے ابھی ابھی اسٹیشن ماسٹر باہر نکل کر جھنڈی لہرائے گا تو ٹرین چل پڑے گی۔ اسٹیشن کو گرم رکھنے کے لیے کوئلوں والی انگیٹھیوں کا رواج تھا۔ پارسل، منی آرڈر اور ڈرافٹ اسٹیشن سے بھیجے جاتے تھے بلکہ بینکنگ کا سارا کام اسٹیشنوں پر ہوتا تھا، مثلاً ٹریولرز چیک بھنوانے کا کام یا روپیہ بدلوانے کا کام بھی اسٹیشن پر ہی کیا جاتا تھا۔ وہی پرانے زمانے کے نل۔ وہی کمتی بھوننے والی بھٹیاں.... وہی چکیاں!

گھروں کے باہر پھول اور سبزیاں اگانے کا رواج تھا۔ گاؤں اتنی خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ یوں لگتا ہے گاؤں کے سب لوگ میلہ دیکھنے گئے ہیں،

شام ہونے سے پہلے پہلے لوٹ آئیں گے۔
کیونکہ دروازے منتظر اور کھڑکیاں چشم براہ لگتی ہیں۔

صنعتی و تجارتی نمائش :

ٹرانٹو میں ہر سال اگست کے مہینے میں ایک بہت بڑی صنعتی و تجارتی نمائش لگتی ہے جس میں ہر قوم اور ملت کے باشندے اپنی ملکی مصنوعات کا سٹال لگاتے ہیں۔ اس مشہور و معروف نمائش کو دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں ہم چونکہ ٹرانٹو میں ہی بیٹھے تھے۔ سوچا ہم کیوں نہ فیضیاب ہوں اس نمائش سے لیکن جب اس کے پنڈال میں داخل ہوئے تو سر چکرایا... اتنی خلقت کا ہے کو ہم نے دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا آج اللہ کا ہر باشندہ اس نمائش گاہ میں پہنچا ہوا ہے بمع بندی کے

ایک پنڈال میں صرف بچوں کے لیے سو قسم کے جھولے لگے ہوئے تھے سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ٹکٹ صرف ایک بار ہی خریدنا پڑتا تھا۔ اسی ٹکٹ کے سہارے ہر تفریح کر سکتے تھے۔ جو بات ہم نے خاص طور پر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچوں کی دلچسپی کی یہاں ہزاروں چیزیں تھیں۔ ایک بھیانک غار بنائی گئی تھی جس کے اندر جنوں بھوتوں اور چڑیلوں کے ڈھانچے بنا کر رکھے گئے تھے اور ساتھ ہی ان کی آوازیں بھی ریکارڈ کی ہوئی تھیں۔ وہی خوفناک مناظر جو ہم اپنے بچپن میں پڑھتے آئے ہیں۔ بعض بچے اندر جاتے ہی چیخیں مارنے لگتے لیکن اس کے باوجود لوگ اس CHAMBER OF TERROR میں جوق در جوق جا رہے تھے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم بھی دل کڑا کر کے اس غار کے اندر چلے گئے۔ اور ایسے معلوم ہوا جیسے ہم طلسم کے اثر سے کسی جادوئی نگری میں پہنچا دیے گئے ہیں جہاں ڈھانچوں کی مخلوق ہے.... کھوپڑیاں حرکت کرتی ہیں.... بغیر سر کے باشندے ہیں... فضا میں تلواریں ٹکرا رہی ہیں.... دُور سے آدم بو آدم بو کی آواز آ رہی ہے اور کوئی معصوم حور صفت شہزادی کالے دیو کی قید میں پڑی چلّا رہی ہے۔ پھر ایک مہم جو بہادر شہزادہ تلوار لے کر نمودار ہوتا ہے..... اور جادو سے بنے ہُوئے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں....

ہم آج تک ایسی کہانیوں کے ہیرو کو بُھگت رہے ہیں....

اونٹاریو سائنس سینٹر. ONTARIO SCIENCE CENTRE.

کینیڈا میں اپنا صد سالہ جشنِ آزادی بہت تزک و احتشام سے منایا گیا تھا۔ اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے حکومت نے عوام کے لیے کچھ کام کیے تھے۔ انہی میں ایک "اونٹاریو سائنس سینٹر" بھی ہے۔ یہ خوب صورت عمارت اس کی سب تجربہ گاہیں اور تمام جدید ترین سائنسی آلات نئی نسل کے نام ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حکومت نے اپنی جوان پود کو یہ تحفہ دیا اور صاف کہہ دیا۔ ان تجربہ گاہوں اور جدید آلات سے فائدہ اُٹھانا آپ کا کام ہے۔ اگر لاکھوں کروڑوں بچوں میں سے ایک بچہ بھی موجد نکلا تو ہم سمجھیں گے۔ ہماری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

چنانچہ اس سائنس سنٹر میں ہمہ وقت بچوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ سکولوں کے اساتذہ بچوں کو یہاں لاتے ہیں اور ان سے نئے نئے تجربے کرواتے ہیں۔ اب تک جتنی سائنسی ایجادات ہوئی ہیں۔ ان کی تفاصیل وہاں درج ہیں۔ اور نئے تجربوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ ہر تجربے کے لیے وہاں ہدایات درج

ہیں۔ بچے آتے اور فوراً مصروف ہو جاتے۔ اندر ایک ہال تھا جس میں بچوں کو لیکچر دیا جاتا ہے اور بچے جس قسم کا چاہیں سوال کریں، انھیں تجربے کی صورت میں جواب دیا جاتا ہے....

اس تجربہ گاہ کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد ہم نے سوچا واقعی نئی نسل کے لیے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

رائل اونٹاریو میوزیم ROYAL ONTARIO MUSEUM.

عجائب گھر دیکھنے کا ہمیں کوئی خاص شوق نہیں ہے مگر کیا کریں۔ جہاں بھی جاتے ہیں، لوگ کسی نہ کسی عجائب گھر کو دیکھنے کی پیش کش ضرور کر دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں ہم "رائل اونٹاریو میوزیم" میں جا گھُسے۔ باہر سے میوزیم کی عمارت بہت ہولناک اور پُر اسرار لگ رہی تھی۔ ہم نے ٹکٹ خریدا اور اندر کو لپکے۔ پہلے حصے میں دنیا بھر کے قیمتی پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ان کی تاریخ درج تھی اور مصرف بھی درج تھا۔ بعض پتھروں کی قیمتیں بھی لکھی ہوئی تھیں۔ ہم کیا کریں.... ہمیں سب سے قیمتی پتھر وہی لگتا ہے جو انگوٹھی میں جڑا ہو۔ اس لیے ہم ان پتھروں کو حقیر جانتے ہوئے آگے بڑھ گئے..... ایک طرف سیڑھیاں نظر آئیں..... بے اختیار اوپر چڑھ گئے۔ سامنے ہی ایک دروازہ تھا۔ جس پر لکھا تھا "جنت کا دروازہ" واہ.... اتنی آسانی سے جنت مل جائے گی، ہم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ چلیے کسی خیر خواہ کے توسط سے ہی سہی، جنت سے ہوتے جائیں، یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا تو بغلی دروازے سے ایک چوبدار نے نکل کر ہمیں روک دیا اور بولا:

"یہ راستہ آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"تو پھر کس کے لیے ہے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"صرف شاہی مہمان یہاں آ کر عبادت کر سکتے ہیں۔"

تب ہمیں خیال آیا کہ یہ ظلِ الٰہی قسم کے لوگ جہاں چاہیں جنت تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ کشمیر کا شالیمار ہو یا ایران کا تختِ طاؤس جامِ جم ہو یا ٹرانٹو کا میوزیم۔ ہم نے بیدلی سے زینہ زینہ طے کرنا شروع کیا۔ اس پورے سفر میں یہ پہلی عمارت تھی جس میں نہ لفٹیں تھیں اور نہ بجلی کی سیڑھیاں ... پتہ نہیں شاہی مہمان اپنی جنت تک کیسے پہنچتے ہوں گے ... یا شاید وہ سیڑھیوں پر سے گنہ بخشوا کے اندر جاتے ہوں گے۔

ہم ہانپتے کانپتے اور اپنے آپ کو کوستے بالآخر سب سے اُوپر والی منزل پر پہنچ ہی گئے ... سامنے ہی دروازے پر بہت خوبصورت رسم الخط میں لکھا تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ طبیعت ایک دم بشاش ہو گئی۔ بسم اللہ کے عین نیچے کسی جامع مسجد کی بہت بڑی پینٹنگ لٹکی ہوئی تھی۔ ہم دوڑ کر کمرے کے اندر گھس گئے۔ یہ سوچ کر کہ یہاں تو سب کچھ اپنا ہی ہے۔ اندر جا کر معلوم ہوا وہاں مصری اور ایرانی تہذیب کی نشانیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً مصری و ایرانی بادشاہوں کے فرغل اور تاج شاہی خواتین کے ملبوسات اور زیورات قدیم ظروف فارسی دیوان کے قلمی نسخے ایک شوکیس میں کلامِ پاک کا ایک قلمی نسخہ رکھا ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں مقفل تھیں اور ہر چیز پر درج تھا، کب، کہاں سے اور کس سے خریدی گئیں۔

اس سے آگے ایک حصہ چین کے عجائبات کے لیے مخصوص تھا۔ چین کے قدیم شہنشاہوں اور شہزادیوں کے بے شمار ملبوسات لٹک رہے تھے جن سے ان کی عظمت اور سطوت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ چین کے قدیم سربراہوں کے بے شمار

بُت رکھے ہوئے تھے اور ان مجسموں کے ذریعے چین کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی تھی۔

ایک حصے میں گوتم بُدھ کے بے شمار مجسمے رکھے تھے جن میں اس کے معتقدین کے مجسمے بھی تھے

پھر ایک حصے میں انگلستان کا شاہی خاندان سمیٹ دیا گیا تھا۔ ملکہ میری ... ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ تک سب کے ملبوسات تاریخ وار وہاں لٹک رہے تھے اتنے زیادہ سکے، اتنے زیادہ ملبوسات اور مردہ شاہی ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر ہمارا جی بولانے لگا۔ اور ہم گھبرا کر باہر نکل آئے۔

ہم نے زمین پہ آسمان دیکھا:

ٹرانٹو میں جو سب سے خوبصورت چیز دیکھی وہ ہے PLANETORIUM. پلینے ٹوریم دکھانے والوں نے تو ہمارے ساتھ یہ شرط لگائی تھی کہ یہ لوگ اس طرح رات اور آسمان کا سماں باندھتے ہیں کہ آپ کو فی الفور نیند آجائے گی فی الفور ہمیں نیند کبھی نہیں آئی اس لیے ہم نے ان کا چیلنج قبول کر لیا۔ پلینے ٹوریم کا پروگرام ہر دو گھنٹے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس لیے ہم بھی ٹکٹ لے کر شائقین کی لائن میں جا بیٹھے۔ یہ بلڈنگ انتہائی خوب صورت ہے۔ اوپر کی منزل میں ایک گول گنبد نما ہال ہے۔ اس تھیٹر ہال میں کوئی سٹیج نہیں ہے۔ اس کا سٹیج اس کی چھت ہے چھت آسمان جیسی بنائی ہوئی ہے اور اس قسم کی کرسیاں رکھی گئی ہیں جن پر سر ٹکا کے آدمی نیم دراز ہو جائے اور اپنی آنکھوں سے آسمانی مناظر دیکھنا شروع کر دے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم اپنی باری آنے پر اوپر ہال میں جا بیٹھے ... تھوڑی ہی دیر میں ہال کھچا کھچ بھر گیا اور پھر بتّیاں گل ہو گئیں پھر ایک دم چھت پر روشنی کے کوندے لپکنے لگے اور ساتھ کمنٹری بھی ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں انھوں نے ستاروں اور سیاروں کی اصلیت بتا دی۔ کہکشاں کا راز فاش کر دیا۔ افق اور شفق کے پیراہن اُتار ڈالے اور ساتھ ہی ساتھ سائنس کے مشہور و معروف موجدوں کی تصاویر بھی دکھائیں اور ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی بھی ڈالی۔ یہ پروگرام واقعی اتنا سحر انگیز اور معلوماتی تھا کہ ہم اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھے۔ یوں لگا کسی سیارے میں جا بیٹھے ہیں اور کسی دوسری دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔

جزیرۂ محبّت : CENTRAL ISLAND.

انٹاریو میں بے شمار جھیلیں ہیں جو گرمیوں کے موسم میں برف کے پگھلنے سے وجود میں آتی ہیں اور ٹرانٹو شہر کے اطراف میں پھیل جاتی ہیں۔ انہی میں سے ایک خوبصورت انٹاریو جھیل ہے۔ اس جھیل کے درمیان ایک جزیرہ ہے جسے خوبصورت تفریح گاہ بنایا گیا ہے.... اس تفریح گاہ کو سنٹرل آئی لینڈ کہتے ہیں۔ اس جھیل میں ایک فیری بوٹ چلتی ہے جو مسافروں کو لانے اور لے جانے کے لیے ہمہ وقت آتی جاتی رہتی ہے۔ ہم نے ٹکٹ خریدا تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہی ٹکٹ واپس آنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے..... دوسرے کنارے پر اترے تو وہاں خلقت ہی خلقت تھی۔ پورا جزیرہ پھولوں اور فواروں کی وادی لگ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں بطخوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ان کشتیوں میں صرف عاشق و معشوق ہی بیٹھ سکتے تھے کیونکہ بہت جُڑ کر

بیٹھنے سے دو بیٹھ سکتے تھے۔ جدھر جدھر نگاہ دوڑائی جوڑے ہی جوڑے نظر آئے یوں لگ رہا تھا اس جزیرے پر محبّت کی بارش ہو رہی ہے کیونکہ ہم نے بوڑھے بوڑھے جوڑوں کو بھی کلیلیں کرتے دیکھا.... بچے پانی کی دھاروں کے ساتھ کھیلتے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اس جزیرے کے اندر سرکاری ویگن چکر لگا رہی تھی جس پر لکھا تھا "فرسٹ ایڈ" ریستوران کے ساتھ ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا "گمشدہ بچوں کی اطلاع یہاں دیں"

ظاہر ہے کوئی شخص اگر تنہا اس جزیرے میں جا نکلے گا۔ تو کتنی دیر وہاں ٹھہر سکے گا؟ ——— ہم بھی شام ہونے سے پہلے لوٹ آئے!

سی۔این ٹاور :

سائنسی انکار کے مارے ہوئے ملک ٹاوروں کی دوڑ میں ہیں۔ ٹرانٹو میں آئے تو سُنا کہ اس وقت دُنیا کا سب سے اونچا ٹاور سی۔این ٹاور ہے۔ اصل میں یہ لوگ ٹاوروں کے بہانے آسمان کو چھُونا چاہتے ہیں اور پھر ہاتھ لگا کر ہتھیا نے کا گُر بھی تو اُنھی کو آتا ہے۔

ہم جوں جوں بلندی پر جائیں توں توں ہمیں خوف آتا ہے اور سی این ٹاور کی لفٹ تو شیشے کی ہے۔ صاف نظر آتا ہے شہر سے کتنی اونچائی پر جا رہے ہیں۔ زمین ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے۔ اچھے خاصے گھر گڑیا گھر بن جاتے ہیں.... انسان بونے دکھائی دیتے ہیں۔ سڑکیں نالیاں بن جاتی ہیں۔ ہم اتنے بہادر نہیں ہیں کہ بلندی کی طرف جاتے ہوئے ان نظاروں کو دیکھنے کا حوصلہ کر سکیں۔ اس لیے جونہی لفٹ والی کبوتری نے بٹن دبایا' ہم نے آنکھیں بند کر لیں۔ جب اوپر جا کر لفٹ رُکی تو ہم نے آنکھیں کھول لیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بلندی کی طرف پرواز کرنا بڑے حوصلے والوں کا کام ہے۔

اوپر چھت پر وہی عالم تھا جو ہر ٹاور کی چھت پر ہوتا ہے۔ جگہ جگہ دوربینیں لگی ہیں۔ دوربینوں کے ساتھ جوڑے لگے ہوئے ہیں۔ جوڑے شہر کو کم ایک دوسرے کے انداز زیادہ دیکھتے ہیں۔ ٹاور کے اوپر ایک ریستوران ہے۔ سیاحوں کی خرید و فروخت کے لیے دکانیں ہیں۔ سارا شہر آئینے کی طرح نظر آتا ہے یہاں ایک اور لفٹ لگی ہے جو ٹاور کے سب سے اونچے اور آخری حصے میں لے جاتی ہے۔ اس لفٹ میں دو یا چار اشخاص اوپر جا سکتے ہیں۔ ہم نے وہاں تک جانے کا حوصلہ کیا تھا مگر وہاں سے نیچے جھانکنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ اوپر جا کر نیچے دیکھنا عقلمندوں کا کام نہیں۔

کیسا لوما : CASA LOMA

ساحر لدھیانوی نے ایک شعر کہا تھا

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ٹرانٹو میں "کیسا لوما" ایک ایسا محل ہے جو کسی شہنشاہ نے نہیں بلکہ قسمت کے دھنی ایک عام آدمی نے بنوایا تھا۔ سر ہنری پلیئٹ کے آباؤ اجداد انگلستان سے کینیڈا آئے تھے۔ سر ہنری ابتدائے جوانی سے ہی اپنے باپ کے ساتھ کاروبار کرنے لگ گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ خاک کو بھی ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ انہی دنوں سر ہنری پلیئٹ کے دل میں ایک انوکھا، نرالا، عالی شان محل بنوانے کا خیال آیا۔ اس محل کی ابتدا ۱۹۱۱ء میں ہوئی اور ۱۹۱۴ء میں یہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کی تعمیر

میں نہ صرف یہ کہ کروڑہا روپیہ خرچ ہوا بلکہ ماہرینِ تعمیرات دوسرے ملکوں سے بھی بلوائے گئے۔ چاندی کی کٹلری، قالین اور فرنیچر یورپ سے آیا خوب صورت، دلکش پھولدان چین سے منگوائے گئے۔ دیدہ زیب دروازے اور کھڑکیاں اٹلی سے آئیں اور آرائش کا باقی سامان انگلستان سے منگوایا گیا۔

یہ پرشکوہ اور عالیشان محل ایک انسان کے خوب صورت خواب کی صورت میں آج بھی ٹرانٹو میں اسی طرح کھڑا ہے۔ یہ محل چونکہ ایک پہاڑی کے اوپر بنایا گیا ہے، اس لیے اسے "کیسا لوما" کہتے ہیں۔

یہ بالکل ویسا ہی محل ہے جیسا پرانے زمانے کے بادشاہوں کا ہوا کرتا تھا۔ وہی تہہ خانے، وہی راہداریاں، بارہ دریاں، کتب خانے، خفیہ سرنگیں، مطبخ، اصطبل، شاہی مہمان خانے، نہانے کے تالاب سبھی کچھ ہے یہاں۔ اس کے تہہ خانے میں ایک بہت بڑا شراب خانہ بھی ہے ... جہاں کئی سالوں کے لیے شراب جمع کر کے رکھی جا سکتی ہے۔ اس محل میں اٹھانوے کمرے ہیں جن میں سر ہنری پلیئٹ اور لیڈی پلیئٹ کے کمرے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن جب محل مکمل ہو چکا زمین کے سینے کی آبرو بن چکا تب سر ہنری کو پتہ چلا کہ یہ محل تو کبھی بادشاہوں کو راس نہیں آئے۔ اسے کیسے راس آ سکتا تھا

محل کے اپنے اخراجات کے علاوہ ٹیکس کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ سر ہنری کی حلال کی کمائی اس بوجھ کو نہ اٹھا سکی۔ یوں دنوں میں سر ہنری دیوالیہ ہو گیا سوچا تو اس نے یہ تھا کہ اپنے مرنے کے بعد اس محل کو اللہ کے بندوں کے لیے وقف کر جائے گا۔ مگر اپنے جیتے جی اسے یہ محل

حکومت کو دے دینا پڑا.... اور تب سے حکومت نے ٹکٹ لگا کے اسے سیاحوں کی آماجگاہ بنا چھوڑا ہے۔ امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ دنیا بھر کے سیاح اس محل میں دیکھے جا سکتے ہیں.... ہم نے جو کچھ سنا تھا، وہ دیکھنے گئے تھے۔ مگر جب ہر کمرے میں گھوم کے سر ہنری اور لیڈی پلیئیٹ کی ٹیپ شدہ آوازیں سنیں..... جن میں دونوں باری باری بتاتے تھے کہ انھوں نے کس تمنا سے یہ محل بنوایا تھا اور کس طرح کمرے کمرے کو سجایا تھا اور خیال میں کیا سوچیں تھیں اور پھر سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑا ـــــ تو گھومتے گھومتے ہمارے اوپر قنوطیت سی چھانے لگی۔ دنیا کی بے ثباتی اور بے مروتی نے سارے محل کو آگ لگا دی.... محل کے اک اک کونے سے ہمیں آہیں اور کراہیں سنائی دینے لگیں.... تب ہم گھبرا کر باہر نکل آئے۔ دور کھڑے ہو کر محل کے اداس گنبدوں کو دیکھا۔ ہر سو گہری اداسی کا پہرہ تھا۔ اندر سینکڑوں لوگ گھوم رہے تھے۔ پھر بھی آہٹوں میں زندگی کی حدت نہیں تھی۔ کئی موٹریں آ جا رہی تھیں مگر محل بیوہ کی صورت اجڑا اجڑا لگ رہا تھا.... اور ہمیں توں لگا یہ گنبد ہر آنے جانے والے سے کہتے ہیں ؎

دے لے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیاں ترستیاں ہیں

قسمت آزمائی :

کینیڈا کے لوگوں میں ایک دیوانگی دیکھی۔ جگہ جگہ لاٹریاں لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک ڈالر کا ٹکٹ ہے۔ جتنی مرضی لاٹریاں خرید لیں اور لوگ بڑی تمنا اور لگن سے لاٹری کا ٹکٹ خریدتے ہیں بلکہ بار بار خریدتے ہیں۔

ہم نے ایک مہربان سے پوچھا :

"یہ سچ مچ کی لاٹریاں ہوتی ہیں یا ہمارے ملک والا چکر ہے ؟"

اُس نے کہا "یہاں سب کچھ سچ مچ کا ہوتا ہے۔" پھر وہ سچ مچ ایک پاکستانی خاتون کو پکڑ کر لے آیا، گزشتہ سال جس کی پچاس ہزار ڈالر کی لاٹری نکلی تھی اور اب وہ ایک خوشحال خاتون تھی۔

ہمارے بہنوئی نے ہمیں مسکا لگایا کہ ہم بھی دس بارہ لاٹری کے ٹکٹ خرید لیں اور جاتی دفعہ انھیں دے جائیں تاکہ ان کی تقدیر بدل جائے۔ مگر ہم نے صاف انکار کر دیا اور کہا :

"ہمارے ہاں کسی دوسرے کی تقدیر بدلنے کا رواج بالکل نہیں ہے ہم جو چیز خود حاصل نہ کر سکیں۔ دوسروں کو بھی حاصل نہیں کرنے دیتے۔"

زندہ مقبرے :

پہلے پہل نوجوان نسل نے ضعیفوں کو بڈھا کہنا شروع کیا تو انھیں بہت طیش آیا۔ غصّے میں آپے سے باہر ہو گئے اور بولے :

"ہم کیوں بڈھے ہوں۔ بڈھی ہوں یہ نئی نسلیں اور سارے آئندہ پیدا ہونے والے بچّے...."

تب لوگوں نے انھیں سینئر سٹیزن SENIOR CITIZEN کہنا شروع کر دیا۔ کسی بھی تفریح گاہ میں چلے جائیں۔ ٹکٹ لینے کے لیے ہمیشہ تین کھڑکیاں نظر آئیں گی۔ عام لوگوں کی اور بچوں کی کھڑکی کے علاوہ تیسری کھڑکی پر سینئر سٹیزن لکھا ہوتا ہے۔ البتہ بچوں اور بوڑھوں کے ٹکٹ کی شرح ایک ہی ہوتی ہے....

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایک دن بیٹھے بٹھائے ہمیں خیال آیا کہ ان "عبرت کدوں" کی سیر کی جائے۔ اتفاق سے ایک پوپلی خاتون سے ہماری بہن کی صاحب سلامت تھی۔ اس لیے وہ ہمیں ایک سینئر سٹیزن ہوم SENIOR CITIZEN HOME میں لے گئیں۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ایک خزاں زدہ ٹنڈ منڈ خاتون چلی آرہی تھی۔ ہم نے جوش محبت سے فوراً کہا:

"بڑی بی سلام۔"

رک گئی۔ تنک کر بولی:

"میں کیوں ہونے لگی بڑی بی۔ بڑی بی تو سامنے والے کمرے میں رہتی ہے..."

ہم نے نظریں اٹھا کر سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خستہ حال ولائتی مرغی بیٹھی تھی جس کے بال و پر جھڑ گئے تھے۔ ہم کچھ سمجھے اور کچھ نہیں تو وہ بولی:

"میری عمر تو خیر سے ابھی صرف پچھتر برس ہے۔ اور وہ لنڈا بڈھی... وہ تو نوے سال کی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پوپلے پوپلے قہقہے لگانے لگی۔

سنا ہے ان کہولت خانوں میں بعض اوقات بڑے رومانی حادثات بھی جنم لیتے ہیں... ظاہر ہے کہ جب بوڑھوں اور بڈھیوں کو بے مہار چھوڑ دیا جائے گا تو کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا۔

ایک بار ایک نوّے سالہ بڈھے کا دل ایک اسی سالہ جھریوں دار پری پر آگیا۔ کافی دنوں تک ان کا ایک سرد سا کپکپاتا ہوا معاشقہ چلتا رہا.... پھر وہ

سوختۂ تن یک جان دو قالب ہونے کو مچل اُٹھے۔ ان کی شادی کا دن کیا مقرر ہوا، اس سرد خانے میں ایک گرم سی لہر دوڑ گئی۔ خوب دھوم دھام سے شادی ہوئی، سارے بڈھوں اور بڈھیوں نے بڑی بی کو ڈھیر ساری دوائیں دے کر رخصت کیا بلکہ کئی رازدار سہیلیاں تو لرزہ براندام دُلہن کو سہارا دے کر حجلۂ عروسی تک بھی لے گئیں۔

مگر سنا ہے دونوں کی شب عروس اپنے اپنے سپیئر پارٹس SPARE PARTS الگ کرنے ہی میں بیت گئی۔

جس وقت ہم گھوم پھر کر اس عبرت کدے کو دیکھ رہے تھے، ہمیں برابر مرزا حوادث بیگ یاد آرہے تھے.... مسز مارکھنی سے جان چھوٹی تو یہ مرزا حوادث بیگ اعصاب پر سوار ہو گئے... کہتے تھے:

انسانی عمر کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کی عمر صرف چالیس سال مقرر کی۔ بندے نے سنا تو زار و قطار رویا اور بولا: چالیس میں تو بمشکل ایک شادی کی سمجھ آتی ہے پاس ہی ایک گدھا بیٹھا سن رہا تھا۔ اس نے جو انسان کی آہ و زاری سنی تو بولا:

"بھائی! روتے کیوں ہو۔ دس سال میری عمر کے لے لو۔ میں تو اپنی زندگی سے عاجز آچکا ہوں... یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ صبح و شام بوجھ اٹھانا اور ہنہنانا...."

انسان نے خوشی خوشی گدھے کی زندگی سے دس سال لے لیے۔

لیکن یہ دس سال لے کر بھی انسان مطمئن نہیں ہوا۔ ایک دن پھر بیٹھا اپنی کم عمری کا گلہ کر رہا تھا کہ ایک کتے کا وہاں سے گزر ہوا۔ اُس نے کہا:

"بھائی کیوں اتنا پریشان ہو رہے ہو، دس سال میری عمر کے لے لو۔

FREEURDUBOOKS.BLOGSPOT.COM

جب سے دنیا کی حقیقت مجھ پر واضح ہوئی ہے، میرا زیادہ جینے کو جی نہیں چاہتا
انسان نے کتے کی عمر کے دس سال بھی لے لیے....

اور کچھ عرصہ بعد جب اسے پتہ چلا کہ دنیا میں ساٹھ سال کی عمر کے آدمی کو ریٹائر کر دیا جاتا ہے یعنی عضو معطل سمجھ کے اس کے ہاتھ میں موت کا پروانہ دے دیا جاتا ہے۔ تو وہ پھر گڑگڑانے لگا۔

اس بار اس کی فریاد ایک اُلو سُن رہا تھا۔ اسے انسان پر بڑا ترس آیا۔ کہنے لگا۔ تیری خاطر تو یہ دنیا بنائی گئی ہے۔ تجھے اس میں زیادہ سے زیادہ رہنے کا حق ملنا چاہیے۔ اس لیے میری عمر کے بھی دس سال تو لے لے۔
سو انسان نے آخری دس سال اُلو سے لے لیے۔

پھر ہمارے ہونق چہرے کی طرف دیکھ کر مرزا حوادث بیگ قہقہہ لگاتے اور کہتے:

کیا سمجھیں....؟ مگر کیا سمجھ سکو گی....؟ انسان کی خوب صورت عمر بس چالیس سال تک ہی رہتی ہے۔ چالیس سے پچاس سال تک وہ محض بوجھ اٹھانے والا گدھا بنا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ عمر اس نے گدھے سے مستعار لی تھی۔
پھر پچاس سال سے لے کر ساٹھ سال تک وہ محض بھونکتا رہتا ہے۔ گھر میں اس کی کوئی نہیں سُنتا کیونکہ عمر کا یہ حصّہ اس نے کتے سے لیا تھا۔ اس کے بعد تو بس اُلو کی عمر شروع ہو جاتی ہے۔ ساٹھ سے ستّر سال تک دن کو اونگھتا ہے اور راتوں کو جاگتا ہے۔ کوئی قریب نہیں پھٹکتا.... کوئی عزیز نہیں جانتا.... اپنا وجود دنیا میں ایک بوجھ نظر آنے لگتا ہے۔

نگری نیاری نیاگرہ کی:

اگر کوئی شخص کینیڈا آئے اور نیاگرہ فال نہ دیکھنے جائے تو اسے بیوقوف کہا جاتا ہے..... ظاہر ہے کون بے وقوف کہلانا پسند کرتا ہے۔ ایک دن ہم نے اعلان کر دیا کہ نیاگرہ فال دیکھے بغیر امریکہ واپس ہرگز نہ جائیں گے۔ چنانچہ لوگوں کو اچانک ہمارے واپس بھیجنے کی تدبیر سوجھ گئی۔ اگلے ویک اینڈ پر محترم دوستوں کی ٹولی کے ساتھ نیاآگرہ جانے کا معاملہ ٹھہر گیا۔

نیاآگرہ شہر ٹرانٹو شہر سے تقریباً نوے میل دور ہے۔ نہایت خوبصورت راستہ ہے اور راستے میں نظر کو لبھانے والی بے شمار چیزیں ہیں۔ اس پورے راستے میں جگہ جگہ پکنک سپاٹ بنے ہوئے ہیں جہاں بیٹھ کر اطمینان سے کھایا پیا جا سکتا ہے۔ ایک چپ چاپ سا دریا دھیرے دھیرے وادیوں میں بہتا رہتا ہے۔ ہم اس دریا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے..... دریا پہاڑوں کے بیچوں بیچ لیٹا تھا جس طرح سانپ نے انسانی آوازیں سن کر دم سادھ لیا ہو۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس دریا کے اُس پار جو آہنی پہاڑوں کے سلسلے ہیں، ان کی دوسری طرف امریکہ ہے۔

امریکہ اور کینیڈا نیاآگرہ کی سرحد پر اجنبیوں کی طرح ملتے ہیں یہ سرحدیں جہاں جہاں ملتی ہیں، وہاں وہاں دوستی کو کاٹ کے رکھ دیتی ہیں۔ وگرنہ امریکہ اور کینیڈا کے باسیوں میں مماثلت بھی ہے اور مشابہت بھی....

نیاآگرہ شہر میں داخل ہوتے ہی قدرت بے نقاب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ قدرتی حسن کا خیال رکھتے ہوئے اس شہر کو اور بھی حسین بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

PUNJISTAN.BLOGSPOT.COM

راستے میں چھوٹے چھوٹے بے شمار گاؤں ہیں جنھیں جدید آسائشوں سے مزیّن نہیں کیا گیا بلکہ ان کی قدرتی خوبصورتی کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ اس گاؤں میں پھلوں اور سبزیوں کے بے شمار باغات ہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہو جاتا ہے کہ ہر گھر کے باہر، سڑکوں کے کنارے تازہ پھلوں اور تازہ سبزیوں کو خوب صورت ٹوکریوں میں سجا کے رکھ دیا جاتا ہے اور اوپر قیمت کی چٹیں لکھ دی جاتی ہیں۔ مسافر اور راہگیر آتے جاتے ہوئے یہ خوش رنگ پھل اور صحتمند سبزیاں خرید کر لے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض گھروں کے باہر تو بورڈ آویزاں ہوتے ہیں کہ آپ اندر آئیں اور اپنی مرضی سے باغ میں سے پھل توڑ کے لے جائیں۔ گاؤں کے سارے گھر پھولوں اور درختوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ مکان جتنے باہر سے خوب صورت دکھائی دیتے ہیں، اندر سے اتنے ہی صاف ستھرے اور دیدہ زیب ہیں اور مکینوں کی خوش ذوقی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

بجلی کا گھنٹہ گھر:

نیا آگرہ شہر میں دریا کے کنارے بجلی کا ایک گھنٹہ گھر ہے جسے کینیڈا کے بڑے بڑے انجینئروں نے زمین کے سینے پر بنایا ہے۔ اس کے اردگرد ایک مصنوعی جھیل بنا دی گئی ہے اور جھیل میں کنول کے اصلی پھول کھلتے ہیں۔ یہ کلاک خودکار ہے اور ہمیشہ زمین کے سینے پر پڑا یوں حرکت کرتا رہتا ہے جیسے طفلِ شیر خوار ماں کی چھاتی سے لپٹ کر کلیلیں کر رہا ہو۔ یہاں ہمہ وقت شائقین کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ خصوصاً چھٹی کے روز یہ جگہ ایک بہت بڑی تفریح گاہ کا روپ دھار لیتی ہے۔ جگہ جگہ خوش رنگ پھولوں کے تختے ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ اس کلاک کے اطراف بیٹھ کر تصویریں کھنچواتے

ہیں۔ فوّارے میں پانی پھینکتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ عجیب بات ہے۔ یہاں پانی میں سکّے پھینکنے کا بہت رواج ہے۔ جس طرح ہمارے لوگ مزاروں پر جا کر کبوتروں کو دانہ ضرور ڈالتے ہیں یا دانہ ڈالنے کو نیک شگون سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں ہم نے دیکھا.... جہاں کسی پبلک تفریح گاہ میں فوّارہ نصب تھا یا تالاب بنایا گیا تھا، لوگوں نے اس کے اندر بے تحاشا سکّے پھینکے ہوئے تھے اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ کوئی راتوں رات ان سکّوں کو نکال کر نہیں لے جاتا۔ یہ سکّے دنوں، مہینوں.... سالوں، صدیوں دل کی ناآسودہ تمناؤں کی طرح تالاب کے جگر میں پڑے رہتے ہیں۔

سُہاگ رُت، سُہاگ رات....!

یوں تو چھٹی کے روز کینیڈا اور امریکہ کے شہری جوق در جوق نیا آگرہ شہر کی جانب رُخ کرتے ہیں لیکن ہم نے ہر چار قدم پر پھولوں اور ہاروں سے سجی ایک موٹر دیکھی تو اپنے میزبانوں سے استفسار کر ہی لیا کہ دوستو! یہ دولہا دُلہن کی طرح سجی موٹریں کس طرف جا رہی ہیں اور کیا آج شادیوں کا دن منایا جا رہا ہے؟ تب ہمارے میزبانوں نے ہمیں بتایا:

یہاں بھی شادی کے موقع پر اچھے شگون لیے جاتے ہیں۔ عاشق و معشوق جب ایک دوسرے کو شادی کے بندھن میں باندھ لیتے ہیں تو سیدھے اس جگہ کا رُخ کرتے ہیں۔ یہاں سرِ راہ ایک خوب صورت مقام ہے۔ ہر شادی شدہ جوڑا اس جنّتِ ارضی میں پہلا قدم رکھتا ہے۔ تصویریں اتروا تا ہے۔ فضاؤں سے دعائیں لیتا ہے اور پھر اپنے مرکز کی طرف مائل بہ پرواز ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر نو بیاہتا جوڑے ہنی مون منانے کے لیے نیا آگرہ شہر میں جاتے ہیں لیکن جانے سے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پہلے پھولوں کی اس نگری سے اشیر باد ضرور لے کر جاتے ہیں۔

ہم نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ ہمیں ازدواجی شکنجے میں جکڑے ہوئے عرصۂ دراز ہو گیا ہے۔ پھر بھی ہمیں اس ہوش رُبا وادی کی سیر ضرور کرائیے جہاں وصال کی رات چھائی رہتی ہے اور محبتوں کا میغہ برستا ہے۔

چنانچہ ہم نے اپنی موٹر ایک پھولوں والی کار کے پیچھے لگا دی جس کے عین پیچھے لکھا تھا: JUST MARRIED

ایک خوب صورت باغ نما عمارت کے باہر بے شمار پھولوں والی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہر موٹر پر پھولوں کی سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ بعض موٹروں پر تو پھولوں کی تر و تازہ پتیوں سے دولہا دلہن کے نام بھی لکھے تھے۔

پہلے ہم نے جی بھر کے موٹروں کا نظارہ کیا۔ پھر اندر کو قدم بڑھائے۔

اس عمارت کے گیٹ پر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا SCHOOL OF HORTICULTURE ہم نے گھور کر اپنے میزبانوں کو دیکھا اور خفگی سے کہا "یہ تو مالیوں کی تربیت گاہ لگتی ہے۔ آپ نے تو اس جگہ کا نقشہ ایسے کھینچا تھا جیسے ہم زمین پر بہشت دیکھنے جا رہے ہیں؟"

"اجی! یہ جھگڑے کا وقت نہیں ہے، ادھر ذرا حور و غلمان تو دیکھیے۔"

ہمارے ایک میزبان نے ہماری توجہ ادھر پھیر دی اور ہم بھی ساری خفگی بھول گئے۔

پھولوں کے ایک انتہائی خوب صورت جھنڈ میں تر و تازہ سی عروسِ نو نوشہ میاں کا ہاتھ تھامے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے اردگرد پھول بردار نوعمر لڑکیوں کا گلدستہ کھڑا تھا اور ایک فوٹو گرافر تصویر اتار رہا تھا۔ پھر تو ہم نے ایسے مناظر جا بجا دیکھے....

واقعی اندر جا کر ہم آنکھ جھپکنا بھول گئے۔ وہاں دنیا بھر کے حسین پھولوں کے تختے تھے اور ہر گوشے میں دولہا دلہن کو کھڑے پایا۔ یہاں دستور ہے کہ گلابی کپڑوں میں ملبوس نوعمر لڑکیاں پھولوں کے گلدستے اٹھا کر دولہا اور دلہن کے ساتھ چلتی ہیں۔ غرض عجیب روح افزا منظر تھا۔ ایسے لگتا تھا کینیڈا اور امریکہ کا سارا حسن یہاں اکٹھا ہو گیا ہے.... دلہنوں سے حسین وہ نوعمر لڑکیاں تھیں جو گلابی کپڑوں میں ملبوس پھول تھامے ہوئے ان کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں.... سارے باغ میں سہاگ رُت چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا یہاں سدا جوانی کا موسم رہتا ہے.... پھولوں سے وصل کی خوشبو آتی ہے.... روشیں دعاوے رہی ہیں.... فواروں سے پانی کی جگہ خوشبو نکل رہی ہے۔

یہاں صرف ایک موسم رہتا ہے پیار کا موسم.... محبت کا موسم.... رفاقتوں کا موسم....

اور ہمیں اپنے آپ سمجھ گئی کہ سہاگ رات منانے سے پہلے یہ دیوانے مستانے اس سہاگ رُت سے دعا لینے کیوں آجاتے ہیں؟

خواہشوں کا کنواں:

لیجیے اسی عمارت کے اندر گھومتے پھرتے ہوئے ہمیں ایک بند ڈھکن والا کنواں نظر آ گیا۔ جس کے باہر لکھا تھا: WISHING WELL

یہاں تو وہ لوگ آتے ہیں جن کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا ہے:

"سب کچھ خدا سے مانگ لیا تم کو مانگ کر"

لیکن شاید اس کے بعد بھی بہت کچھ مانگنے کی حاجت رہ جاتی ہے۔ دراصل انسان اس دنیا کا سب سے بڑا بھکاری ہے۔ مانگنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ ذرا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اسے مانگنے کا موقع دیجیے۔

ممکن ہے دولہا دُلہن جاتے جاتے یہاں چاند سے منے کی دُعا مانگ کر جاتے ہوں۔ عورت کے بارے میں ہم اتنا جانتے ہیں کہ محبُوب کو پا لینے کے بعد بھی اس کے اندر ہمیشہ ایک ہی خواہش اُبلتی رہتی ہے اور زندگی بھر اسی ایک سوال کے گرد طواف کرتی رہتی ہے ؎

پھر سے کہہ دے کہ تیری منزلِ شوق
میرا دل ہے میری صورت تو نہیں!

ہمارے میزبانوں نے ہمیں گہری سوچ میں مگن دیکھ کر کہا:

"سکّہ ڈالیے اور کوئی دُعا مانگیے...؟"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں کنوؤں سے مانگنے کا رواج نہیں۔ ہمارے ہاں لوگ سکّہ ڈال کے پیروں فقیروں سے مانگتے ہیں۔"

وہ بولے:

یہ پانی کے فوارے... گندے تالاب اور اندھے کنوئیں ان کے پیر فقیر ہوتے ہیں... ذرا آپ انھیں بھی تو آزمائیں۔ ان میں کتنا پانی ہے۔ (یہ کتنے پانی میں ہیں) ہم نے بادلِ نخواستہ ایک سکّہ کنوئیں میں پھینکا اور آنکھیں بند کر کے نہایت خشوع و خضوع سے ایک خواہش کا اظہار کیا۔

(جو آج تک پوری نہیں ہوئی)

آسمانی جھولا: WHIRL POOL

یہ دریا جو ہمارے ساتھ ساتھ وادیوں اور پہاڑوں سے گزرتا چلا آرہا تھا یہاں آکر تند اور تیز ہو گیا تھا۔ یہاں اس کا پانی سرمئی سیاہ ہو گیا تھا اور اس سیاہ

پانی کے دہانوں پر شور مچاتا ہوا سفید جھاگ پانی کے مزاج کا پتہ دے رہا تھا۔

راستہ بھر ہم نے اس پانی کے ساتھ لوگوں کو آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا تھا۔ کہیں شائقین کانٹا لگائے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے... کہیں فیری بوٹ اور کہیں موٹر لانچیں چل رہی تھیں۔ کسی کنارے پر لوگ ذاتی کشتیاں اور شکارے لیے بیٹھے تھے اور کسی مقام پہ پانی پر سکیٹنگ کر رہے تھے۔

لیکن یہاں ایک مقام پر برقی تار گزاری گئی تھی۔ اس دریا کے ایک کنارے پر کینیڈا ہے اور دوسرے کنارے پر امریکہ ہے۔ سامنے امریکہ کی پہاڑیاں اور امریکہ کے مسافر نظر آرہے تھے۔ شائقین ٹکٹ لے کر اس AERO CAR میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جو پندرہ منٹ میں انھیں امریکہ کی حدود میں بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے اتار دیتی ہے۔ مگر مسافران حدود سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس پہاڑی پر ایک ریستوران ہے اور سیاحوں کے لیے ایک گفٹ شاپ ہے۔ بس وہیں سے کھا پی کر مسافروں کو واپس آنا ہوتا ہے۔

لیکن ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے اُوپر سے بجلی کے جھولے میں گزرنا دل گردے کا کام ہے۔

ہم تو ایسے موقعوں پر اکثر سوچتے رہتے ہیں۔ اگر میانِ راہ بجلی بند ہو گئی تو کیا ہوگا....؟

اور جو اچانک بند نہ ہو ہمارے ہاں اسے بجلی نہیں کہتے۔

آبشارِ رُوح پرور:

اس میں شک نہیں کہ نیاگرہ کی مشہور و معروف آبشار کو دیکھ کر مُردہ تن میں جان آجاتی ہے اور بے اختیار دھیان خالقِ کائنات کی طرف چلا جاتا ہے کتنا بڑا اصناع ہے وہ.... اور کتنی حسین کائنات تخلیق کی ہے اُس نے...؟

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

نیاگرہ کی یہ آبشار خدا کی اتنی بڑی خدائی میں اس کے حسن و جمال کا ننھا سا ظہور ہے۔

جہاں آبشار گرتی ہے وہاں لوہے کا ایک مضبوط جنگلہ بنا دیا گیا ہے مگر چھٹی کے روز اس جنگلے کے گرد اتنی خلقت ہوتی ہے کہ آگے بڑھ کر دیکھنا محال ہوتا ہے۔ دُور دُور حدِ نظر تک سبز پانی پھیلا ہوا ہے۔ جانے یہ پانی کہاں سے ابل رہا ہے۔ مگر زمین کی گود پر یوں پڑا ہے جیسے زمین کی گود سے دودھ کی نہریں پھوٹ رہی ہوں۔ سارے کا سارا پانی دور سے سبز مخملیں نظر آتا ہے۔ شاید پانی کے اندر پتھروں پر سبز کائی جمی ہے۔ سبزہ اُگا ہوا ہے یا زمرد کے ٹکڑے بچھائے گئے ہیں۔ دُور سے بڑے سکون سے آتا ہوا پانی قریب آکر اس قدر زور و شور سے آبشار کی صورت گرنے لگتا ہے کہ ہزاروں نغمے ایک ساتھ جاگ اُٹھتے ہوں گرتے وقت آبشار کی دھاریں رنگ بدلتی ہیں۔ کبھی سفید براق کبھی سبز زمرد کبھی نیلی آسمانی کبھی نارنجی اگر سورج نکلا ہوا ہو تو اس کی روشنی میں مزید رنگ منعکس ہونے لگتے ہیں اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ ہی آپ اس آبشار کے اوپر ایک قوس و قزح بن جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک کی بجائے کئی رنگ برنگی پینگیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ آبشار کی آغوش میں دھنک رنگوں کی یہ محراب قدرت کا انمول کرشمہ نظر آتی ہے۔

آبشار نیم بیضوی شکل میں گرتی ہے، جس طرح گھوڑے کا سُم ہوتا ہے اس لیے اس جگہ کو "ہارس شوفال" بھی کہتے ہیں۔ پانی شور مچاتا ہوا اتنی تندی سے نیچے گرتا ہے کہ اس کے چھینٹے ننھے منّے موتیوں کا مینہ بن کر دُور دُور تک برستے ہیں اور اکثر ریلنگ پر جھکے ہوئے لوگ شرابور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے لوگ یہاں برساتیاں پہن کر آتے ہیں جہاں آبشار کی دھار گرتی ہے۔ اس گہرائی سے ہمیشہ سفید دودھیا بوندوں کا ایک گولہ آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان کے سارے بادل آکر آبشار کی گود میں گھس گئے ہوں اور اب وہاں سے زبردستی نکالے جا رہے ہوں۔ ٹرانٹو کی طرف سے نظر اُٹھا کر دیکھیں تو سامنے امریکہ کی سرزمین نظر آتی ہے۔ امریکہ کے حصے میں آبشار کا ایک چوتھائی حصہ آیا ہے جو ساری آبشار کے مقابلے میں کم تر نظر آتا ہے۔ اصل حسن تو قدرت نے فیاضی سے کینیڈا والوں کی گود میں انڈیل دیا ہے۔ آبشار کا دہانہ بہت بڑا ہے اور سنا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ یہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اب بھی امریکہ والے حصّے کی زمین کافی مُجھر بُھری ہو چکی ہے جس کے بارے میں گمان ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ حصّہ بھی آبشار کے دہانے میں شامل ہو جائے گا۔

دور دور تک پانی کی پھیلی ہوئی چادر میں ایک جزیرہ بنا ہوا ہے جو امریکہ کی طرف ہے۔ یہ صد جلوہ آبشار ہے۔ صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے اس کا نظارہ ہی اور ہوتا ہے جیسے یہ دودھ کی نہر بن گئی ہو دوپہر کو اس پر مختلف موسموں کے رنگ آٹھہرتے ہیں۔ سورج جوں جوں بلندی پر جاتا ہے یہ اس کی شعاعوں کے ساتھ رنگوں کا سفر کرتی ہے اور شام کو جب سورج شفق رنگ ہو جاتا ہے، اس پر دھنک کے سارے رنگ فدا ہونے لگتے ہیں لیکن رات کو اس کی سج دھج دید کے قابل ہوتی ہے۔

ایک مناسب فاصلے سے اس آبشار پر روشنیوں کے ذریعے مصنوعی رنگ پھینکے جاتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے ساری آبشار سُرخ خون میں نہا جاتی ہے پانی سُرخ ہو جاتا ہے نہریں غازہ لگا لیتی ہیں بوندیاں گلابی ہو جاتی ہیں سارا ماحول زعفرانی اور گلابی ہو جاتا ہے یکایک گلاب پر سبزہ اتر آتا ہے اور پانی سمیت ہر شے سبز ہو جاتی ہے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ابھی آپ کی آنکھیں سبزے کا غسل لے رہی ہوتی ہیں کہ پانی کروٹ لے کر نارنجی ہو جاتا ہے.... ماحول سے شفق پھوٹنے لگتی ہے.... اور پھر اگلے لمحے آبشار کاسنی لبادہ اوڑھ لیتی ہے.... چاروں طرف کاسنی پھولوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ابھی لوگ کاسنی پھولوں سے دامن بھر رہے ہوتے ہیں کہ پوری آبشار زرد سونے کی ہو جاتی ہے.... پانی پیلا.... لہریں پیلی.... ایسے میں پورے ماحول پر کسی طلسم کدے کا گمان ہوتا ہے۔

ہاں یہ طلسم کدہ ہی ہے۔ یہاں ایک انوکھی اور نرالی دنیا آباد ہے۔ دن رات سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ چھٹی کے روز ان میں سارے بے فکرے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ محاورہ صادق آتا ہے کہ یہاں کھوّے سے کھوّا چھلتا ہے۔ اس نظارہ گاہ کو اور بہت سی تفریح گاہوں سے سجایا گیا ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا اور کشادہ بازار ہے۔ بازار کے اردگرد لاتعداد فلک بوس ہوٹل اور ریستوران ہیں۔ بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں۔ جا بجا اونچے اونچے ٹاور سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہر قدم پر ایک عجائب خانہ ہے.... بچوں کے لیے تفریحی کھیل اور بجلی کے جھولے ہیں۔ ایک عجیب و غریب ٹرین چلتی ہے جو مسافروں کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر لاتی ہے.... عجیب و غریب چیزیں چھاپنے والے بیٹھے ہیں۔ اپنے بارے میں کوئی سی ہیڈ لائن لگوا لیجیے۔ کمپیوٹر سے تصویریں بنائی جا رہی ہیں اور ہاں.... جس چیز نے ہمارے قدم پکڑ لیے..... وہ بھنی ہوئی مکئی کی خوشبو تھی.... چلتے چلتے یوں لگا جیسے وطنِ عزیز کے کسی گاؤں میں جا پہنچے ہیں۔ کیونکہ فضاؤں میں مکئی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ غور کیا تو وہ ساری گلی مکئی بھوننے والوں کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ لوگ بجلی کی خودکار مشینوں کے ذریعے مکئی کے دانے بھون کر لفافوں میں بند کر کے بیچ رہے تھے۔

ہم نے جب تک ایک لفافہ خرید نہ لیا۔ آگے جانے کے قابل نہ ہوئے۔

آبشار کے جگر میں ایک موٹر لانچ بھی چلتی ہے جس میں دل گردے والے جا بیٹھتے ہیں اور آبشار کے اوپر ہمہ وقت ایک ہیلی کاپٹر چکر لگاتا رہتا ہے تاکہ کسی حادثے کی صورت میں فوراً مدد پہنچائی جا سکے۔

رات گئے تک اس نگری میں گھومتے پھرتے ہوئے یوں لگ رہا تھا۔ ہم سچ مچ کسی الف لیلوی دیس میں آ گئے ہیں۔ جس کو دیکھو وہی مست اور مگن نظر آ رہا تھا۔ کوئی جگہ اللہ کی مخلوق سے خالی نہ تھی۔

عجائب خانوں کی بھول بھلیاں :

نیاگرہ چوک تو ہمیں عجائب خانوں کی بھول بھلیاں نظر آیا۔ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے، کسی نہ کسی عجائب گھر کا بورڈ نظر آتا جس کو بھیانک اور خوف ناک شکلوں کے ساتھ مزین کر کے قابلِ توجہ بنایا گیا تھا۔ یہاں موم کے عجائب گھر ہیں... شیشے کے عجائب گھر ہیں.... تصاویر کے عجائب گھر ہیں اور بتوں سے مزین کیے گئے عجائب گھر بھی ہیں۔ عجائب گھروں کے اندر جانے کے لیے باقاعدہ ٹکٹ لینے پڑتے ہیں۔ ہم نے بڑی دیانت داری سے ایک ایک عجائب گھر کو دیکھا۔ کیونکہ ہم آج دیکھنے کو نکلے تھے۔

آبی رقاصائیں :

اس زرق برق چوک میں موسیقی کی دلکش آواز پر لوگوں کو ڈھیر ہوتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دیکھا تو ہم بھی اس طرف چل دیے۔ کیا دیکھا کہ پھولوں بھرے ایک چھوٹے سے قطعے میں فوارے نصب ہیں اور موسیقار صف باندھے کھڑے کوئی جانسوز سی دھن بجا رہے ہیں اور پانی کے فوارے اس دھن پر رقص کر رہے ہیں۔ لوگ ہیں کہ انھوں نے اپنی سانسیں روک رکھی ہیں بعض اوقات کسی انوکھی دھن کے ساتھ پانی کے نازک فوارے اس طرح کمر لچکاتے کہ گمان ہوتا یہ لچکیلی کمریں ابھی کسی نازنین مہ وش کا روپ دھار کر کھڑی ہو جائیں گی۔ پانی کی لچک اور ادائیں بالکل پیشہ ور رقاصاؤں والی ہی تھیں اور اس جادو کی نگری میں کیا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے بھی دوسروں کی طرح سانس روک رکھی تھی مگر آنکھیں کھلی تھیں۔

ماہی خانہ :

ایک بہت بڑا ماہی خانہ ہے یہاں ہمیں ماہی خانے سے بالکل دلچسپی نہیں ہے کیونکہ ہمیں پھنسی ہوئی مچھلی اچھی نہیں لگتی۔ مگر ہم جب بھی اس ماہی خانے کے آگے سے اتفاقاً گزر جاتے اس کے بورڈ پر رقص کے ایک پروگرام کا نقشہ دیکھتے بالآخر اس نقشے نے ہمارے تجسس کو ہوا دی اور ہم ٹکٹ لے کر آدھا گھنٹہ پیشتر ہی اندر جا بیٹھے۔ اندر وہی ماحول تھا جو کسی بھی ماہی خانے کا ہوتا ہے۔ شیشے کے گھروندوں میں خوب صورت اور دیدہ زیب مچھلیوں کو قید کر کے رکھنے والا....

یکایک سب سے پہلے اوپر والی چھت پر ہمیں ایک تالاب نظر آ گیا۔ یہ تالاب بیضوی شکل کا تھا۔ اس کے اندر سفید پانی بہت دلکش لگ رہا تھا اور اس کے اردگرد کرسیاں لگی ہوئی تھیں معلوم ہوا کہ اسی تالاب میں محیر العقول رقص پیش

کیا جائے گا۔

ہم وہاں براجمان ہو گئے۔

عین وقت پر ایک خاتون اپنے ریشمی بدن پر بکنی چپکائے پانی کا فوارہ ہاتھ میں پکڑے نمودار ہوئی۔ پہلے اس نے چاروں طرف گھوم کر فوارے سے تالاب کی شیشے کی کھڑکیاں صاف کیں۔ شیشوں پر پانی پھینکتے وقت اس نے خوب گھوم پھر کر اپنا آپ دکھایا اور انتظار کرنے والوں کے دل کو گرمایا۔ پھر اس کے بعد اس نے اپنی مترنم آواز میں اعلان کیا کہ ابھی جو پانی کے اندر رقص پیش کیا جائے گا، وہ تیراکی کی ماہر لڑکیاں پیش کریں گی۔ اس پر مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے دل بھی دھڑک اٹھے۔

پھر اس کے فوراً بعد پھرتیلے اور لچکیلے جسموں والی چھ بلوریں لڑکیاں آگے پیچھے نمودار ہوئیں اور چھنک سے پانی میں کود گئیں۔ سارا پانی شدتِ جذبات سے گلابی ہو گیا۔ بیک گراؤنڈ میں مدھر موسیقی شروع ہو گئی اور ماہی صفت نوعمر لڑکیاں پانی کے اندر تھرکنے لگیں۔ اگر یہ قیامت خیز رقص خود مچھلیاں دیکھ لیتیں تو کب کا پانی کو الوداع کہہ کے جا چکی ہوتیں۔

ٹاوروں کا جنگل :

نیاگرہ کا یہ چوک ٹاوروں کا جنگل نظر آتا تھا۔ جس طرف نظر اٹھائیں کوئی ٹاور دعوت نظارہ دے رہا ہے جدھر دیکھیں ٹاوروں پر خلقت کا ہجوم ہے۔ کوئی کسی شکل کا ٹاور کوئی کسی ہیئت کا ٹاور لفٹیں اوپر جا رہی ہیں۔ لفٹیں نیچے آ رہی ہیں ... اوپر وہی ماحول دوربینیں نصب ہیں ریستورانوں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سے خوشبو آرہی ہے.... گفٹ شاپس پر خلقت کا ہجوم ہے۔

یہاں سب سے بلند ٹاور "پینوسانک ٹاور" PANO SONIC TOWER ہے۔ اس ٹاور کی چوٹی سے امریکہ اور کینیڈا کے قریبی شہر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

وہاں کھڑے ہو کر ہم نے سوچا۔ کیسے جیالے لوگ ہیں۔ اللہ نے جو خوب صورت نعمتیں ان کو عطا کی ہیں، ان کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ خوبصورتیوں کو نکھارنا چاہتے ہیں۔ خوبصورت موسموں کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ دلفریب مناظر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ دل و نگاہ کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ قدرتی حسن کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ شاید اسی لیے قدرت ان پر مہربان رہتی ہے... اس بھیگی رات میں جب ہمارے جذبات پر اوس پڑنے لگی تو ہم نے واپس جانے کی ٹھانی۔

واشنگٹن کو واپسی :

کہتے ہیں ہر شے اپنے مرکز کی طرف واپس آتی ہے۔ گو ہمارا مرکز واشنگٹن نہیں تھا مگر ہمیں واشنگٹن ہی کے راستے اپنے مرکز کی طرف لوٹنا تھا۔ یوں بھی ہم نے واشنگٹن سے آتے وقت فخر بھابی سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان جانے سے پہلے کچھ دن سکون کے ساتھ ان کے ساتھ رہیں گے۔ پچھلی مرتبہ واشنگٹن قیام کے دوران ہم نے ان کے گھر کو سرائے بنا رکھا تھا۔ کبھی آرہے ہیں اور کبھی جا رہے ہیں۔ اس لیے اب وعدے کے مطابق وہاں جانا بھی ضروری تھا۔

جانا تو ہم نیویارک بھی چاہتے تھے۔ نیویارک میں ہماری ایک بہت پیاری سہیلی رہتی ہے.... جسے ہمیں اپنے پاس بلانے کا بڑا ارمان تھا اور اب ہم جس دن سے امریکہ آئے تھے، اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ پتہ نہیں اس نے گھر بدل لیا تھا یا ٹیلی فون نمبر بدل لیا تھا یا ارادہ بدل لیا تھا... یکایک ہماری سہیلی نیویارک میں کھو گئی تھی اور ہم اسے بسیار کوشش کے باوجود تلاش نہ کر سکے تھے۔ کبھی کبھی ہجوم میں لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں.... بچھڑ نہیں جاتے.... ایک دوسرے کے آس پاس کہیں کھڑے ہوتے ہیں.... بس ذرا سی دیر کو رُخ بدل جاتا ہے اور وقت کا پہیہ گھوم جاتا ہے.... اور پھر ذرا بھیڑ چھٹتی ہے تو ایک دوسرے کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے.... ہم ہمہ وقت بھیڑ چھٹنے کے انتظار میں رہے۔ اپنا آخری ہفتہ ہم نے نیویارک میں گزارنے کے لیے بچا لیا تھا... لیکن جب اپنی سہیلی کا اتہ پتہ نہ معلوم کر سکے تو سوچا یہ ہفتہ فخر بھابی کی نذر کر دیں۔

چنانچہ اپنی بہن سے اجازت طلب کی.... یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا جس سے بہرحال گزرنا تھا۔ پردیسیوں کو تو جانا ہوتا ہے۔ رخصت ہونے کا وہ منظر آج بھی یاد آئے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

ٹرانٹو سے واشنگٹن پہنچے تو یکایک محسوس ہوا کہ ہم اپنے بچوں اور بچوں کے باپ کے لیے بہت اُداس ہیں اور بہت تھک گئے ہیں۔ بچوں کے لیے ماں کا اداس ہو جانا ایک قدرتی سی بات ہے لیکن ازدواجی زندگی میں اتنے دن سکون سے گزر جانا بالکل غیر قدرتی بات ہے۔

اس لیے واشنگٹن پہنچتے ہی واپسی کا پروگرام بنایا۔ نیویارک سے جانا طے پایا۔ کیونکہ اپنی سہیلی سے ملنے کی آخری امید ابھی تک دل میں کلبلا رہی تھی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"آپ پاکستانی خواتین کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتیں۔"

ہم نے بغیر شرمائے کہا۔

"جی نہیں اگر ہم خود کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کریں تو اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارے فیصلے کا ہوا۔"

"آخر کیوں ؟ آپ نیویارک کے راستے جانا چاہتی ہیں، نیویارک سے جائیں۔ آپ کے شوہر کون ہوتے ہیں آپ کو زبردستی لندن بھیجنے والے..."

بے وقوف۔ پوچھتی ہے۔ آپ کے شوہر کون ہوتے ہیں...؟

بھئی ہمارے ہاں تو جو کچھ ہوتا ہے، شوہر ہی ہوتا ہے۔ دین۔ مذہب۔ ایمان... حتیٰ کہ مجازی خدا..... لیکن مجازی تو ہم کہتے ہیں۔

پرسوں جب ہم سیٹ بک کرانے کے لیے آئے تھے تو خاتون بڑی شفقت سے پیش آئی تھی۔ پاکستان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتی رہی۔ ہم نے پوچھا۔

"کیا آپ پاکستان گئی ہیں ... ؟"

بولی "نہیں۔ مگر مجھے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے ؟"

"اس شوقِ خانہ خراب کی کیا وجہ ہے ؟" ہم نے استفسار کیا۔

تو ہنس کر بولی۔

"میں نے سنا ہے پاکستان کے مرد بہت رومانٹک ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد بھی بیویوں سے رومانس کرتے رہتے ہیں۔ خوب زیور گھنا دیتے ہیں اور بیویوں کے غلام ہو جاتے ہیں۔"

ہم نے ایک بڑا سا گھونٹ نگلا اور خاتون سے پوچھا۔

"آپ کو یہ سب اطلاعات کس نے بہم پہنچائی ہیں ؟"

بولی "کچھ اندازہ تو ان پاکستانی مردوں سے ہوا ہے جو ہمارے ساتھ کام کرتے ہیں اور کچھ ہم نے پاکستانی فلمیں دیکھ کر اندازہ لگایا ہے۔"

ہم نے اس کی خوش فہمی کو دور کرنا مناسب نہ جانا اور بس اتنا پوچھا۔

"آپ کو پاکستان دیکھنے کا شوق ہے یا پاکستانی مرد ؟"

ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"ایک ہی بات ہے۔"

"ہم نے کہا" ایک بات نہیں ہے.... تاہم اگر آپ کو کوئی پاکستانی مرد پسند آجائے تو کیا اس سے شادی کر لیں گی ؟"

بولی۔

"کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر وہ میری شرائط مان لے اور اس قسم کی زندگی گزارنے کی ضمانت دے جیسی ہم آپ کی اردو فلموں میں دیکھتے ہیں تو میں اس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔ مجھے امیر آدمی بہت پسند ہیں۔"

ہم نے خاتون کو غور سے دیکھا۔ اس پر سے جوانی کا موسم گزر چکا تھا... اور آج کل وہ اس پکے ہوئے آم کی طرح تھی جسے ریفریجریٹر میں رکھ چھوڑتے ہیں... لیکن اپنے بارے میں کتنے خوبصورت گمان رکھتی تھی۔ اس کے گمان توڑنے کو دل نہ چاہا۔ اس لیے ہم نے اسے واشگاف الفاظ میں دعا دی کہ وہ پاکستان آئے اور اپنا دل پسند مرد تلاش کرے اور اپنے تجربے سے اپنی رائے قائم کرے۔

اور اب وہ بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو صاف انکار کر دیتی... کہہ دیتی.... میں اپنا پروگرام طے کر چکی ہوں۔ تمہیں پسند ہو یا نہ میں تو نیویارک کے راستے ہی پاکستان جاؤں گی اور لندن ہرگز نہیں اتروں گی"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم نے انکساری سے کہا۔

"خاتونِ محترم! اگر ہمارے اتنے بلند خیالات ہوتے تو آج ہم بھی کسی ہوائی کمپنی کے کاؤنٹر پر بیٹھے لوگوں کی سیٹیں کینسل کر رہے ہوتے۔"

الوداع امریکہ!

شام کو چھ بجے ہم گھر سے نکل آئے۔ ہمارا جہاز ڈلس ایئرپورٹ سے لندن جا رہا تھا۔ ڈلس ایئرپورٹ جدید تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ہم چلتے ہوئے بھی غور سے اِدھر اُدھر دیکھ کر داد دیتے جا رہے تھے۔ اندر پہنچ کر سامان چیک ان کیا۔ خاتون سے بورڈنگ کارڈ لیا اور مڑ کر فخر بھابی کو خدا حافظ کہا۔

واشنگٹن قیام کے دوران انھوں نے جس شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے ہماری پلکیں آپ ہی آپ بھیگ چلی تھیں۔ ہم نے آنسو چھپانے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ فخر بھابی کی آنکھوں میں بھی موتی چمک رہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کچھ بھی نہیں کہا اور کچھ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اِنسان بھی عجیب شے ہے۔ چند دن کے لیے کوئی طوطا پال لے تو اس سے بھی مانوس ہو جاتا ہے۔ بچھڑتے وقت دل کے اردگرد شبنم ضرور گرتی ہے۔

بالآخر ہم ان کے شکریے ادا کرتے ہوئے رخصت ہوئے اور جلدی سے مسافروں کے لاؤنج میں آ گئے۔ پچھلوں سے ناطہ توڑنے کے لیے لاؤنج کے یہ پڑاؤ بہت کام آتے ہیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ایک دلنشیں سی گوری پیشوائی کو بڑھی۔ کرسی پیش کی اور مسکراہٹ کی بجلی گراتی ہوئی بولی۔

"آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں....؟"

خدمت..... ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیٹنے کے لیے کوئی پلنگ نہ تھا۔ جی چاہ رہا تھا ہم ذرا کی ذرا لیٹ جائیں اور خوب صورت خاتون سے کہیں اپنے معطر ہاتھوں سے ہماری ٹانگیں دبا دے کیونکہ آج واشنگٹن ڈی سی جانا پڑا تھا اور اتنا گھومے پھرے تھے کہ اب جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔

مگر ہونق سی شکل بنا کے مسافروں اور مسافرنیوں کو دیکھنے لگے۔ اندر لاؤنج میں عجیب میلے کا سا سماں تھا۔ جیسے کوئی بارات اتری ہو۔ یوں بھر بھر کے جام دیے جا رہے تھے جیسے یہ نادر شاہی جشن ہو۔ ہم نے حسرت سے لال پیلے گلابی گلاسوں کو دیکھا اور خاتون سے کہا۔

"کوئی شربت لاؤ جو ترش نہ ہو۔ تلخ نہ ہو۔ ہوش و حواس کو سلب نہ کرے مگر سرور دے۔ دل کو تقویت اور دماغ کو طمانیت دے کہ ہم عرصہ سے اپنے پیاروں سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ ایک گھونٹ بھریں اور ان میں جا بیٹھیں۔"

وہ ہنس کر بولی "ایسا مشروب تو صرف روح افزا ہے جو ہمارے ہاں نہیں ملتا۔" (یہ فقرہ ہم نے اپنے پاس سے بنایا ہے)

اس نے ہمیں زرد رنگ کا تازہ مالٹے کا جوس لا کر دیا۔ جوس پی کر طبیعت سیر ہوئی۔

تب ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور خواہ مخواہ چل پھر کر سارے مسافروں کا جائزہ لینے لگے۔

سب مسافر خوش فعلیوں میں مگن تھے۔ کھا رہے تھے۔ پی رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر سفر کا خوف نہ تھا..... کسی کے اعصاب کا تناؤ اس کے ماتھے کی شکنوں سے نہ ظاہر ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا سب لوگ یہاں زندگی گزارنے آئے بیٹھے ہیں۔ اسی لیے شب و روز سے صبح و شام سے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بے نیاز ہوئے بیٹھے ہیں۔

اتنے میں لندن جانے والی فلائٹ کا اعلان ہوا۔ یوں لگا صورِ اسرافیل پھونکا گیا۔ بکھرے ہوئے مسافر سلیقے سے سمٹ کر ایک قطار میں سما گئے۔

اور یہ قطار سیدھی اس بس کے جبڑے میں چلی گئی جس نے مسافروں کو ایئرپورٹ سے جہاز تک لے کے جانا تھا۔

میں کہاں ہوں، تُو کہاں ہے؟

میں بس میں آگے بیٹھ گئی ہوں۔ میرے اردگرد بے شمار مسافر بیٹھے ہیں.... گورے چہرے.... لال چہرے.... پیلے چہرے.... عورتیں مرد.... بچے.... سب مسافر ہی مسافر.... سب اجنبی ہی اجنبی....

بس چل پڑی ہے۔

ایک عجیب سا احساس جاگا ہے۔

میں کہاں جا رہی ہوں....؟

میں کس جہان میں جا رہی ہوں....؟

ایئرپورٹ سے جہاز تک کا جہاں کوئی جہاں نہیں.... ایئرپورٹ سے جہاز تک کا عرصہ کوئی عرصہ نہیں...

اردگرد صرف چہرے ہیں۔ یہ چہرے ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے....

چہرے بول رہے ہیں.... چہرے ہنس رہے ہیں.... چہرے اونگھ رہے ہیں.... کچھ چہرے خوش ہیں۔ کچھ غمگین....

ان میں سے کچھ لوگ اپنے اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں اور کچھ اپنے اپنوں سے بچھڑ کر آ رہے ہیں۔

لوگو! تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟

میں کون ہوں....؟

ایک بڑا عجیب لمحہ آیا ہے....

جو شناخت کی لہروں کو ساتھ بہا کر لے گیا ہے....

ایک دم لق و دق بیاباں میں سناٹے کی زمین آ گئی ہے...

ایک دم سب کچھ اِدھر اُدھر ہو گیا ہے....

اوپر آسمان ہے۔ پرانے ہمسائے کی طرح نظریں جمائے کھڑا ہے۔

نیچے زمین ہے۔ نئی سہیلی کی طرح انجان سی ہے.....

بس چل رہی ہے۔

ایک دنیا کو چھوڑ کر میں دوسری دنیا میں جا رہی ہوں.... میرا اُس زمین سے کوئی ناطہ نہیں.... میرا اُس زمین سے بھی کوئی ناطہ نہیں۔ ناطے کے بغیر میں یہاں کیسے آ گئی....؟

دنیا ایک بھول بھلیاں ہے.... لوگ آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں.... مختلف زمینوں پر لوگوں کے لیے رزق لکھ دیا جاتا ہے.... دانہ دانہ خُدائی کو کھینچ لے جاتا ہے۔

میں اداس ہو گئی ہوں۔

اس اجنبی سرزمین پر، ان اجنبی لوگوں میں، ان اتنے بیشمار لوگوں میں.... میں تنہا ہوں.... چپ ہوں.... گُم صُم ہوں اور سوچ میں ڈوبی ہوئی..... مجھے سب دیکھتے ہیں.... مجھے کوئی نہیں پہچانتا.... شاید میرا چہرہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ان سب چہروں سے الگ ہے۔

مجھے پہچاننے والو! تم کہاں ہو ؟

تم سے بچھڑ کر میں یہاں کیسے آگئی ؟ یہ تو صرف راستہ ہے۔ میں ابھی راستے میں ہوں۔ میری منزل بہت دُور ہے۔ راہ میں ایک اور پڑاؤ بھی ہے۔

میرے مالک! میرے معبود!

تو ہر جگہ ہے۔

میں جہاں جاتی ہوں۔ تجھے محسوس کر لیتی ہوں۔

تیری قدرت کو محسوس کر لیتی ہوں۔ تیرے کمال کو محسوس کر لیتی ہوں۔

ہاں میں جان گئی ہوں کہ میں تنہا نہیں ہوں....

تو میرے ساتھ ہے....

تو میرے ساتھ ہے....

اگر تو ساتھ نہ ہوتا تو سفر کی مشکلیں کس طرح آسان ہوتیں...

تو نے قدم قدم پر دل کو سہارا دیا.... جسم کو توانائی دی... آنکھ کو بصیرت دی اور اپنی خوبصورت دنیا کے خوبصورت نظارے دکھائے۔

بس چل رہی ہے۔

چہرے پتھر کے ہو گئے ہیں.... میں تیرے ساتھ ہمکلام ہوں....

اتنی گمبھیر خاموشی سے میرا جی دُکھنے لگا ہے....

میں تجھ سے پوچھتی ہوں۔ اس بھول بھلیاں میں مَیں اکیلی کیا کرتی پھر رہی ہوں.... کون ہوں میں.... کہاں سے آگئی ہوں....؟

تجھے کھوجنے نکلی ہوں یا اپنا آپ ڈھونڈنے... ؟

یہ جہاں میرا جہاں ہے یا تیری کرشمہ سازی ؟

رَت جگا :

جہاز کے اندر جب ہم اپنی سیٹ پر آکر بیٹھے تو پھر صدق دل سے دعا کی کہ

"اے اللہ! ہمسایہ کوئی اچھا دیجیو۔"

ایک لال سی ناک والا گورا اچانک سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ مسکرایا۔ ذرا سا سر کو خم کیا.... ہم نے جگہ بنا دی۔ وہ کھڑکی والی سیٹ پر جا بیٹھا۔

خیر... خیر... ایک رات کی تو بات ہے۔ ہم نے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ لوگ ساری زندگی ہمسایوں سے منہ موڑ کر گزر کر لیتے ہیں۔ کیا ہم ایک رات نہ گزار سکیں گے....

پائیلٹ نے مسافروں کو خوش آمدید کہا اور معمول کے مطابق طیارہ فضاؤں میں روانہ ہو گیا۔

جہاز میں وہی سلسلۂ ناؤ نوش شروع ہو گیا۔ اس جہاز میں ایک کلب کلاس بھی تھی۔ یہ کلاس فرسٹ کلاس اور اکونومی کلاس کے درمیان ہوتی ہے.... جہاز میں ایک سیٹ بھی خالی نہیں تھی۔

آپ کیا پئیں گی... ؟

سٹیورڈ نے بڑے ادب اور بڑے قرینے سے یوں سر جھکا کر پوچھا جیسے ہم کوئی شاہی سواری ہوں۔

یہ سوال اس سفر میں ہم سے اتنی بار پوچھا گیا کہ آخری مرحلے میں ہمارا دل چاہا۔ اپنے ماتھے پر ایک چٹ لگا لیں۔

ہم نے جُوس کا آرڈر دیکر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس سفر میں زیادہ تر گوریاں ہم سفر تھیں اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر جام لے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

رہی تھیں۔ ہمارے دائیں ہاتھ کی طرف جو دو گوریاں بیٹھی تھیں۔ ایک موٹی تھی اور ایک پتلی دونوں حد درجہ باتونی تھیں۔ کیونکہ بیٹھتے ہی ان کی زبان چالو ہو گئی تھی۔ ان کے قہقہے اور چہچہے سارے جہاز میں بلند ہو رہے تھے.... موٹی گوری زیادہ متمول نظر آتی تھی کیونکہ اس نے سونے کے سکوں کی وزنی بریسلیٹ پہنی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ہیرے کی بے شمار انگوٹھیاں بھی تھیں۔ باتیں کرتے سمے وہ اپنا بریسلیٹ والا بازو اور انگوٹھیوں والا ہاتھ ضرور نچاتی تھی۔ اس کے عین پیچھے ایک لگڑ بگڑ کی شکل کا گورا بیٹھا اسے تاک رہا تھا۔

لیجیے کھانا بھی شروع ہو گیا۔

ہم نے ایک بات محسوس کی۔ ان جہازوں میں زندگی بس کھانے پینے میں ہی گزرتی ہے۔ ہم نے زیادہ تر سفر برٹش ایرویز میں ہی کیا تھا۔ یہاں کھانا کورسز میں آتا ہے اور اس طرف کے لوگ خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں ہم چونکہ مفلس ہیں، اس لیے پیٹ بھر کر کھانے کی عادت نہیں ہے۔

کھانے کے بعد ایک صاحب بہادر تشریف لائے۔ ہمارے سامنے یوں آداب بجا لائے جیسے ہم ملکۂ عالیہ ہوں۔ ذرا ان کے لب و لہجے پر غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ کھانے کے بارے میں ہماری رائے پوچھنے آئے تھے۔

ہم نے اتنی گرمجوشی سے کھانے کے لذیذ ہونے کا اعتراف کیا کہ خود ہمیں اپنی پسند پر تعجب ہونے لگا۔

بعد میں ہم نے دیکھا کہ وہ صاحب ہر مسافر کے آگے کورنش بجا لائے اور ہر ایک سے یہی سوال کیا۔

ان کے آخری سوال کرنے تک موٹی گوری جوش و خروش سے کھا رہی تھی۔

اُوپر ستاروں کی روشنی میں ہنستا ہوا آسمان تھا اور نیچے اندھی زمین تھی اور جہاز ایک روشن پھاوڑے کی طرح اندھیرے کی چادر کو چیر کر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

ہم نے اپنا قلم اور ڈائری نکالے کہ ایک خط ہی لکھ دیں... لیکن یہ سوچ کر قلم کو بند کر دیا کہ اس مرتبہ تو ہم خط سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔

فلم شروع ہوئی۔ مگر اس میں دل نہیں لگا۔ جہاز کی اوپر کی منزل میں ایک لاؤنج تھا۔ ہم نے سوچا وہاں جا کر تھوڑی دیر کے لیے سو جائیں... مگر ایک چرب زبان گوری جام ارغواں لے کر ہمارے سرہانے آ بیٹھی۔ ایک ہمسفر بھی اُٹھ کے اس کے ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ اس ظالم نے ہمیں ایک پل سونے نہ دیا۔ ہم منہ پر رسالہ رکھ کر لیٹ گئے۔ اس کے کھنکتے ہوئے قہقہے اور مسلسل باتوں کی پھوہار سونے نہ دیتی تھی۔ جس شدت سے باتیں کر رہی تھی، اسی روانی سے جام پر جام چڑھا رہی تھی۔ ہم کبھی کبھار رسالے کی اوٹ سے اسے ایک نظر دیکھ لیتے اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے ؎

یاد ہو گا تجھے ساقی، تیرا رکھا تھا بھرم
بے پیئے ہم نے قدم ڈالے تھے بہکے بہکے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پانچواں پڑاؤ

برطانیہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لندن کا میدانِ حشر :

ابھی ہم آنکھیں بند کیے اونگھ رہے تھے کہ فضا میں ناشتے کی پکار ہونے لگی۔ ہم نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ لندن کی صبح شیشوں سے جھانک رہی تھی.... پینے والوں نے بھی حد کر دی۔ تمام شب پیتے رہے۔ اور جاگتے رہے..... جامِ شبانہ جامِ صبوحی سے بدل گئے۔ ہم نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور نیچے آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گوریاں پہلے سے ہی سُرخی پاؤڈر تھوپے نک سک سے درست ہو کر بیٹھی تھیں.... یہ رات بھر جاگی تھیں.... مگر اب بھی تازہ دم نظر آرہی تھیں۔

ہم بھی شب بھر جلے تھے۔

اور صبحدم شمع کی مانند بجھے بجھے سے لگ رہے تھے۔

جلدی جلدی ناشتہ زہر مار کیا اور شیشوں کے باہر اُبھرتی ہوئی سنہری صبح کو دیکھنے لگے... چاروں طرف سفید اور سیاہ بادل تھے اور نیچے مٹیالا ماحول تھا۔ گویا لندن نزدیک تھا۔

پچھلے سال ہم صاحب عالم اور بچوں کے ساتھ ہیتھرو ایئرپورٹ اُترے تھے.... اب تنہا اترے تو دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سب مسافر بکھر گئے... جانے کون کہاں چلا گیا..... یہ کیسی ہم سفری ہے۔ رات بھر کی مسافرت کے باوجود کوئی کسی کو نہیں جانتا...: سب ایئرپورٹ پر اترتے ہی پھُر کر کے اُڑ جاتے ہیں۔

ہوائی اڈے کی سب چوکیوں سے بعافیت گزرتے ہوئے ہم نے اپنا سامان ٹرالی پر رکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

صاحبِ عالم نے لاہور سے اپنے ایک دوست گھرانے کو فون پر ہمارے آنے کی اطلاع دے دی تھی اور بڑے وثوق سے ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم لندن سے سیدھے ان کے ہمراہ کیمبرج چلے جائیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ ہماری بڑی آؤ بھگت کریں گے بلکہ ہمیں کیمبرج یونیورسٹی اور تمام قابلِ دید مقامات دکھالائیں گے۔ صاحب عالم کے اس گھرانے سے بڑے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے ان کے لب و لہجے پر ہم نے اعتبار کر لیا۔ ویسے احتیاطاً ہم نے اپنی ایک سہیلی کو جو عرصہ سے بریڈفورڈ میں مقیم ہے فون پر اطلاع دے دی تھی کہ ہم انگلینڈ وارد ہو رہے ہیں اور وہ ہمارے استقبال کو لندن پہنچ جائے۔ بس زہرہ جبیں کو اطلاع دینے کے بعد جیسے ہم مطمئن ہو گئے کیونکہ ہمیں اپنی سہیلیوں کا بڑا مان ہے.... اور وہ ہمیشہ ہمارا مان رکھا کرتی ہیں۔ یوں ہم نے صاحب عالم کی ہدایت نمبر ۲ کے مطابق بیگم غ خ کو بھی فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دیدی تھی اور انھوں نے بڑی محبت سے کہا تھا وہ اپنے شوہر کو ایئرپورٹ پر بھیج دیں گی۔

گو ہم نے انگلینڈ میں کوئی خاص سرکولر نہیں بھجوایا تھا۔ پھر بھی پتہ نہیں

کیوں دل میں جذبات کے طوفان اٹھ رہے تھے اور یوں لگتا تھا ہماری آمد کی خبر سارے لندن میں پھیل گئی ہوگی۔ اس لیے ٹرالی کو باہر کی طرف گھماتے ہوئے ہم نے اپنے دل سے کہا۔ آج ذرا حوصلہ دکھانا۔ ممکن ہے سارا شہر استقبال کو آ گیا ہو۔ (کیونکہ ہم زندگی میں پہلی بار امریکہ کی زمین کو چھُو کر آ رہے تھے) لوگ تمھارے نام کے بینر اُٹھائے کھڑے ہوں گے۔ ہر فرد و بشر مشتاق ہوگا، متمنی ہوگا۔ جوشِ الفت میں شاید لوگ نعرے لگانے لگیں اور ایئرپورٹ کے ڈسپلن کو درہم برہم کر دیں۔ اس لیے تم ذرا وقار میں رہنا.... افتخار سے چلنا... تمھاری کسی ادا سے ہلکا پن ظاہر نہ ہو۔

اپنے دل کو تسلیاں دیتے ہوئے.... اندر ہی اندر وقار سے چلنے کی پریکٹس کرتے ہوئے۔ دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے ہم باہر نکل آئے۔

باہر ایک ہجوم تھا....

لوگ بینرز اُٹھائے۔ ننھی ننھی نام کی تختیاں پکڑے ہوئے ریلنگ کے ساتھ قطار اندر قطار کھڑے ہوئے تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، جوان اور ان کے ہمراہ بچے.... سب کے چہرے سوالیہ نشان تھے۔ سب کے ہونٹوں پہ اضطراب کی ایک چیخ پھڑک رہی تھی۔ سب ہی کی آنکھیں کھوج رہی تھیں۔

مگر ہمیں نہیں ——

اپنے اپنوں کو!

ان میں ہمارا جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہمیں کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ ہمارا کسی کو انتظار نہیں تھا۔ ہمارے نام کی جھنڈی کسی کے ہاتھ میں نہیں تھی... کسی نے ہمیں دیکھ کر شناسائی کا پرچم نہیں لہرایا.... کسی کے چہرے پر ہمیں دیکھ کر روشنی کی کرن نہیں پھُوٹی۔ کسی نے بے اختیار آگے بڑھ کر ہمیں گلے نہیں لگایا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

——— کہ ہم پتھروں کے اس دیس میں بدیسی شیشے کی مانند آن وارد ہوئے تھے۔

——— ہم نے گھوم پھر کر سارے لاؤنج کا چکر لگایا.... بار بار لگایا۔ اِک اِک چہرے کو غور سے دیکھا۔ الحمدللہ وہاں ہمیں پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ ہماری سہیلی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور لندن ایئرپورٹ پر ہمیں لینے آئے گی۔ اس کے وعدے پر ہمیں یقین تھا اور اس یقین کے سہارے اِدھر اُدھر چکر لگاتے پھر رہے تھے۔

ہمیں لندن کا ایرپورٹ ہمیشہ حشر کا میدان لگا کرتا ہے۔ یہاں بھانت بھانت کی مخلوق بھانت بھانت کی بولیاں بولتی نظر آتی ہے۔ بے شمار لوگ ہاتھوں میں بینر اٹھائے مجسموں کی طرح گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی مایوس نہیں ہوتا.... یوں معلوم ہوتا ہے ازل سے خدائی کو کسی کا انتظار ہے اور ابد تک خدائی یہاں کھڑی رہے گی۔

یہ سوچ کر کہ اس شہرِ آشوب میں ہم تنہا ہیں، ہمارے پسینے چھوٹ گئے.... دن ڈھل جائے گا تو رات آئے گی.... ہوش ربا بلائیں اتریں گی اور نہ جانے کیا ہو۔

ٹرانٹو میں ہمارے بہنوئی نے ہمیں بہت منع کیا تھا کہ تنہا لندن نہ جائیں.... پھر رونگٹے کھڑے کر دینے والے دو چار واقعات بھی سنا دیے تھے۔ بلکہ واشنگٹن سے چلتے وقت ایک بار پھر خبردار کیا تھا کہ اس پروگرام کو بدل دیں۔

رفیق جنجوعہ اور ناہید رحمنڈ سے خاص طور پر الوداع کہنے آئے تھے اور انھوں نے بھی چند حادثات پر روشنی ڈال کے ہمیں باز رکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سب ہمارے بہی خواہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ہم کس عامل کے معمول ہیں...

ہیڈ کوارٹر سے حکم جاری ہو چکا تھا اور ہمیں صرف عمل درآمد کرنا تھا۔ آگے جو ہو وہ ہمارا مقسوم....

اور اب ان لوگوں کی باتیں یاد آ رہی تھیں.... دل کو ڈرا رہی تھیں... یوں ہم اس اتنے بڑے ہجوم میں بالکل تنہا تھے.... بلا کا شور تھا... مگر ہمیں چاروں طرف سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔

شناسائی کے بغیر یہ دنیا سناٹا ہی تو ہے ؎

آج تنہا ہوں میں اخلاص کے اس جنگل میں
ایسے آہو کی طرح جو کہ کبھی ڈار میں تھا
یوں تو سب لوگ تھے اس شور شرابے میں مگن
کوئی اپنا نہ مگر اس بھرے بازار میں تھا

پہلی بھیک :

پوری رات کے اعصاب شکن سفر کے بعد اب قویٰ جواب دے رہے تھے۔ اس لیے ہم رسان سے جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے.... ٹرالی پر ہمارا سامان یوں پڑا تھا جیسے بھوکا بچہ رو رو کر سو گیا ہو۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو ہم نے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ ہم کس صورتِ حال میں پھنس گئے ہیں۔ پہلا خیال تو یہی آیا کہ برٹش ایئرویز کے کاؤنٹر پر جا کر پاکستان کے لیے سیٹ حاصل کریں اور اس کے مطابق یہیں سے کسی ہوٹل میں کمرہ بک کروائیں۔ اگر سیٹ آج ہی مل جائے تو کھڑے کھڑے واپس لوٹ جائیں۔ خفگی کے اظہار کا اس سے اچھا اور کوئی انداز نہیں ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

غصّے میں کھولتے ہوتے مُڑ کر دیکھا تو بائیں طرف ایک ساڑھی والی عورت آ بیٹھی تھی اور ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

ہمارے دل نے کہا۔"اس کے ساتھ شناسائی کرلیں۔ کہیں تو لے جائے گی"

ہم نے بھی مسکرا کر اسے وِش کیا اور پوچھا " آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

وہ بولی "میں تو نیپال جارہی ہوں۔"

اوہ ہمارا دل ڈوب گیا۔ مگر خیر حوصلہ بڑھانے کو اس کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ اس کے پوچھنے پر ہم نے بتایا کہ ہم یہاں اپنے میزبانوں کا انتظار کر رہے ہیں جنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے۔

اس نے کہا۔

"آپ کے پاس ان کا فون نمبر تو ہوگا۔ کیوں وقت ضائع کر رہی ہیں فون کر کے پتہ کرلیں۔"

واقعی ہمیں پریشانی میں اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ پھر ہم نے بڑی سادگی سے اسے بتادیا کہ ہمارے پاس اس وقت کوئی سکّہ نہیں ہے

اس مہربان خاتون نے پرس کھولا اور بڑی دریا دلی سے دو پینی کا ایک سکّہ نکال کے ہماری طرف بڑھایا۔

ہم حیرت سے کبھی خاتون کا چہرہ دیکھتے اور کبھی تانبے کے اس سکّے کو جو ہماری ہنسی اُڑا رہا تھا۔

واہ واہ بشریٰ رحمٰن آج تجھے اپنی حقیقت معلوم ہوئی۔

بہت اچھا کیا رُسوا کیا جو مجھ کو محفل میں !
سمجھتا تھا میں اپنے آپ کو کیا جانے کیا دل میں

ایک دم ہماری حمیّت جاگ اٹھی اور ہم نے شکریے کے ساتھ انھیں لوٹاتے ہوئے کہا۔"ہمارا مطلب یہ تھا کہ ہمارے پاس پاؤنڈ کے نوٹ ہیں ہوا سکّہ نہیں ہے۔"

اس نے بینک کی سمت بتائی۔ وہاں جاکر ہم نے نوٹ بھنوایا اور بہت سے سکّے مٹھی میں دبا کر ٹیلی فون بوتھ کی جانب روانہ ہوتے۔ ہم نے سکّہ ڈال کر سرغ خ کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ فون کسی نے نہیں اُٹھایا۔ ہم نے اپنے دل کو تسلّی دی کہ وہ ضرور ہمیں لینے کے لیے روانہ ہوچکی ہیں اس لیے فون نہیں اُٹھا رہیں۔ ہماری بہت سی بری عادتوں میں سے ایک بری عادت یہ بھی ہے کہ ہم جلدی کسی سے بدظن نہیں ہوتے۔ سوچ لیا کہ اتنی دور سے آنا کوئی آسان نہیں ہے۔ بعض اوقات راستے میں ٹریفک زیادہ ہوتا ہے موٹر بھی خراب ہوسکتی ہے اور گھر والی کو ہزاروں کام ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سوچ کر پھر لاؤنج کے دو چار چکّر لگائے۔ آنتیں بھوک سے قُل ہواللہ پڑھ رہی تھیں صبح ٹھیک طرح سے ناشتہ نہیں کیا تھا اور اس وقت تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ دل گھبرایا تو پھر ٹیلی فون بوتھ کی جانب روانہ ہوتے ابھی پرس میں سے سکّہ نکال رہے تھے کہ یوں احساس ہوا چند قدم کے فاصلے پر کوئی کھڑا ہمیں گھور رہا ہے مارے خوف کے جھرجھری آگئی۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ اپنے آپ کو نارمل رکھ کے بڑے حوصلے سے نظر اٹھائی تو واقعی اپنے سامنے ایک نوجوان کو کھڑے پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ وہ ایک نظر ہمیں دیکھتا اور ایک نظر اس پرچے پر ڈالتا۔ ایک سیکنڈ کے اندر کئی خیال آئے اور گزر گئے کئی خوف آئے اور پسینہ پسینہ کر گئے مگر ہم ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔

وہ ہچکچاتا ہوا قریب آیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"آپ.... آپ مسز بشریٰ رحمٰن ہیں؟"

"جی...." ہم نے اتنی زور سے کہا جیسے ابھی قوتِ گویائی ملی ہو۔

"اور آپ امریکہ سے آئی ہیں۔"

"جی...." ہم نے اسی لہجے میں جواب دیا اور گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

وہ بولا "مسز غ خ نے بھیجا ہے۔ میں ان کے شوہر کا دوست ہوں..."

"اُف..." ہم نے آنکھیں بند کر کے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے آپ کو شاباش دی کہ جسے ہم نے مسز غ خ سے بدگمان نہیں ہونے دیا تھا۔ ورنہ اب کتنی شرمندگی ہوتی۔

سفر کے بارے میں دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد وہ بولا۔

"اب آپ کہاں جائیں گی؟"

"کیا مطلب..." ہم نے حیران ہو کر کہا۔ "ہم تو مسز غ خ کے خاص الخاص مہمان ہیں اور ظاہر ہے اس وقت کیمبرج ہی جائیں گے۔"

"کیمبرج کس طرح جائیں گی۔" وہ بولا۔

"کیا آپ موٹر نہیں لائے؟ ہم آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

وہ ذرا سا بوکھلایا اور بڑے ہی متفکر لہجے میں بولا۔

"دراصل انھوں نے مجھے آپ کو ساتھ لانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ انھوں نے مجھے کہا تھا میں صرف آپ کو ایئرپورٹ پر ریسیو کروں اور جہاں آپ جانا چاہیں، اس جگہ کے لیے ٹیکسی میں سوار کرا دوں۔"

ایک بار پھر زمین و آسمان ہماری نگاہوں میں گھوم گئے۔ صاحبِ عالم

نے بار بار کہا تھا۔ ہمیں چار دن صرف ان کے ہاں ہی رہنا ہے اور کہیں نہیں جانا.... وہاں کھڑے کھڑے کئی دوست اور کئی دشمن یاد آئے جو اس وقت لندن میں مقیم تھے.... اے کاش! ہمارے پاس ان کے پتے ہوتے یا کم از کم ہم اس ارادے سے گھر سے نکلے ہوتے تو آج یوں پریشان نہ ہوتے۔

اس نوجوان نے ہمارے چہرے سے ہماری کش مکش کو پڑھا۔ پھر بڑے خلوص سے بولا۔ "آپ مسز غ خ کو یہاں سے فون کر دیں کہ آپ ان کے گھر آنا چاہتی ہیں.... پھر میں آپ کو ٹرین پر سوار کرا دوں گا۔"

اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم نے مسز غ خ کا نمبر ملایا تو اُدھر سے کسی نے فون اُٹھا لیا۔ ہم نے آواز پہچان لی۔ وہ خود بول رہی تھیں۔

ہم نے علیک سلیک کے بعد بتایا کہ ہمیں تو ان کے ہاں رہنا ہے اور اسی خیال سے ہم نے اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست نہیں کیا تھا....

انھوں نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا۔ "دراصل آجکل میں بہت مصروف ہوں، اور آپ کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ دیکھیے پلیز، بُرا نہ مانیے گا..."

فون کھٹ سے بند ہو گیا۔ ہم نے سمجھا۔ ہمیں سننے میں غلطی ہو گئی ہے اور شاید ان کی بات مکمل نہیں ہوئی۔ اس لیے دوبارہ سکہ ڈال کے ڈائیل کیا... گھنٹی بجتی رہی اُدھر سے کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس طرح ہم نے تین مرتبہ فون کیا۔ کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ تب وہ نوجوان بولا۔ "شاید وہ گھر سے نکل گئی ہوں گی۔"

"یہاں لوگ بات کرتے کرتے گھر سے نکل جاتے ہیں۔"

اس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"میں تو دفتر سے دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

URDUISTAN.BLOGSPOT.COM

اگر آپ نے کیمبرج جانے کا فیصلہ کر لیا ہو تو میں آپ کو ٹرین پر سوار کرا دوں۔ ورنہ میں لیٹ ہو جاؤں گا۔"

اس وقت ہم سوچ کی صلیب پر لٹکے ہوئے تھے۔ ہمارا دل بار بار کہتا تھا۔

یہ بے مہر لوگوں کی نگری ہے۔ یہاں سے نکل جا....

اس غریب پر بھی ترس آ رہا تھا جو ہمارے مروت کے ہمیں ریسیو کرنے آ گیا تھا۔ اس کی قیمتی نوکری کا بھی خیال تھا۔ اس لیے ہم نے اس سے کہا۔

"ہم بریڈفورڈ اپنی سہیلی کو فون کر کے پتہ کرتے ہیں آیا وہ وہاں سے نکل چکی ہے یا اس کا بھی ارادہ بدل گیا ہے۔ اس کے بعد ہم آپ کو بتائیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے...."

ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک مقدس سکہ نکالا۔ پھر ڈائیل پر یوں انگلی رکھی جیسے یہ انگلی بڑی فیصلہ کن ہو، اک ذرا گھما دیں تو ملکوں کی تقدیروں کے فیصلے آناً فاناً ہو جائیں۔ جانے کیا سے کیا ہو جاتا کہ اچانک.... بالکل اچانک.....

فضا میں ہمارا نام لہرانے لگا... کوئی مائیکروفون پر ہمیں بلا رہا تھا۔ ہمیں پکار رہا تھا۔ اجنبی دیس میں.... نامانوس فضاؤں میں..... تپتے ماحول میں.... اس سے پہلے یوں ہمیں اپنا نام کبھی خوب صورت نہ لگا تھا..... ہم نے سارے سکے مٹھی میں دبائے اور دوڑ کر ایئرپورٹ انفرمیشن کے کاؤنٹر پر گئے۔ وہاں مشتاقانِ دید اور طالبانِ نوید کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ مگر ہمارے لیے فقط ہماری سہیلی زہرہ جبیں دور و نزدیک نظروں سے ورزش کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو جھپٹ کر آگے بڑھی اور ہم جو اتنی دیر سے وسوسوں کی سولی پر ٹنگے تھے، آرام سے امن کی زمین پر پاؤں ٹکا لیے۔ سچ کہتے ہیں "اولڈ از گولڈ"۔ اس میل ملاپ میں پلٹ کر دیکھا تو وہ نوجوان بڑی بے بسی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے

پر ایسا کرب تھا جیسے کہہ رہا ہو "اب مجھے تو آزاد کر دو۔"

ہم نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ واقعی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانا بڑا مشکل کام ہے۔ اور اسے رخصت کر دیا۔

(وہ نوجوان جس کا نام ہمیں بھول گیا ہے۔ بیشک ہم اس کے مشکور ہیں خدا کرے وہ جہاں بھی رہے، خوش رہے۔)

آرزو اور انتظار:

زہرہ جبیں ہمیں ساتھ لے کر بریڈفورڈ کو روانہ ہوئیں۔ بریڈفورڈ ہم نے چار دن قیام کرنا تھا اور جانتے تھے کہ چار دنوں کے مقدر میں آرزو اور انتظار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پھر بھی اپنی پرانی سہیلی کے گھر قیام کرنے کے تصور سے ہی جی خوش ہو رہا تھا.... قیام کے حساب سے ہم نے کلام زیادہ کرنا تھا کہ مدتوں کے بعد ملے تھے۔ ہم یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ اور اب یوں لگتا تھا باتیں سنبھالے ہوئے یونیورس کے یونیورس بیت گئے ہیں۔ ذہن باتوں سے بوجھل تھے اور تجربات جھولی سے گر گر جا رہے تھے۔ اگرچہ تجربات میں ہم سینیئر تھے۔ کیونکہ ہم نے بروقت ماتحتی قبول کر لی تھی۔ ان کی جگہ گوشہ ایک برس کی تھی اور ہمارے برخوردار چودہ برس کے....

اس لیے ہم موٹر ہی میں شروع ہو گئے۔ ملکی سیاست سے لے کر ذاتی رفاقت تک.... موٹر کی ایک ہی نشست میں طے ہو گیا قصہ تمام... گھر پہنچنے تک ہم خالی ہو چکے تھے۔

مگر گھر پہنچنے کی امید کس کو تھی....؟

ہم لوگ ساڑھے بارہ بجے بریڈفورڈ کے لیے روانہ ہوتے۔ جب ہم ادائے دلبری کے ساتھ دروازہ کھول کر موٹر میں بیٹھے تو جیسے کنوئیں میں ڈوبتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

چلے گئے۔ تب ہمیں اپنے وطن کی ٹیکسیاں بے اختیار یاد آگئیں.... اس موٹر سے اچھی نہ ہوں گی تو بری بھی نہ ہوں گی۔ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کر کے بیٹھ گئے کیونکہ ڈرائیور اپنا ہم وطن تھا اور عرصۂ دراز کے بعد ہم وطنوں کی شکل نظر آئی تھی۔ تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ ہمیں ڈرائیور سے چلّا کر کہنا پڑا کہ "اس طرح ٹیکسی مت چلاؤ جس طرح لاہور اور کراچی کے لمبے روٹ پر بسیں چلتی ہیں....؟"

یہاں تو بہت اچھا طریقۂ کار ہے۔ ہر کوئی اپنی لائن میں موٹر چلاتا ہے مگر ڈرائیور صاحب غالباً سٹیرنگ پر غور نہیں فرما رہے تھے۔ سٹیرنگ اپنی مرضی سے جدھر چاہتا مڑ جاتا.... بعض اوقات موٹر دوسری لائن میں پہنچ جاتی.... تین مرتبہ وہ ٹرک پر چڑھائی کرتے کرتے بچے..... پھر اچانک دھماکا ہوا۔ ڈرائیور کی نیند کھل گئی۔

"لیجیے ہو چکا جو ہونا تھا"

معلوم یہ ہوا کہ ڈرائیور صاحب رات بھر تاش کی بازی لگاتے رہے ہیں اب ان کی آنکھ کُھل نہیں رہی.... کار چلاتے ہیں... سو جاتے ہیں۔ کھو جاتے ہیں تو سٹیرنگ پر ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔

واللہ! یہ سب سُن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ہم نے سوچا اس سے بہتر نہ تھا کہ لندن ائیرپورٹ پر ہی چار دن تمام کر دیتے.... کم از کم وہاں زندگی کی ضمانت تو تھی۔ اور سب سے زیادہ غم اس بات کا ہو رہا تھا کہ اپنی زندگی کا بیمہ نہیں کرا کے آئے تھے۔

اِتنے میں.... جس کار کو ہمارے ڈرائیور نے خراشیں پہنچائی تھیں اس کا مالک باہر نکل آیا۔ اس نے کالے ڈرائیور کا گریبان پکڑ لیا۔ ڈرائیور گورے کے آگے ہکلا ہکلا کر معافی مانگنے لگا.... تب اس نے انشورنس کے کاغذات نکالے اور ڈرائیور سے تصدیق کرالی کہ اس نے موٹر کے نازک بدن پر تشدد کے

نشان بنائے ہیں۔ ڈرائیور نے ہنس ہنس کر ہر کاغذ پر یوں دستخط کیے جیسے کہ نکاح نامے پر دستخط کر رہا ہو۔

اس پوری کارروائی میں ایک گھنٹہ ضائع ہو گیا۔ جب ڈرائیور ایک خجل مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ آ کر موٹر میں بیٹھا تو ہم نے گڑگڑا کر کہا۔

"اے اللہ کے نیک بندے.... آدھے تیتر آدھے بٹیر.... ہم لوحِ جہاں پر حرفِ مکرّر ہرگز نہیں ہیں.... ذرا ہمارے چار بچوں کا.... اور ان کے باپ کا بھی خیال کر..... کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو تیرا گریبان پکڑنے آ پہنچیں گے...."

ڈرائیور کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات اُبھرے اور اُس نے کوئی عجیب سی زبان بولی۔ بڑی کوشش کے بعد پتہ چلا کہ وہ پوٹھوہاری پنجابی مُنہ گول کر کے انگریزی لَے میں بول رہا تھا۔

ہم نے پھر اسے سمجھایا کہ وطنِ عزیز میں رواج ہے کہ بسوں اور ٹیکسیوں میں اُونچی آواز میں گانے لگا دیے جاتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ڈرائیور کسی اور ہی جہان میں گم ہو جاتا ہے۔ مسافروں کی چیخ و پکار موسیقی کے شور میں دب جاتی ہے اور ایکسیڈنٹ ہونے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ تیرے پاس بھی اگر ایسے گیت ہیں تو بجا ... ع

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

اس نے ہماری نصیحت پر عمل کیا اور پرانے گیت بجنے شروع ہو گئے مگر اس پر گیتوں نے بھی لوری کا کام کیا۔ اسے بار بار اونگھ آجاتی اور ہمارا کلیجہ بار بار منہ کو آجاتا۔ پھر ہم نے یہ احتیاط کی کہ جب بھی سامنے کوئی بڑا ٹرک دیکھتے یا موٹر کے پہیے لڑکھڑانے لگتے، اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتے۔ جس پر ہماری سہیلی

YOUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

زہرہ جبیں ایک زوردار قہقہہ لگاتی...

غرض اس سوتے جاگتے عالم میں ہم نے تین چار گھنٹے کا سفر پورے سات گھنٹے میں طے کیا... اللہ کا صد شکر... اگر آج تک کہیں راستے میں ہوتے تو کیا ہوتا....؟

بریڈفورڈ :

بریڈفورڈ میں محلّے کے محلّے پاکستانیوں کے آباد ہیں... جب بھی کسی نئے محلّے میں کوئی پاکستانی یا ہندوستانی جاکر آباد ہوتا ہے، گورے وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ گوروں کو بھگانے کا یہ کتنا آسان طریقہ ہے۔ ہم نے اپنی سہیلی کے گھر سفید شیشوں والی کھڑکی کے آگے کھڑے ہوکر دیکھا۔ سامنے.... دائیں، بائیں.... قطار اندر قطار ہم وطنوں کے گھر تھے... ہر گھر سے وہی تاثر نمایاں تھا۔ پاکستانی لوگ اس بے تکلفی سے گھوم پھر رہے تھے..... جیسے اپنے وطن کے کسی محلّے میں ہوں...

بازاروں میں جائیں تو بیشتر دکانیں اپنے ہم وطنوں کی نظر آئیں گی۔ دکانوں کے اوپر انگریزی یا اردو میں نام لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک دکان پر لکھا تھا:

اب چاہے ماتھا پھوٹے یا آنکھ
ہم نے تو فوٹو کی مشین لگالی!

اکثر دکانوں کی اشتہار بازی اردو زبان میں بڑی مضحکہ خیز انداز میں کی گئی تھی۔ اور یہاں کیا نہیں ملتا۔ سری پائے اور نہاری تک تو مل جاتی ہے۔ کتنا عجیب لگتا ہے اگر ہم برطانیہ کی کسی سڑک پر جارہے ہوں اور آگے اپنا محلّہ آجائے۔ ہمارے ساتھ ایسا کئی بار ہوا۔ ایک بار ہم LUMBLANE

میں پیدل چلے جارہے تھے تو ایک دیکھا ہوا منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔ گلی میں کیلے کے چھلکے اور گندگی کے ڈھیر تھے۔ بچوں نے غلاظت پھیلائی ہوئی تھی۔ جا بجا ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بریڈفورڈ میں تو ایک دن بھی محسوس نہیں ہوا کہ ہم دیارِ غیر میں ہیں۔

یارک شائر :

یارک شائر بریڈفورڈ سے تقریباً چالیس میل دُور ہے۔ یہاں ایک اُونچی سی پہاڑی پر ایک قلعہ ہے۔ اوپر جانے کے لیے بے شمار سیڑھیاں ہیں۔ قلعہ دیکھ کر ہم رُک گئے۔ اور سوچا... یہاں بھی اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ایک قلعہ بنوادیا ہے۔ اوپر گئے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ محل چھت کے بغیر ہے۔ پتہ نہیں منچلے بادشاہ نے ہی یہ محل چھت کے بغیر بنوایا تھا یا گردشِ زمانہ اس کی چھت لے اُڑی ہے۔ اندر والان بھی نہیں تھے۔ راہ داریاں بھی نہیں تھیں۔ بڑے بڑے جھاڑ اور فانوس بھی نہیں تھے۔ کون لے گیا یہ ساری امانتیں....

یہ فرنگی بھی عجیب ہیں۔ جب کہیں پاؤں جماتے ہیں تو وہاں کی دیواریں تک اکھیڑ کے لے آتے ہیں.... کمال ہے ان کے مشہور و معروف قلعے کی کوئی چھت اُڑا کر لے گیا اور انھیں پتہ بھی نہ چلا....؟

اس بے چھت کے قلعے کے قریب ایک پراسرار سا محل بھی ہے جو فرنگیوں کے مزاج کے مطابق پہیلی بنا کھڑا ہے۔ محل کے اندر ایک عجائب گھر ہے جسے ہم نے خوب گھوم پھر کر دیکھا.... گھوم پھر کر اس لیے دیکھا کہ ہم ٹکٹ لے کر اندر گئے تھے۔ ورنہ ہمیں مرے ہوتے بادشاہوں کے بھُس بھرے گھوڑے، قدیم ٹم ٹم، پرانے ملبوسات، عجیب و غریب کٹلری و سازوسامان دیکھنے کا ہرگز شوق نہیں ہے۔ اب گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے تو کچھ تو آوارگی کرنا ہی

تھی.....

اسی شہر میں ایک میلی کچیلی جھیل بھی ہے جس کا حلیہ فرنگی بڑھیا جیسا ہو چکا ہے... چپ چاپ، خاموش..... کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی..... آہستہ خرام اور گدلی گدلی....

مگر دل والے تو اس جھیل کے کنارے آکر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور سارا دن بیٹھے جانے کیا کرتے رہتے ہیں۔

یارک شائر خاموش شہر ہے۔ اس میں لندن جیسی تیزی اور چمک نہیں ہے۔ جس طرح سیاح ملک ملک پھر کے تھک جاتا ہے، اسی طرح یہ تھکا تھکا سا شہر ہے....

اس سے تیس چالیس میل آگے ایک اور قصبہ ہے جسے ہیروگیٹ HERROGATE کہتے ہیں۔ یہ برطانیہ کے ان امراء کا قصبہ ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ مگر جو آرام اور سکھ کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے اس چھوٹے سے قصبے کو ترقی یافتہ نہیں بننے دیا.... یہاں کوئی صنعت و حرفت کا کارخانہ نہیں... کوئی فیکٹری نہیں.... موٹر کاروں کا شور نہیں.... ٹرکوں کا دھواں نہیں.... خلقت کا ہجوم نہیں.... وقت کی تیزی اور انسان کی طراری سے یہ علاقہ دور ہے.... پرسکون، ٹھہرا ٹھہرا اور سرسبز علاقہ ہے۔ یوں لگتا ہے، ہر باسی اپنے گھر چین کی نیند سو رہا ہے۔

"یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے"

"وہ کس کا گھر ہے؟"

"وہاں ایک خاتون رہتی ہے۔"

"تم ہنس کیوں رہی ہو...؟"

"خاتون ذرا بدنام سی ہے۔"

"یہاں بھی کوئی بدنام ہوتا ہے؟"

"ہاں، ہو ہی جاتا ہے۔ دراصل خاتون ہم وطن ہے۔ پہلے شوہر سے ان بن ہو گئی تو دوسرا گھر لے آئی... پھر ایک دن اس کو بھی نکال باہر کیا۔ ایک بچہ ہے۔ ایک گھر ہے۔ ایک موٹر ہے۔ موٹر بھی خود چلاتی ہے اور گھر بھی...!"

"لوگوں کو کیا اعتراض ہے؟"

"اپنا آپ بھی چلاتی ہے۔"

"تو اس محلّے میں رنگ آجاتا ہوگا؟"

"ہم وطن شاکی رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ یہاں دھندا کیوں کرتی ہے؟"

"اور دھندے کے لیے کونسی جگہ موزوں ہے؟"

"وہ کس کا گھر ہے؟"

"ایک ہم وطن جوڑا رہتا ہے۔"

"تم پھر ہنس رہی ہو؟"

"نہیں تو، رو رہی ہوں۔ کیونکہ یہاں عورتوں کے حقوق کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔ یہ جو مرد ہے نا، بدا طوار ہے۔ روز رات کو پی کر آجاتا ہے اور اپنے ساتھ روز نئی دُخترِ فرنگ بھی لے آتا ہے۔ بیوی کہاں تک صبر کرتی۔ ایک رات جب پیتے ہوئے ساتھ رقیب کو لیے ہوئے گھر آیا تو بیوی نے دھکّے دے کر باہر نکال دیا۔ تھوڑی سی ہاتھا پائی کے بعد شوہر بیوی پر حاوی ہو گیا۔ اب کے اس نے دھکّے دے کر بیوی کو گھر سے نکال دیا اور اندر سے دروازہ بند کر کے گوری کے ساتھ سرگرمِ عمل ہو گیا.... بیوی نے طیش میں آکر پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس فوراً حرکت میں آگئی اور آپ جانتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔ ویسے

بھی یہاں کی پولیس صرف حرکت میں آنے کے لیے ہے۔ بیوی نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پولیس کے آگے پھوڑے۔ جو فریادیں وہ اپنے والدین تک نہ پہنچا سکتی تھیں، پولیس والوں کو سنائیں۔ پولیس فوراً میکہ بن گئی۔ عین موقع پر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ جس عالم میں شوہر صاحب برآمد ہوتے، وہ ان کی مزاج پرسی کا غیبی بہانہ بنا۔ پولیس انھیں ساتھ لے گئی۔ حوالات میں مہمان رکھا۔ ناک سے لکیریں نکلوائیں۔ دوسرے دن بھیجا تو شوہرِ نامدار کے مزاج ٹھکانے آچکے تھے۔ اور آج تک ٹھکانے ہیں۔ شنید ہے کہ اب بیوی کے پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں۔ پانی سے نہیں... بیئر سے...“

اے کاش ایسی میکہ صفت پولیس ہمارے دیس میں بھی ہوتی...

”وہ کس کا گھر ہے؟“

”وہاں بھی ایک فراڈی رہتا ہے۔“

”وہ کیسے...؟“

”پاکستان سے ایک خوب صورت لڑکی کو بیاہ کر لایا تھا۔ یہاں لاکر اس پر تشدد کرنے لگا۔ حبسِ بے جا میں رکھا۔ اور اس پر ظلم یہ کہ روز رات کو اوباشوں کی ایک ٹولی گھر میں لے آتا تھا اور بیوی کو مار پیٹ کر کہتا تھا۔ ان کی تواضع کیا کرے۔ وہ غریب رو رو کر زندگی کے دن پورے کر رہی تھی کہ اس کا ایک رشتہ دار آگیا۔ اور اسے کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر واپس لے گیا۔

شوہر نے بعد میں طلاق بھجوا دی۔ آج کل پاکستان سے ایک اور لڑکی بیاہ کر لایا ہے...

قصہ ختم ——

ایک لڑکی کا، یا سب لڑکیوں کا ——

”وہ لڑکی کون ہے؟“

”ایک بچی کی ماں ہے۔“

”میں نے کب یہ پوچھا...؟“

”تو کیا پوچھا ہے؟“

”منہ اٹھائے کدھر جا رہی ہے؟“

”اپنے بوائے فرینڈ کو ملنے...“

”اور بچی کی ماں...؟“

”یہاں سب چلتا ہے... یہ خاتون اپنے شوہر سے چھٹکارا پا چکی ہے اب ایک غیر ملکی سے دوستی لگا لی ہے۔ گھر والے منع کرتے ہیں، اس لیے ڈرائیونگ سیکھنے کے بہانے چھپ چھپ کے اس سے ملنے جاتی ہے۔“

”یہاں بھی ایسا ہوتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا...؟ جہاں رکاوٹ ہوگی، پرنالہ اپنی جگہ بنا لے گا۔“

”اور کیا ہوتا ہے یہاں...“

”مسلمان لڑکیاں بوائے فرینڈ بناتی ہیں۔ باقاعدہ ڈیٹ کرتی ہیں۔ جہاں چاہیں شادی کر لیتی ہیں۔“

”والدین منع نہیں کرتے؟“

”یہاں والدین کو کوئی کیا سمجھتا ہے۔“

روسیاہی مفت:

یہاں آپس میں معاشقے بھی بہت ہوتے ہیں۔ شادیاں بھی ہوتی ہیں اور شادیوں کی وہی آن بان ہوتی ہے جو پاکستان میں رواج ہے۔ مہندی۔ بارات۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ولیمہ۔ جہیز۔ بری ... لین دین سب ویسا ہی

جو کوئی یہاں آتا ہے وہ اپنے رشتہ داروں کو ضرور بُلا لیتا ہے۔ اس واسطے یہاں محلّے کے محلّے رشتہ داروں کے آباد ہو گئے ہیں۔

ہم نے پوچھا۔

اس کی وجہ کیا ہے ؟

تو جواب ملا کہ یہاں کی حکومت اپنے شہریوں کو سب سے زیادہ سہولتیں دیتی ہے۔ کسی کا کوئی آسرا نہ ہو تو اسے الاؤنس ملتا ہے۔ بیمار بن کے چھٹی لی جائے تو تنخواہ نہیں کاٹی جاتی۔

علاج مفت ــــــ

بچّے کی تعلیم مفت ــــــ

بے کاری الاؤنس الگ ــــــ

ناچاقی الاؤنس بھی ــــــ

اس پر ہمیں ایک بہت پرانا لطیفہ یاد آ گیا۔ یہ لطیفہ بھی ہمیں مرزا حوادث بیگ نے سنایا تھا۔ ایک بار ایک پٹھان کسی غیر ملک میں چلا گیا۔ جا کر حلوائی کی دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گرما گرم مٹھائی بنتے دیکھی تو رال ٹپکنے لگی مگر جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ بہت دل کو سمجھایا۔ مگر دل نہ مانا۔ آخر حلوائی کے پاس گیا اور مختلف قسم کی مٹھائی تلوا کے کھانے لگا۔ جب کھا چکا تو حلوائی نے پیسے مانگے۔ اس نے سادگی سے بتا دیا کہ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ تب وہ حلوائی اسے شہر کے کوتوال کے پاس لے گیا۔ کوتوال نے سب حالات سننے کے بعد کہا۔ چونکہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اس لیے اسے سزا دی جائے گی۔ اس کا مُنہ کالا کر کے اسے گدھے پر سوار کر دو۔ اس

کے گلے میں جوتیوں کا ہار ڈال دو۔ پھر ڈھول نقاروں کے ساتھ اسے سرحد پار کرا دو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوگوں نے اس کا مُنہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا۔ شہر کے بچے تالیاں بجاتے ہوئے پیچھے چلے

جب وہ اپنے ملک کی سرحد میں داخل ہوا تو لوگوں نے آ کر پوچھا :

بھائی وہ کیسا ملک ہے جہاں تم گئے تھے ؟

اُس نے اپنی زبان میں جواب دیا

وہ بہت اچھا ملک ہے۔ کیونکہ وہاں ...

حلوہ خوردن مفت ــــــ

سواریٔ مرکب مفت ــــــ

بینڈ باجا مفت ــــــ

فوجِ طفلاں مفت ــــــ

روسیاہی مُفت ــــــ

ایک انٹرویو :

"آپ کے ہاں کیا رواج ہے ؟"

"ہمارے ہاں الزام تراشی کا رواج ہے۔"

"کیسا عالم رہتا ہے عام طور پر ــــــ ؟"

"شک کا عالم رہتا ہے"

"کیسا شک ــــــ ؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"لوگ ایک دوسرے کی نیت پر شک کرتے رہتے ہیں۔"

"لوگوں کا دل پسند مشغلہ کیا ہے....؟"

"نصیحت کرنا۔"

"اور خود کیا کرتے ہیں....؟"

"میاں فصیحت بن کے رہتے ہیں۔"

"لوگوں کی من پسند خوراک کیا ہے....؟"

"چُغلی۔"

"اگر میسّر نہ ہو تو....؟"

"جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔"

"عام طور پر لوگ کیا ناپسند کرتے ہیں....؟"

"ہمسائے کی ترقی۔"

"لباس کونسا پسند کرتے ہیں....؟"

"جو دوسری دفعہ نہ پہننا پڑے۔"

یہ انٹرویو نہیں ہے۔ ہمارے خیالوں کی آمد ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہماری سہیلی نے ہمیں بتایا کہ یہاں سے ایک شام کا اخبار نکلتا ہے۔ اس کے رپورٹر سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں۔ انھوں نے اسے ہماری آمد کی اطلاع دے دی ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں وہ آپ سے ملنے آئے گا اور از قسم انٹرویو کوئی بات کرے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ بڑا تیز و طرار آدمی ہے۔ خواتین کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہم نے کہا۔ یہ تو مردانگی نہیں ہے۔ ویسے ہمارے ہاں تو خواتین کے بخیے ادھیڑنے کا پُرانا رواج ہے۔ گو ہم سارا دن گھوم پھر کے بہت تھک چکے تھے مگر مسٹر جان سے ملنے کے لیے تازہ دم نظر آنے کی

کوشش کرنے لگے۔ نیچے ڈرائنگ روم میں آئے تو ایک لمبا چوڑا ——— بے ڈھنگا سا آدمی بیٹھا تھا۔ اس قدر باتونی کہ بغیر سگنل کے ہی شروع ہو گیا۔ اس کی زبان میں ایک غیر محسوس سی لکنت تھی۔ ہم نے پہلے مرحلے ہی میں بھانپ لیا اس واسطے تیز تیز باتیں کرتا تھا اور مخاطب کو وار کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔

"اچھا تو آپ سیاحت کی غرض سے آئی ہیں؟" بڑے مضحکہ خیز انداز میں طنزیہ پوچھا۔

"جی محترم! آپ کو کوئی اعتراض..؟"

"کن کن ملکوں سے ہو کر آ رہی ہیں؟"

"سعودی عرب، روم، پیرس، امریکہ، کینیڈا.... اور اب برطانیہ۔"

"ہوں تو برطانیہ آپ کو کیسا لگا؟" برطانیہ کہتے وقت اس کا چہرہ تن گیا...

"برطانیہ ہم ایک بار پہلے بھی آئے تھے... برطانیہ ہمیں لگا نہیں کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ مطلب سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ صرف اپنی باتوں کے جواب حاصل کریں۔"

"ظاہر ہے پہلے میں آپ سے برطانیہ کے بارے میں آپ کے تاثرات پوچھوں گا..."

"اپنے تاثرات ہم چند لفظوں میں نہیں بتا سکتے۔"

"چلیے یہی بتا دیجیے جتنے ممالک آپ گھوم کے آئی ہیں، ان میں اور برطانیہ میں کیا فرق ہے؟"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"مسٹر جان!" ہم نے ٹوکا "آپ کبھی برطانیہ سے باہر گئے ہیں؟"

"ہاں صرف ایک بار دفتر کے کام سے ہالینڈ گیا تھا۔"

"اسی لیے دنیا کے نقشے پر آپ کو صرف برطانیہ بڑا بڑا دکھائی دیتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ باہر جائیں۔ اللہ کی اتنی بڑی دنیا دیکھیں..."

"کیوں آخر..." وہ رعونت سے بولا۔

"اس کا جواب ہمارے پاس نہیں مگر ہم آپ کو ایک لطیفہ سناتے ہیں۔ ایک اونٹ تھا۔ اسے اپنی اونچی کوہان پر بڑا ناز تھا۔ اپنے قد آور ہونے پر وہ بڑا اترایا کرتا تھا۔ جنگل کے چھوٹے موٹے جانوروں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ریت پر چلتا تو اپنے قدموں کے بھدے نشان نہیں دیکھتا تھا۔ ہمیشہ اوپر... تھوتھنی اٹھا کے آسمان کی جانب دیکھا کرتا تھا۔ دور و نزدیک اپنے سے بلند کوئی شے ہی نظر نہ آتی تھی۔ اپنے آپ کو آسمان کا نزدیکی ہمسایہ سمجھنے لگ گیا تھا۔ ایک دن اتفاق سے کسی نخلستان میں جا نکلا.... اور چلتے چلتے ایک لمبی کھجور کے درخت تلے کھڑا ہوا تو اس کا برخوردار معلوم ہوا۔ نظر اٹھا کر اس نے کھجور کے طویل قامت درخت کو دیکھا۔ ٹھنڈی سانس چھوڑی اور شرمندگی سے گردن جھکا لی اور بولا "سچ ہے جب تک کوئی اونٹ کھجور تلے نہ آئے اپنی اصلیت نہیں جان سکتا۔"

پتہ نہیں اسے ہمارے لطیفے کی سمجھ آئی یا نہیں۔ فوراً بات بدل ڈالی اور سیاح خواتین کی ہنسی اڑانے لگا۔ بولا۔

"سیاحت کرنا عورت کا کام نہیں۔ عورتیں بھلا کیا دیکھنے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ انھیں سیاحت کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔ بس مارے فیشن کے دنیا دیکھنے نکل آتی ہیں۔ آخر گھروں میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟"

"مسٹر جان!" ہم نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"سیاحت کے شوق میں آپ جیسے عجوبے بھی تو نظر آتے ہیں نا؟"

ہماری بات ان سنی کر کے بولا:

"میرے خیال میں سیاحت ایک فضول شوق ہے۔ میں سیاحت کا قائل ہی نہیں ہوں۔"

"مسٹر جان! آپ کو معلوم ہے ہم نجوم کا علم جانتے ہیں۔"

اس کی قینچی جیسی زبان کو روکنے کا ایک ہی حربہ تھا ہمارے پاس۔

"اچھا..." اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"اور ہم آپ کو اس وقت بتا سکتے ہیں کہ آپ عورتوں میں ہرگز ہردلعزیز نہیں ہیں۔"

"او میرے خدا...." اس نے چونک کر ہمیں دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا لیا "یہ تو آپ نے تقریباً ٹھیک کہا۔ مگر آپ کو اتنی جلدی اس بات کا اندازہ کیسے ہوا؟"

"ہم اپنے دیس کے مجذوب ہیں۔" ہم نے کہا "ہم سے دعا لینے کی کوشش کیجیے۔"

"اچھا۔" وہ کچھ پلپلا سا ہو گیا۔

"ہاں... اور آپ شادی پر یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے شادی کر کے کسی لڑکی کی زندگی برباد نہ کیجیے گا۔ شادی اور سیاحت میں بڑا فرق ہوتا ہے... اور آپ دونوں کے اہل نہیں ہیں۔"

تھوڑی دیر کے لیے مسٹر جان کی سانس اوپر کی اوپر اور تلے کی تلے رہ گئی۔ کھسیانے سے جواب دینے کے بعد وہ بیمار مرغ کی مانند گردن لٹکا کر بیٹھ گیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

پھر ہماری سہیلی نے حسبِ روایت اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اچھی اچھی باتیں کر کے اس کا جی بہلانے کی کوشش کی حتیٰ کہ رات کے کھانے کے لیے روک لیا۔ کھانے کے دوران جان پھر چہکنے لگ گیا تھا جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ صبح سے بھوکا تھا۔ پھر جب ہم نے سلاد کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شروع ہو گیا۔

"میں رات کو سلاد کھانا بالکل پسند نہیں کرتا.... سلاد امریکیوں کا کھاجا ہے اور باقی قومیں ان کی ریس میں سلاد کھا جاتی ہیں۔" پھر وہ ہنس ہنس کر تفصیلی طور پر بتانے لگا کہ سلاد پیٹ میں جا کر کیا کیا کارروائیاں کرتا ہے۔ اگرچہ ہم طب کے بعض اصولوں سے واقف تھے مگر اس وقت کھانے کے آداب محلِ نظر تھے۔ اس لیے ہم نے کھانے کی میز پر ایسی کثیف گفتگو کرنے سے پرہیز کیا۔ صرف انگریزی بولنے سے تو آدمی عالم نہیں بن جاتا۔ جب اچھی طرح ڈٹ کے کھانے کے بعد جان اُٹھ کے جانے لگا تو پھر بولا۔

"آپ نے ہمارے ملک کے بارے میں اپنے تاثرات بیان نہیں کیے...؟"

"یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ بڑے نفیس ہیں۔ سُلجھے ہوئے ہیں۔ سب سچ ہے مگر اپنے دل کی گرہ نہیں کھولتے..."

عین، غین:

دوسری صبح ہم سے دو یورپین خواتین ملنے آ گئیں جس سے ہمیں یہ جانتے دیر نہ لگی کہ ہماری سہیلی زہرہ جبیں نے اپنی دوست نوازیاں یہاں بھی جاری رکھی ہوئی ہیں۔ ایک خاتون

کا نام این تھا اور دوسری کا غین.... خیر غین تو نہیں تھا.... اپنی آسانی کی خاطر یہ نام ہم نے خود ہی رکھ دیا تھا۔ دوسری کا نام ایلس تھا۔ مگر ہم اسے غین ہی لکھیں گے.... دونوں ایک سکول میں استانیاں تھیں۔

اس روز برمنگھم فورڈ کی صبح بہت زرد تھی۔ کہر اور دھند میں ملفوف.... ہم نے ان کے لیے کافی بنائی۔ انھوں نے حسبِ معمول گفتگو کا آغاز موسم سے کیا۔ مگر پھر بات ہم پر اور ہمارے ملک پر آ کر ٹھہر گئی۔ ہم نے بھی موقع غنیمت جان کر بہت سے تلخ و ترش سوالات کر دیے جن کے جواب میں انھوں نے دو چار پتے کی باتیں کیں جو ہمارے دل میں اتر گئیں۔ شاید اپنے لوگوں کی سمجھ میں بھی آ جائیں۔ اس لیے یہاں لکھے دیتے ہیں۔

این کہہ رہی تھی۔

"ہمارے اسکولوں میں آپ کے بچے بھی پڑھتے ہیں اور ہمیں اسکولوں میں بعض اوقات بہت مشکل پیش آتی ہے کیونکہ ہم پاکستان کی تہذیب، پاکستان کے مذہب اور پاکستان کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جب ہم یوروپ کی تاریخ یا تہذیب کے بارے میں بچوں کو پڑھاتے ہیں تو پاکستانی بچے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک اور اپنی تہذیب کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ وہ تفاوت اور تضادات پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی میراث اور اساس کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔ شاید اپنی میراث اور اساس پر فخر کرنا چاہتے ہیں یا الگ نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں مگر افسوس ایسے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے تجسس کی آگ بجھانے کے لیے ہمارے پاس معلوماتی کتابیں نہیں ہوتیں اور نہ ہم آپ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں اس لیے ہم خالی خولی باتوں سے انھیں ٹرخا دیتے ہیں۔ آپ کے سفارت خانے اتنا نہیں کر سکتے کہ پاکستان کی تاریخی اور

تہذیبی کتابیں انگریزی میں چھپوا کر اسکولوں میں مفت تقسیم کرا دیں۔ ہم خود یہ کتابیں پڑھیں۔ آپ کے بچوں کو پڑھنے کے لیے دیں۔ اس لاعلمی کا نقصان آپ کے بچوں کو ہوتا ہے۔ وہ دوغلے بن جاتے ہیں۔ اسکولوں میں ہماری تعلیم ہماری تہذیب کے مطابق ہے۔ گھر میں نیم خواندہ مائیں ان پر اپنا کلچر ٹھونستی ہیں۔ اس لیے آپ کے بچے بکھرے اور عدم تحفظ کا شکار نظر آنے لگتے ہیں۔"

تب ہم سوچتے رہ گئے کہ پینتیس چھتیس سالوں میں تو آدمی ادھیڑ عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ ہماری سفارتیں اس قابل کیوں نہ ہو سکیں۔۔۔۔؟ دوسری بات بھی قابلِ غور ہے جو غین نے کہی۔

غین نے اپنی چند ماہ کی بچی کو اپنے گھٹنوں پر بٹھایا ہوا تھا۔ گھٹنا ہلاتی جاتی اور باتیں بھی کرتی جاتی۔ بولی۔

"اس بچی کی ولادت پر مجھے ہسپتال جانا پڑا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بہت سی پاکستانی خواتین بچے کی ولادت کے لیے ہسپتال میں داخل ہوتی ہیں اور وہ انگریزی زبان سے نابلد ہوتی ہیں اس لیے وہ نرس یا ڈاکٹر کی ہدایت پر کان نہیں دھرتیں۔ نہ اپنی تکالیف کا اظہار کر سکتی ہیں۔ ہسپتال کے اصولوں کا احترام بھی نہیں کرتیں۔ اس لیے ان سے بے شمار غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جس پر وہ نرسوں اور ڈاکٹروں سے باقاعدہ ڈانٹ کھاتی ہیں۔ ان کی ہٹ دھرمی اور جہالت دیکھ کر ہسپتال کا عملہ ان کی پرواہ نہیں کرتا اور وہ بعد میں عملے کو کوستی نظر آتی ہیں۔ اب جب وہ یہاں رہنے کے لیے آ ہی گئی ہیں۔ اور ان کو یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے تو وہ تھوڑی سی محنت کر کے ہماری زبان کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔ ہمارے ملک میں رہتی ہیں۔ ہمارے ملک کا کھاتی ہیں۔ پھر ہماری زبان سے نفرت کیوں کرتی ہیں۔۔۔!"

ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہم نے زہرہ جبیں کی

طرف دیکھا۔ اس نے بھی نظریں جھکا لیں۔ اور یہ تو ہم خود پچھلے چار دنوں سے دیکھ رہے تھے کہ میرپور کی خواتین میرپوریوں والے انداز میں رہتی ہیں۔ کوٹلی لوہاراں والے ایسے رہتے ہیں جیسے کوٹلی لوہاراں میں ہوں۔۔۔۔ چکوالیوں کی اپنی شناخت۔۔۔ جہلم اور سرگودھا والوں کے اپنے رنگ۔۔۔۔ پنڈی ہزارہ والوں کا وہی انداز۔۔۔۔ نیم خواندہ اور ناخواندہ خواتین اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش بالکل نہیں کرتیں۔ ان گھروں میں اپنے انداز کے مطابق رہنا چاہتی ہیں اور انگریزی محاوروں کو بگاڑ کے ایک عجیب گنگا جمنی سے زبان انھوں نے ایجاد کر لی ہے۔ آدمی جہاں رہتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کر کے وہاں کی زبان تو سیکھ ہی لیتا ہے۔

این اور غین کے دونوں اعتراضات اپنی جگہ درست تھے مگر ہم لوگ آسانی سے اپنی غلطی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم نے حسبِ عادت جوابی حملہ کر دیا یہ کہہ کر کہ:

"یہاں تو پاکستان کی بے شمار لیڈی ڈاکٹرز آئی ہوتی ہیں۔ آخر ہسپتال والے اردو بولنے والی خواتین کی خاطر پاکستانی نرسیں اور ڈاکٹرز کیوں نہیں رکھ لیتے جبکہ یہاں اردو بولنے والوں کے محلّے کے محلّے آباد ہیں۔ ایک دو ڈاکٹرز یا نرسیں رکھ لینے میں کیا مضائقہ ہے۔۔۔۔"

اس بات پر وہ دونوں ایک دم سے شرمندہ سی نظر آنے لگیں۔ غین کی بچی رونے لگی تھی۔ اس نے ہم سے معذرت کی اور کونے میں بیٹھ کر اسے دودھ پلانے لگی۔

"آپ بھی۔۔۔۔" ہم نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ کہنے لگی۔

"جدید ریسرچ نے ثابت کیا ہے۔ دنیا میں ماں کے دودھ سے بڑھ کر کوئی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

شے نہیں۔ بچہ ستر بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے"

ہم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

لوگو! یہ ستر بلاؤں والا ٹوٹکا تو ہمارے ہاں سے چلا تھا۔ یہ واپس وہاں کب جائے گا...؟

حاصلِ سفر:

بریڈفورڈ میں ہمارے ساتھ عجیب و غریب سلوک ہوا۔ یوں تو لوگ ملنے آتے۔ سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ثواب کے طور پر درویش کو کھانا بھی کھلاتے مگر تلخ سوالات کے اتنے بھاری بھاری پتھر ہماری طرف پھینکتے کہ ہمیں اپنے ننھے سے سر کو بچانا مشکل ہو گیا۔ یوں لگتا جیسے انھیں زمانے بھر کے گلے شکوے صرف ہماری ذات سے ہی نکالنا ہیں۔ ہم نے بہتیرا کہا۔ ہم تو جوگی ہیں... بنجارے ہیں ہماری معصوم سی ذات انتہائی بے ضرر ہے۔ یونہی قلم کا اکتارا بجاتے ہوئے اس اندھیر نگری میں آ گئے ہیں ؎

کاٹنے کو ایک شب ٹھہرے ہیں تیرے شہر میں
کیا بتائیں صبح ہو گی تو کدھر جائیں گے ہم ؟

تب ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ہمیں یہاں صرف چار دن رُکنا تھا..... ورنہ پتہ نہیں ہم واپسی کے قابل رہتے کہ نہیں۔

مختلف قسم کے لوگوں سے اظہارِ خیال کر کے ہمیں ایک بات کا اندازہ ہوا۔ کہ برطانیہ میں محنت کشوں کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو افواہوں پر یقین رکھتا ہے اور سیاسی بساط کے وہ پٹے ہوئے مہرے جو ذاتی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دے کر یہاں آ بسے ہیں اور آتے ہوئے قومی دولت بھی لوٹ کھسوٹ کر لائے ہیں اور

یہاں بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ نوکروں کی فوج بھی ساتھ لائے ہیں۔ دن کو ایک بیان داغ دیتے ہیں اور رات کو وہسکی اور بیئر سے اپنا غم غلط کرتے ہیں۔ وہ ان کو اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں ایسے احسان فراموش لوگوں کو یہ باسی سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور بی جمالو بی بی سی کو معتبر جانتے ہیں اور ہم جیسے گدڑی پوشوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہاں یہ دستور بن چکا ہے کہ اپنی نگری سے جو بھی آئے، اس پر تیر برسائے جائیں۔ تاہم ہمیں ان کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ اس لیے مزید رُکنے کا ارادہ ترک کر دیا اور صاف کہہ دیا ؎

میں فلسفی نہ پیغمبر کہ راہ بتلاؤں
ہر ایک شخص مجھی سے سوال کرتا ہے

جاتے ہیں خُدا حافظ:

سفر کا ایک اپنا کرب بھی ہوتا ہے اور پھر آخری پڑاؤ پر جیسے ہمت جواب دے جاتی ہے۔ منزل قریب آتی جائے تو اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ یہ ہمارا آخری پڑاؤ پر آخری دن تھا۔ اس کے بعد وطن عزیز جانا تھا۔ اس لیے بچے بے طرح یاد آ رہے تھے اور بچوں کا باپ بھی ایک ایک لمحہ قیامت کا لمحہ بن رہا تھا۔ اس پر بھاری بھاری سوالات بریڈفورڈ کی فضا بھی آج بدلی بدلی تھی۔ یہاں کی فضا بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ دنیا بھر کے معشوقوں نے متلوّن مزاجی برطانیہ کے موسم سے سیکھی ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ برطانیہ کا موسم ہرجائی شوہر کے مزاج جیسا ہے.... گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ.... کبھی کچھ.... کبھی کچھ۔

آج ہمیں بازار جانا تھا۔ برٹش ایئرویز کے دفتر بھی جانا تھا۔ بہت سے ادھورے کام نمٹانا تھے مگر سارا دن ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی لیکن یہ زمستانی

KUDISTAN.BLOGSPOT.COM

ہوا کس قدر سفاک ہے؟ اس کا اندازہ بھی ہمیں آج ہی ہوا۔ ہم بہاولپور کی گرمی کو ہنس کر سہہ لیتے ہیں مگر ایسی یخ بستہ، بے حس اور بیدرد ہوا کے تھپیڑے اپنے کلیجے پر نہیں سہہ سکتے۔

بہرحال کام تو سارے آج ہی کرنا تھے۔

کمرے میں لپٹی ہوئی روشن رات دریچوں کے باہر سردی سے سکڑتی جا رہی تھی۔ دریچے کے شیشوں پر ٹھنڈا پسینہ آکر ٹھہر گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آس پاس ہُو کا عالم ہے۔ ہم اپنے کمرے میں آکر دریچے کے آگے کھڑے ہو گئے اور کافی دیر تک وہاں کھڑے ہو کر سنسان سڑک اور زینہ زینہ نیچے اترتی ٹھنڈی رات کو دیکھا۔ پھر اپنے پاس پھیلے ہوئے سامان کو دیکھا جسے آج سارا دن کی دوڑ دھوپ کے بعد جمع کیا تھا اور ہمیں بچپن میں پڑھا ہوا وہ شعر یاد آ گیا ؎

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

ہم نے کمر باندھی اور سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ سامان تھا بھی کیا.. گھر سے چلتے وقت ہمارے بچوں نے فرمائشوں کی ایک فہرست ہمارے ہاتھوں میں تھما دی تھی۔ وہی کھلونے۔ وہی گھروندے....

اپنے طویل سفر میں ہمیں اگر کوئی چیز یاد تھی تو وہ یہی فہرست تھی۔ امریکہ، کینیڈا، پیرس، ہر جگہ گھومتے ہوئے بچوں کی چیزیں خریدنے کا خیال آیا تھا مگر پھر خیال آیا کہ آخری پڑاؤ سے خریدیں گے کیونکہ ان ملکوں میں اپنا اعمالنامہ (سامان) اپنے کندھوں پر ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ آج سارا دن ہم نے اپنے بچوں کے لیے شاپنگ کی تھی۔ آخری پڑاؤ پر بجٹ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اس لیے کچھ عزیزوں اور پیاروں کے لیے تحائف بھی خرید لیے تھے۔ ہم نے

یہ ساری چیزیں اکٹھی کر کے ایک بیگ میں بند کر لیں۔ ہمارے بچوں نے چلتے وقت یہ تقاضا کیا تھا کہ ..."امی آپ ہماری چیزیں ہاتھ میں پکڑ کر جہاز سے اتریں تاکہ ہم جہاز سے اترتے ہی وصول کر لیں۔"

ماں بچوں سے تھوڑا عرصہ دور رہی ہو تو ہر طرح سے تلافی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بچوں کے تحائف کا بیگ الگ کر کے رکھ دیا کہ اسے ہاتھ میں پکڑ کر ہی اتریں گے۔

صبح سفر درپیش تھا۔ اس لیے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کبھی تو جی کی بے قراری اتنا تنگ کرتی کہ جی چاہتا ابھی صبح ہو جائے اور کبھی اس خوف سے پلک نہ لگتی کہ اگر صبح نیند نہ کھلی اور ہم سوتے رہ گئے تو کیا ہوگا....؟ سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور شیشوں پر لٹکتی ہوئی قطار اندر قطار بوندیں باہر کے کہر آلود عمل کو ظاہر کر رہی تھیں۔ نیند کسی ضدی بچے کی طرح روٹھ گئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے ہمیں گھر سے نکلے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں اور صدیوں قرنوں سے لمبی یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی۔ کچھ جاگتے، کچھ سوتے اور کچھ خواب دیکھتے رات کو تمام کیا۔ بلکہ رات کے ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور صبح کا اندازہ کر کے فجر کی نماز پڑھ لی۔ علامہ اقبال کا وہ مشہور شعر یوں تو ہم نے سینکڑوں بار پڑھا ہوگا مگر آج پڑھنے کا نرالا ہی لطف آیا ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

واہ واہ کہتے جاتے اور بقیہ سامان سمیٹتے جاتے۔

پروگرام تو یہ تھا کہ صبح دس بجے زہرہ جبیں اور ان کے شوہر ہمیں لے کر لندن کے لیے روانہ ہوں گے اور بارہ ایک بجے لندن ایئرپورٹ پر پہنچ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جائیں گے۔ جبکہ ہماری فلائٹ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو تھی۔

مگر ہم سفر میں کچھ زیادہ ہی احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لیے نور کے تڑکے خود بھی اُٹھ گئے اور گھر والوں کو بھی جگا دیا اور پھر سات بجے صبح ہم گھر سے نکل کے لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم نے بریڈ فورڈ کو الوداع کہا پورا شہر دھند اور کُہر کے لحاف میں منہ چھپاتے پڑا تھا۔ گھروں کے باہر شبنم میں نہائی موٹریں اونگھ رہی تھیں اور سب گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ کیونکہ اس روز ہفتہ تھا اور چھٹی کی صبح ان ملکوں میں اپنی مرضی سے آتی ہے۔ یہ "بدنصیب" تو اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ کیسا مہان مہان بریڈ فورڈ سے رخصت ہو رہا ہے۔ ورنہ کھڑکیاں دروازے کھول کر، ہاتھ ہلا ہلا کر، پھول پھینک پھینک کر خدا حافظ ضرور کہتے....

خیر ہم نے انھیں نشہ آور نیند سے بیدار کرنا مناسب نہ جانا۔ پہلے ہی ہم زہرہ جبیں اور ان کے شوہر کے خلوص کے آگے شرمندہ شرمندہ سے تھے کہ اس نفسا نفسی کی نگری میں انھوں نے بڑے پیار سے رکھا اور اب خود جہاز پر سوار کرانے کے لیے لندن لے کے جا رہے تھے۔ بے شک دوستی ایک انمول جذبہ ہے۔

چونکہ آج چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے "موٹروے" بالکل صاف تھی۔ اِکّا دُکّا موٹریں ہی نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ یہ سڑک تو سدا سہاگن ہے۔ اس روز جب ہمارا نیم خوابیدہ ڈرائیور ہمیں بریڈ فورڈ لا رہا تھا۔ اس کی لڑکھڑاتی ڈرائیونگ کی وجہ سے ہم اس سڑک کا نظارہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے آج ہر نظارہ بیدار تھا۔ ہم نے برطانیہ کی اصلی صبح کو باقاعدہ طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔ کہر اور دھند کی چادر کو چاک کر کے سورج نے یوں بادلوں سے مُنہ باہر نکالا جیسے اُونٹ

بدو کے خیمے میں گھس آیا ہو.... راستے روشن ہو گئے مگر بادلوں کے کنارے ابھی سرمئی تھے۔ سرمئی بادلوں اور سُنہرے سورج میں جنگ آخر وقت تک جاری رہی۔ کبھی تو سورج کا پلّہ بھاری ہو جاتا اور سنہری روپہلی شعاعیں سانولے سلونے بادلوں پر تھرکنے لگتیں... اور کبھی سیاہ بادل سورج کے دمکتے چہرے پر اپنا وحشی چہرہ رکھ دیتے۔ ایسے نظارے تو اس زمین پر بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔

برطانیہ کے مضافات اپنی صاف و شفاف شکل میں نظر آ رہے تھے.... سڑکیں آ رہی تھیں۔ سڑکیں جا رہی تھیں۔ ——— نظارے آنکھوں کے آگے سے فلمی سکرین کی طرح سرک رہے تھے۔ اونچی نیچی پہاڑیاں، پُل، خوبصورت موڑ، سرسبز روشیں برابر ہماری توجہ کھینچ رہے تھے۔ مگر ہمیں بس ایک ہی دُھن تھی کہ کسی طرح لندن پہنچ جائیں۔ ایک اور بات کا اندازہ ہوا ہمیں.... کہ برطانیہ میں امریکہ کی طرز کی فلک بوس عمارتیں نہیں ہیں کہ جن کو دیکھ کر کلیجہ دہلنے لگتا ہے امریکہ میں جب ہم بلند و بالا عمارتیں دیکھتے تو اکثر سوچا کرتے کہ "آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں....؟"

اور اگر ہم برطانیہ میں ہوں تو سوچا کرتے ہیں کہ "آخر یہ لوگ کیا ہیں؟" نہ جانے کیوں برطانیہ میں آتے ہی ہمیں اس رشوت خور سرکاری افسر کا خیال آنے لگتا ہے جو اپنی ملازمت کے دوران لُوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھتا ہے۔ مٹھی بھی گرم رکھتا ہے اور دل کو بھی گرماتا ہے۔ اولاد پیدا کرتا ہے۔ جائیدادیں بھی بناتا ہے۔ مگر جب ضعیفی کی عمر کو پہنچتا ہے تو جمع شدہ روپیہ مہلک بیماریوں پر خرچ ہونے لگتا ہے اور بال بچے آنکھیں پھیر لیتے ہیں.... برطانیہ نے جوانی جیسی بھی گزاری ہو، اب اپنے بڑھاپے میں ہے۔ ع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اللہ کے فضل سے ہم اپنے مقررہ وقت سے ٹھیک تین گھنٹے پہلے ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے۔

پروازمیں کوتاہی :

الاماں جونہی ہم ڈیپارچر ایئرپورٹ میں داخل ہوئے یوں معلوم ہوا ہم کسی بین الاقوامی چڑیا گھر میں آگئے ہیں۔ ہم نے اتنے ملک گھومے، مگر ایسی منظم بدنظمی کہیں نہیں دیکھی۔ ہر قومیت کا انسان، ہر ملّت کا باشندہ اس وقت وہاں نظر آرہا تھا۔ ہر کوئی افراتفری میں، اضطراب میں، جانا ہے، چلو، بھاگو، دوڑو کوئی رہ نہ جائے، بچے، بوڑھے، نوجوان، عورتیں، مرد۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ سب کو بس اپنے اعمالنامے (سامان) کی فکر جیسے روزِ محشر ہر کوئی اپنا اعمالنامہ اٹھائے ایک خاص سمت کو رواں ہوگا.... ریستوران خلقت سے بھرے ہوئے.... غسلخانوں میں بھیڑ۔ لاؤنج اٹے پڑے ہیں... راہداریوں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ سیڑھیوں میں ہجومِ ٹرالیاں بھری ہوئی ہیں۔ سامنے مختلف ایئرلائنوں کے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔ خواتین فرشتوں کی طرح براجمان ہیں۔ ہر مسافر کو اس وقت کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں ہی نجات دہندہ نظر آرہی ہیں۔

یہ شور، یہ رونق، یہ بدنظمی اور یہ چیخم دھاڑ ہم نے بس لندن ایئرپورٹ پر ہی دیکھی ہے۔ یوں لگتا ہے یہ لاؤنج کبھی مسافروں سے خالی نہیں ہوتا۔ ایسے جیسے یہ ایئرپورٹ (ہیتھرو) مکوڑوں کا بل ہے۔ ذرا پانی ڈال دو تو بل سے لاتعداد، ان گنت مکوڑے نکلے چلے آتے ہیں۔ جونہی ٹرالی پر اپنا سامان گھسیٹتے ہوئے ہم لاؤنج میں داخل ہوئے، ہمارے پسینے چھوٹنے لگے۔ اتنی خلقت

میں شناسا کوئی نہ تھا۔ ہمارے اندر یک بیک تنہائی کا احساس جاگ اٹھا۔ یکایک دنیا کی بے ثباتی کا خیال آگیا۔ جس شخص کو دیکھو چہرے پر تردّد کے آثار نمایاں... ہم نے اس نقارخانے میں طوطی بننے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ چونکہ وقت سے پہلے آگئے تھے۔ اس لیے وقت سے پہلے چیک اِن کر کے اندر چلے جانا چاہتے تھے۔ برٹش ایئرویز کے کاؤنٹر پر جاکر دست بستہ عرض کیا۔

"یہ سواری بادِ بہاری یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

خاتون نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

"جائیے بیگانہ رسمِ وفا ہو جائیے.... آپ کو روکنے والے ہم کون۔ جبکہ ایک جاتا ہے تو دس آجاتے ہیں۔"

سامان تلواتے ہوئے ہمارا دل برابر دھک دھک کیے چلا جارہا تھا پھر جی کے اندر ایک سانپ نے سر اٹھایا۔ یہ تو دنیا کی چوکی ہے۔ ذرا سا سامان بھاری ہے... وہاں.... جہاں قدم قدم پر چوکیاں ہیں۔ وہاں کیا کرے گی۔ ہم نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا....

ہر کسی کے چہرے پر وہی کیفیت تھی۔

ہر ایک کا اعمالنامہ بھاری تھا۔

سامان چیک اِن کروا کے اپنا بورڈنگ کارڈ لے کر ہم نے اطمینان کی ایک طویل سانس کھینچی۔ پھر اپنے میزبانوں کی طرف دیکھا۔

آیا ان کی تسلی ہوگئی ہے یا نہیں۔

وہ بڑے مطمئن نظر آرہے تھے۔

ہماری ہر نگاہ کہہ رہی تھی۔ اب بھی وقت ہے۔ ہمیں روک لیجیے... مگر ان کی ہر ادا کہہ رہی تھی "حافظ خدا تمہارا..."

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ویسے انھوں نے ازراہِ عنایت ہم سے کہا۔

"آپ نے صبح سے صرف ایک پیالی چائے کی پی ہے۔ فلائٹ میں کافی وقت ہے۔ آپ کچھ کھالیں۔"

ہم نے گھڑی دیکھی۔ ابھی پونے دو گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ برطانیہ میں غم بہت کھایا ہے۔ ویسے آپ کہتے ہیں تو کچھ اور بھی کھا لیتے ہیں سچی بات ہے برطانیہ کے مزاج کی طرح ہمیں یہاں کی خوراک بھی پسند نہیں۔ زہر مار کرنا اور بات ہے۔"

بہرحال ہم ریستوران کی جانب چلے۔ اتنی بھیڑ میں ریستوران تک پہنچنا بھی مرحلہ لگ رہا تھا کیونکہ جب بدقت تمام سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے برطانیہ میں کال پڑ گیا ہے اور پوری رعیت کی زندگی کا انحصار بس اسی ریستوران پر ہے۔ ایک راہداری جو ہمیں دوسری طرف لے جاتی تھی، اس کا منظر تو دیدنی تھا۔ گلی میں بہت سے سردار جی پاؤں پسارے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے بیگ پکڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں چہرے سُرخ تھے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ ہم نے کراچی ایئرپورٹ کے باہر لوگوں کو گٹھڑیوں اور صندوقوں کے ساتھ لمبی تانے سوتے اور گھر بساتے تو دیکھا ہے۔ مگر یہاں لندن ایئرپورٹ پر بھی وہی منظر دیکھ کر جی خوش ہُوا۔ وہاں ایسی بُو تھی جس سے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ ہم نے اپنے میزبانوں سے کہا۔ "ہماری حالت پر رحم کریں اور کھانے کا خیال چھوڑ کر یہاں سے چلیں۔۔۔۔"

انھوں نے کہا۔ دوسرے ریستوران میں چلتے ہیں۔ امید انسان کو ہمیشہ متلاشی رکھتی ہے۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے ہم دوسری طرف نکل گئے۔ دوسرے

ریستوران کے اندر پہنچ کر ہمارے قدم زمین نے پکڑ لیے۔ سروس کاؤنٹر پر اتنی لمبی لائن تھی جیسے ہمارے ہاں پنجابی فلم کے پریمیئر پر ہوتی ہے۔ ہم اپنا تھیلا اور پرس اٹھا کر ایک طرف دبک کر کھڑے ہو گئے۔

ہم ایک بار پھر اپنے تھیلے کی وضاحت کر دیں۔ آپ نے بچپن میں ایک کہانی سنی ہو گی۔ ایک جادوگر تھا جس کی جان ایک طوطے میں تھی۔ تو حضورِ عالی! اس وقت ہماری جان اس تھیلے میں بند تھی۔ نگر نگر کے نوادرات، بچوں کے کھلونے، جوگیوں والی نشانیاں۔۔۔۔ ایک مکمل سفرنامہ۔۔۔۔ ایک مکمل مسودہ (جو امریکہ کے ماحول پر لکھ ڈالا تھا) اور کتب و رسائل۔۔۔۔ جو کچھ کہ اس تھیلے میں بھر سکتے تھے، بھر لیا تھا۔۔۔۔ اور اس سب سے قیمتی پونجی کو سینے سے لگائے پھر رہے تھے۔ گو بچوں کے کھلونوں کی وجہ سے یہ تھیلا کافی وزنی ہو گیا تھا۔ مگر ہم نے اسے دوسرے سامان کے ساتھ چیک اِن نہیں کروایا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ ہر چور اُچکے کی نگاہ اس تھیلے پر ہے۔ ہمارے ہاتھ سے کوئی چھین نہ لے۔ اس اندیشے کے تحت جب کوئی ہمارے قریب سے گزرتا تو ہم جھٹ سے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لپٹا لیتے۔ آخر کار لوگوں نے ہمیں کم اور تھیلے کو زیادہ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

کھڑے کھڑے ہمارے پاؤں دُکھ گئے۔ رنگ برنگے لوگوں کی بھانت بھانت کی بولیاں سُن سُن کر ہم تھک چکے تھے اور اب بیہوش ہو کر گرنے والے تھے۔ کہ ہمارے میزبان ٹرے اٹھائے ہماری جانب آتے نظر آئے۔ وہی چائے اور برگر۔۔۔۔ برگر تو خیر ہم کھا ہی نہیں سکتے۔۔۔۔ اور یہ کالی کڑوی چائے پینا بھی ہمارے بس کا روگ نہ تھا کیونکہ ہمیں گوری عورت اچھی نہیں لگتی مگر گوری چائے بہت اچھی لگتی ہے۔ اتنے میں ایک میز سے کچھ لوگ اٹھ کر گئے تو ہم نے دوڑ کر سٹولوں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں بیٹھنے کا یہی انداز ہے۔ یہ اسٹول بالکل سیاسی کرسی

PUBLISHED BY BLOGSPOT.COM

کی مانند ہیں۔ کوئی نہ کوئی نظریں جمائے کھڑا رہتا ہے۔ ذرا کی ذرا آپ اٹھے اور اسٹول گیا۔ ہماری طرح اور بھی لوگ لپکے تھے مگر ہماری لپک میں جھپک بھی تھی۔ اس لیے اسٹول پر ہمارا قبضہ ہو چکا تھا۔ بیٹھے تو جان میں جان آئی۔ یوں لگا صدیوں سے کھڑے ہیں اور صدیوں تک کھڑے رہیں گے اور یہیں پر ہمارے پوتے ہمیں سلام کرنے آجائیں گے.... ہم نے بدمزہ برگر کو دو تین بار کاٹا.... اور پھر کالی کڑوی چائے کو گھونٹ گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگے۔

مائیکروفون پر موٹی اور پتلی آوازوں میں پروازوں کی اطلاع بہم پہنچائی جا رہی تھی اور مارے بدحواسی کے ہمارے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

ہم نے اپنے میزبانوں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے خلوص سے ہمارے ساتھ ساری سردردی اور تھکاوٹ برداشت کر رہے تھے۔ ہم تھیلا پکڑ کے ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور بہت لجاجت سے کہا۔

"بہت ہو چکا آپ کی میزبانی کا امتحان۔ اب ہمیں اللہ کے سپرد کر کے جائیے..."

ہم نے اپنے ضروری کاغذات نکالے اور اس دروازے کی طرف قدم بڑھائے جس میں داخل ہونے کے بعد ہمارا ناطہ پیچھے والوں سے ٹوٹ جانا تھا۔ اس وقت چاروں دروازوں میں اتنا زیادہ رش تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جنگ کا بگل بج چکا ہے اور ساری رعیت لندن سے باہر جا رہی ہے.... اسی آخری دروازے پر ہم نے اپنے میزبانوں کو خلوصِ دل سے دعا دی کہ اللہ آپ کو جنم جنم خوش رکھے۔ فقیروں کا بہت ساتھ دیا آپ نے۔ انھیں خدا حافظ کہا۔ اب آگے ہم کو تنہا جانا تھا۔

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

اک بھاری تھیلے کے سوا اس وقت ہمارا ہمسفر کوئی نہ تھا۔ تھیلے کو سینے سے لگایا اور تیز تیز بھاگنے لگے تو روک لیے گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ مسافروں کی آخری چوکی ہے یہاں پہ اپنی روانگی کی یقین دہانی کرانا ضروری تھی۔ کارڈ لے کر پُر کیا اور اس بھیڑ بھی لائن میں سب سے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔

بیرونی ملکوں کے سفر میں وہی کرنا چاہیئے جو آپ کے آگے کھڑے ہوئے لوگ کر رہے ہوں۔ ہمارے آگے ایک کالی میم اور کالا صاحب کھڑے تھے۔ ہم نے اونٹ کی طرح سر آگے کر کے بڑے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ لوگ کس جہاز سے کہاں جا رہے ہیں؟"

سوچا جس طرح لودھراں سے سمہ سٹہ جاتے ہوئے شناسائی پیدا ہو جاتی ہے، شاید اس طویل سفر میں ان کی ہمسفری میسر آجائے۔ مگر انھوں نے ہماری بات پر کان ہی نہیں دھرا۔ انھوں نے ہاتھوں میں جو کارڈ پکڑے ہوئے تھے ابھی تک وہ بھی پُر نہیں کیے تھے۔ ہم نے پھر کہا۔

"آپ نے کارڈ کیوں نہیں پُر کیے...." انھوں نے خالی خالی نظروں سے ہماری جانب دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں مشورہ مفت دینے کا رواج ہے" خیر یہ تو پتہ چل گیا وہ بھی اناڑی تھے.... ہماری طرح پہلی بار ملک سے باہر آئے تھے... یہاں سے فارغ ہو کر ہم نے کوئین لاؤنج کا پتہ پوچھا۔ سوچا اس میں قدم رنجہ فرمانے کی حسرت ساتھ نہ لے جائیں۔ کیونکہ فلائٹ میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا اور یہ ایک گھنٹہ وہاں پہ بیٹھنے کا ہمیں حق تھا۔ عجلت میں ایک ایئر ہوسٹس سے پتہ دریافت کیا تو اس نے ایک راہداری کی طرف اشارہ کر دیا۔ سفر میں تو غریب الدیار بس اشاروں کے غلام ہوتے ہیں۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو کاؤنٹر پر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بیٹھی مُسی مُسی میم نے ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھا۔۔۔۔ بخدا ہم جیلے سے اُٹھائی گیرے بالکل نہیں لگ رہے تھے۔ غالباً وہ ہمارے تھیلے کو دیکھ رہی ہوگی، جسے ہم نے اس طرح کلیجے سے لگا رکھا تھا جس طرح ماں اپنے بچے کو لگاتی ہے۔ اس کی مزید تسلی کے لیے ہم نے اپنا بورڈنگ کارڈ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اور اپنی فلائٹ کے بارے میں پوچھا۔ بورڈنگ کارڈ دیکھ کر وہ یوں مسکرائی جیسے جنم جنم سے ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔ بڑی مروّت سے جہاز کا وقت بتایا۔ اور صوفے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

ہم نے تشریف رکھنے سے پہلے اپنے نازک کندھوں کو بھاری کوٹ کے بوجھ سے آزاد کیا۔ تھیلا ٹانگوں کے قریب کھسکایا اور براجمان ہو گئے۔

پھر حسبِ عادت اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگے۔ وہاں پہلے سے کئی مسافر بیٹھے تھے اور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ ہمیں بچپن میں مضمون نویسی پر ہمیشہ انعام ملا کرتا تھا اور ایک شعر ہم ہر مضمون میں زبردستی ٹھونس دیا کرتے تھے۔ وہی شعر بے اختیار یاد آنے لگا ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

حقیقت میں یہ لاؤنج ایک ٹھنڈے تالاب کی مانند ہے۔ جہاں اُڑتے ہوئے پرندے آتے ہیں۔۔۔ لمحہ بھر کو رُک کر سستاتے ہیں۔۔۔۔ پیاس بجھاتے ہیں۔۔۔ اور پھر آگے کو چل دیتے ہیں۔۔۔۔ مسافر آ رہے تھے۔ جا رہے تھے۔۔۔۔ استفسار کر رہے تھے۔ ٹی۔وی دیکھ رہے تھے۔۔۔ کھا پی رہے تھے۔۔۔۔ گورے کھاتے کم اور پیتے زیادہ ہیں۔ ایک گورا کافی دیر سے ٹیلیفون بوتھ میں سر دیئے اپنی جانِ تمنا کو جانے کیا کیا یقین دہانیاں کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ بھی برابر کہے جا رہی تھی ؎

غیر کے سنگ ویری رات جگائی
موسے کہے تیرے بنا نیند نہ آئی

(خیر یہ شعر ہم نے اپنے پاس سے جڑ دیا ہے)

ہم نے دریا دلی سے سوچا۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا چڑیا گھر ہے اور یہ گورے خواہ کسی سرزمین کے ہوں۔۔۔۔ رنگ اور چال ڈھال سے ایک سے لگتے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان پر مسلسل غور کرنا چھوڑ دیا۔ اور ان کی باتوں کی طرف سے کان ہٹا لیے۔ ایک گروہ خالصتاً کاروباری گفتگو کر رہا تھا۔ ہم اس پیاسی چڑیا کی مانند تھے جو تالاب کے قریب پہنچ کر بھی پیاسی رہتی ہے۔ کبھی کبھی شدید بھوک اور پیاس کے باوجود کچھ بھی کھایا پیا نہیں جا سکتا۔ ہمیں شیکسپیئر کے وہ الفاظ یاد آنے لگے۔

"یہ آخری چھلانگ ہے جو لگانا ہے۔ آخری چھلانگ۔"

یہ آخری چھلانگ۔ آخری مرحلہ۔ آخری پڑاؤ تھا۔ ہمارا سفر ختم ہونے والا تھا۔ سیاحی کے بعد اپنے وطن، اپنے پیاروں کے پاس جانا کس قدر خوبصورت لگتا ہے۔ اسے کوئی اکیلا مسافر ہی جان سکتا ہے۔ ہم بار بار انفارمیشن سے اپنے جہاز کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اور چپٹی ناک والی انڈونیشی گوری ہمارے اضطراب اور بے چینی سے لطف لے رہی تھی۔ جانے ہمیں یہ وہم کیوں ہو رہا تھا کہ آج ہم یہیں رہ جائیں گے۔ جا نہ پائیں گے۔ ورنہ ہمارا تھیلا کسی حادثے کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ایک گھنٹہ جو ہم نے اس انتظار گاہ میں گزارا، پورے سفر سے بھاری تھا۔ خدا خدا کر کے بی او اے سی کی فلائٹ نمبر ۲۲۳ کا اعلان ہوا۔ تو ہم دھڑکتے دل کے ساتھ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ جیسے شیرینی میں ڈوبی ہوئی آواز صرف ہمیں دی گئی ہو۔۔۔۔

ہم نے جلدی سے کوٹ کندھوں پر ڈالا۔ اپنا تھیلا اٹھایا اور گیٹ نمبر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

۵۴ کی طرف روانہ ہو گئے۔

گیٹ کے باہر ہمیں ہموطن لائن میں نہیں بلکہ ہجوم میں نظر آئے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہی ہمارا مطلوبہ گیٹ ہے۔ ہماری طرح اور بھی بہت سی خواتین تنہا سفر کر رہی تھیں اور ہماری ہی طرح شکل سے بھی ہراساں دکھائی دے رہی تھیں۔ تلاشی کے مرحلے پر بھی ہم نے تھیلے کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ کرخت گورے نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے خوب ٹٹول کر دیکھا۔ بالآخر اس نے ہمارے تھیلے کا بھید کھول دیا۔ لیگو سیٹ، مکینو، موٹریں..... چھوٹی چھوٹی چیزیں، بڑی بڑی ڈائریاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں....

اور فقیر کی گدڑی سے کیا مل سکتا تھا؟ بن کر بولا۔

"جا بی بی! تو بھی کیا یاد کرے گی۔"

ہم نے زیرِ لب دُعا دی "تیرے بچھڑے جیتے رہیں۔"

اس وقت کی خوشی کا کوئی اندازہ لگائیے جب جہاز میں بیٹھنے کو صرف چند لمحے رہ گئے تھے۔ صرف چند لمحوں کی کسک باقی تھی۔ جہاز کا وقت تین بج کر پچاس منٹ تھا۔ اور اس وقت ساڑھے تین بج رہے تھے۔ کافی دنوں سے کسی ہم وطن خاتون سے اسی انداز میں گپ شپ نہیں لگائی تھی۔ ایک خاتون کو مائل بہ گفتگو دیکھا تو شروع ہو گئے..... اپنے اپنے تجربات و مشاہدات..... وہ بھی امریکہ سے ہو کر آ رہی تھی۔ خیال تھا باتوں میں وقت کا پتہ نہیں چلے گا... پھر جب دو عورتیں گفتگو کر رہی ہوں تو خود وقت ہی تھک جاتا ہے لیکن عورتیں نہیں تھکتیں.... مگر سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ باتیں کرتے کرتے عورتیں تھک گئیں اور جہاز کے اندر جانے کا اذن نہ ہوا۔ سوا چار بجے اور پھر ساڑھے چار بھی ہو گئے... ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ یورپین وقت کے بڑے پابند ہوتے

ہیں۔ امریکہ سے برطانیہ جاتے ہوئے برٹش ایئر ویز والوں نے ہمارے اتنے ناز اُٹھائے تھے کہ زندگی بھر کے لیے جہاز میں ٹک جانے کو جی چاہا تھا۔ اسی لیے ہم نے لندن سے راولپنڈی جانے کا اعزاز بھی انہی کو بخش دیا تھا.... ہم نے حیران ہو کر بار بار کھڑکی دیکھی۔ پھر ایک ہمسفر خاتون سے کہا۔

"پاکستان جاتے وقت شاید یہ ایئر لائن بھی ہمارے انداز اختیار کر لیتی ہے۔"

باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لیے ہم نے پھر لوگوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس فلائٹ کی منزلِ مقصود چونکہ پاکستان تھی اس لیے زیادہ تر مسافر پاکستانی تھے مگر اسے عمان کے راستے سے ہو کر جانا تھا، اس لیے کچھ گورے اور عرب بھائی بھی نظر آ رہے تھے۔ یہاں بی او اے سی کے عملے کا رویہ بڑا درشت اور کرخت تھا۔ ویسے تو ان کے چہروں کی یہ درشتی اور کرختگی اللہ کی دین ہے۔ اس سلسلے میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مسافروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور بچے باقاعدہ احتجاج کرنے لگے تھے۔ گرمئ گفتار کم ہوئی تو کمرے میں گرمی زیادہ ہو گئی۔ ہمیں سوئے جہاز لے جانے والی بس ابھی تک نہ آئی تھی اور ہم زیرِ لب گنگنا رہے تھے ؎

دامنِ امید بھر یا کہہ دے اس قابل نہیں

بارے بس کی نوید ملی..... اور ہم دیارِ غیر سے کوئے یار کو چلے.... بس بھی ایک ہی تھی۔ باری باری سواریاں اٹھا رہی تھی۔ بس کے ڈرائیور کے چہرے پر بھی ویسی ہی کرختگی تھی، جیسے ہم نے اس سے ادھار لے رکھا ہو۔ سیٹوں کے جو نمبر بورڈنگ کارڈ پر درج تھے، جہاز کے اندر مسافروں کو ان کے مطابق نہیں بٹھایا گیا۔ یہ گھپلا ہم نے سارے سفر میں صرف یہیں دیکھا تھا۔ کبھی ایک مسافر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کو اٹھایا جاتا اور اس کی جگہ دُوسرے کو فٹ کیا جاتا اور کبھی کسی جوڑے کو ہلا کر "یک سیٹ" کیا جاتا۔ "نان سموکنگ" والوں کو دھواں دار فضا میں بھیج دیا جاتا۔ اور دھواں دھواں چہرے والوں کو صاف فضا میں بٹھا دیا جاتا.... سب سے آخر میں ایک عرب جوڑا نمودار ہوا۔ ان کی خاطر پھر سب مسافر ہلائے گئے اور اس بار نزلہ ہم پر گرا۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سفر کرنا چاہتے تھے۔ ہم تنہا سفر کر رہے تھے... کہیں بھی بٹھا دیے جاتے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

اس وقت ہمیں صاحب عالم بہت یاد آئے اور بہت خوب یاد آئے۔

اس جوڑے میں ایک انفرادیت تھی۔ بیوی کو انگریزی آتی تھی اور شوہر کو صرف عربی۔ اس لیے ان کے درمیان الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ بیوی ایئر ہوسٹس کو چائے پانی کا آرڈر دے دیتی۔ لیکن شوہر صرف مسکرا کے بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ لیتا۔ ایک بار تو ہمیں شک سا گزرا اور ہم اپنے دل کے ساتھ یہ شرط لگانے پر تیار ہو گئے کہ یہ میاں بیوی نہیں ہیں.... ہر چند کہ شادی محبت کی ہو، میاں بیوی اتنی عاشقی معشوقی نہیں کر سکتے۔ شوہر کی شکل کچھ یتیمانہ سی تھی۔ اس لیے ہم نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ یہ پالتو شوہر ہے اور ایسے شوہروں کو محبت کرنے کی باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بہر حال ہمیں مسلسل بے سکون کرنے کے لیے ان کے پیچھے بٹھا دیا گیا.... اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری نظر اکثر ان کے تخلیے میں گھس جاتی تھی.... اللہ معاف کرنے والا ہے۔

بارے دنیا کی مشہور ایر لائن پاکستان روانہ ہوئی مگر تین پچاس کی بجائے پونے پانچ بجے....

ہم نے اپنا عزیز از جان تھیلا اپنے قدموں کے درمیان رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے تصور میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ اسی وقت طوطے جیسی ناک والا

موٹا سٹیورڈ آ گیا اور بولا۔ "آپ اس تھیلے کو اوپر رکھ دیں"

"اس تھیلے کو ہم اپنی جان سے الگ نہیں کرنا چاہتے اور تم کہتے ہو اوپر رکھ دیں۔ اس میں چار معصوم بچوں کی آرزوئیں اور مامتا کی ماری ماں کی سفر کی گرد ہے۔ اس لیے اسے ع

یونہی قدموں میں پڑا رہنے دیں"

وہ چلا گیا تو ستواں ناک والی تیز و طرار ایئر ہوسٹس آ گئی۔ مسکراہٹ کی چاندی پھینکتی ہوئی بولی۔

"براہِ نوازش اس تھیلے کو اوپر رکھ دیں"

ہم اسے یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ یہ تھیلا بہت بھاری ہے۔ اس لیے کہا "اس میں ہمارا لکھنے کا سامان ہے۔ جس کی پرواز کے دوران ہمیں بہت ضرورت ہو گی۔ اس لیے اسے یہاں رکھنے کی اجازت دی جائے۔"

ہماری بات سن کر مسکرائی اور دلبری کرنے کہیں اور چلی گئی۔

"کیا پئیں گی....؟"

تھوڑی دیر بعد پھر وہ مشروبات کا ٹرے تھامے ہمارے سر پر سوار تھی۔ اس بار ہم نے کچھ بھی پینے سے بالکل انکار کر دیا اور یہ نہ سوچا اس کا نازک سا دل ہمارے انکار سے ٹوٹ جائے گا۔

ہمارے بائیں جانب ایک چینی بھائی بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح کیڑوں مکوڑوں میں مسلسل کچھ لکھ رہا تھا.... ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ پیسہ بنا رہا تھا اور ہم دل جلا رہے تھے.... اس پورے سفر میں کسی ہم سفر سے کوئی بات نہ کی تھی۔ سوچا، آج تھوڑا سا لکھ کے اس چینی بھائی سے باقاعدہ گفتگو کریں گے۔ گو ہمیں چینی زبان نہیں آتی۔ مگر ہمیں چینی کھانے تو بہت پسند ہیں نا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مانا ہم کبھی شنگھائی نہیں گئے۔ مگر شنگھائی ریستوران میں کھانا تو اکثر کھایا ہے۔ زبان نہ آتی ہوگی مگر زبان پر چینی کھانے کا چٹخارا تو ہوگا نا . . . ؟ اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ چینی بھائی نے بھی ہماری طرح پیپسی کولا مانگ لیا تو ہمارا جی باغ و بہار ہوگیا۔ یہ ہمسفر ہم پیالہ بھی تھا۔ ہم نے دیسی کھانے کا آرڈر دیا تھا اور اب دیکھنا چاہتے تھے کہ ہم نوالہ بھی ہے یا نہیں۔ ہم نے کن اکھیوں سے دو چار بار چینی بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی تھیں اس لیے وہ ہماری طرف کن اکھیوں سے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ویسے چینی قوم خوش قسمت قوم ہے۔ ان کی عمر کا اندازہ ان کے چہرے یا جسم کی ساخت سے نہیں لگایا جاسکتا۔ ہم نے سوچا اتنی جلدی کیا ہے۔ بہت طویل سفر ہے۔ ایک رات بھی ہے بیچ میں یہ بھی اپنے نوٹس لکھتے لکھتے تھک جائے گا اور ہم بھی " روداد غم عشق " رقم کرتے کرتے نڈھال ہوجائیں گے۔ تب کسی طرح بات چیت کا آغاز کریں گے۔ ہم نے سوچوں کی نگری سے سر اٹھایا تو جام ارغوانی کی سبیل لگ چکی تھی۔ اک اک کو دیکھتے ہوئے اک اک کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک ہماری نگاہ آگے بیٹھے ہوئے عرب جوڑے کے تخلیے میں الجھ گئی۔ خاتون اپنا انگوٹھیوں بھرا ہاتھ پالتو شوہر کے زانو پر رکھ چھوڑا تھا اور دونوں جام تھامے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو پی رہے تھے۔

" اللہ کرے ان کا ہنی مون جہاز میں ہی ختم ہوجائے۔"

ہم نے دل سے دعا دی۔

کہتے ہیں کہ عورتیں حاسد ہوتی ہیں۔ بھئی ہم کیوں کسی سے حسد کریں۔ کسی بھی شے کی زیادتی بدہضمی کا موجب بن جاتی ہے۔ ہم تو انھی کے بھلے کو کہہ رہے تھے۔ جب جام سر چڑھ کر بول چکے تو پھر کھانا سرو ہونا شروع ہوا۔ پہلے کورس

کی ٹرالی آرہی تھی اور اسے وہی طوطے جیسی ناک والا سٹیورڈ گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ ٹرالی کی آواز سن کر ہم نے آخری چند فقرے لکھے تاکہ پین اور ڈائری بند کرکے رکھ دیں اور اپنا ٹرے آگے بچھالیں کہ ایک دم یوں محسوس ہوا کہ چیل جھپٹ کر ہماری طرف آئی اور قدموں میں جھک گئی۔ جب تک ہم چونکے، موٹا سٹیورڈ لپک کر ہمارا تھیلا اٹھا چکا تھا۔ ہم نے احتجاج میں زبان کھولی تو بڑی مروت سے بولا۔

"میں اس تھیلے کو آگے کیبن میں رکھ دیتا ہوں۔ کھانا کھانے کے دوران آپ کو تکلیف ہوگی۔ جب آپ ضرورت محسوس کریں گی میں پھر اٹھا کے دے دوں گا۔"

ابھی ہم اپنی بے اعتبار سانسوں کو ترتیب دے کر جواب نہ دے پائے تھے کہ وہ تھیلا سامنے رکھ کے آبھی گیا اور پھر مسکرا کر انکساری سے بولا۔ " پریشان نہ ہوں۔ تھیلا بالکل محفوظ ہے اور اسے آپ کو دینا میری ذمہ داری ہے۔"

ہم اپنی بوکھلائی صورت پر یقین کا اجالا بکھیر کر یوں مسکرائے جیسے ہمیں اس کی بات کا یقین آگیا ہو۔ اور یقین کیسے نہ آتا۔ جہاز کے اندر ہمارے ناز اٹھانے کی قسمیں ہر ایئر لائن کھاتی ہے۔ یہ تو یہاں تک کہتے ہیں جہاز کے اندر آپ اس طرح محفوظ و مامون ہیں جس طرح ماں کے بطن میں بچہ

تو اب کس بات کا ڈر تھا؟ ہم فضا میں تھے۔ ہمارا سامان ہمارے ساتھ تھا۔ ان کا دستور ہے کہ کوٹ اور چھتری ہاتھ سے لے لیتے ہیں اور بڑے پیار سے الماری میں لٹکا دیتے ہیں۔ تھیلے اور چرمی لفافے پکڑ لیتے ہیں اور جاتے وقت یوں مسکرا کے کورنش بجا لا کے تھماتے ہیں جیسے ہم نے ان پر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اعتماد کر کے ان کی سات پشتوں کو خرید لیا ہو.... تھیلے کا فکر ہمارے ذہن سے نکل گیا اور خوش رنگ سلاد دیکھ کر ہمیں یاد آیا کہ ہم تو صبح سے بھوکے ہیں... سو اس پر پل پڑے۔ باری باری پانچ قسم کا سلاد آیا۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ گھاس قسم کی چیزیں اس قدر مزے دار ہوتی ہیں۔ کھاتے کھاتے ہم نے سوچا چینی بھائی سے تو بات ہوئی نہیں اور وہ بھلا مانس بھی پلیٹ پر یوں جھکا ہوا تھا جیسے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو....

کھانے کے بعد سہی ہم نے سوچا.... بھوک کی آگ دونوں طرف ہے برابر لگی ہوئی

کھانے کے بعد دو قسم کا میٹھا آیا۔ مگر ہم اپنا کوٹہ پورا کر چکے تھے۔ اس لیے صرف پھل پر قناعت کی اور وہ بھی انگور....

بھئی تقریباً سارے مسافر انگور کی بیٹی کو نوازتے رہے تھے۔

کیا ہمارا حق سبز رنگ کے کسیلے انگوروں پر بھی نہ تھا....؟

کھانے کے بعد ہم نے پھر ڈائری نکال لی اور اپنی بقیہ یادداشتیں جلدی جلدی لکھنے لگے۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ وطن کی حدود میں داخل ہو کر ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔ ایک تو ویسے ہی خلقت ہمیں ہار پہنانے کو ٹوٹ پڑے گی۔ آخر تن تنہا اتنے ملکوں کا سفر کر کے آنا کوئی چھوٹی سی بات تو نہ تھی۔ ویسے بھی راولپنڈی سے ہمیں فوری طور پر دوسرا جہاز لاہور کے لیے پکڑنا تھا اور ہمیں معلوم تھا۔ لاہور جاتے ہوئے ہم صرف اپنے دل کی بے قابو دھڑکنوں کو ہی سُن سکیں گے۔ کچھ بھی نہ لکھ سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ کوشش کی تو بس اتنا ہی لکھ پائیں گے ؎

مشتاقی وصبوری از حد گزشت یارا
گر تو شکیب داری طاقت نہ ماند مارا

"آپ اس انہماک اور تسلسل سے کیا لکھ رہی ہیں؟"

جہازی پری نے ایک دم وارد ہو کر ہمیں اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ٹرالی پر اشیائے فروخت لیے کھڑی تھی۔ خوشبوئیں، کولون، سگریٹ، تمباکو وغیرہ وغیرہ جی میں آیا کہہ دیں۔

"اس وقت ہمیں تنگ نہ کرو۔ ہم الفاظ کے نگینے پرو رہے ہیں اور یہی تحفہ ہم دوستوں کے لیے لے جانا چاہتے ہیں۔"

مگر وہ ہمیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور کچھ متاثر بھی لگ رہی تھی

"آپ جب سے جہاز میں بیٹھی ہیں، مسلسل لکھ رہی ہیں.... ظاہر ہے خط تو اتنا طویل نہیں ہو سکتا جبکہ ہمیں ایک فقرہ لکھنا بھی مصیبت لگتا ہے پھر آپ بتائیں آپ کون ہیں اور کیا لکھ رہی ہیں....؟"

"ہم کون ہیں...؟"

ایک دم ہم فضاؤں سے بھی اونچے اڑنے لگے۔ جی میں آیا کہہ دیں "بی بی! تو کیا جانے کہ ہم کون ہیں؟ ہم اقلیم قلم کے شہنشاہ، تخیل کے جہان کے جہاں پناہ.... الفاظ کے سوداگر... معانی کے پروفیسر.... خوابوں کے جادوگر.... محاوروں کے شہ زور اور.... اور... گفتار کے غازی ہیں..."

مگر کسرِ نفسی نے زبان نہ کھولنے دی۔ اگر ادھر اُدھر سے کوئی ہم وطن بول اٹھتا کہ "ہم تو آپ کو پہچانتے تک نہیں"... تو پھر کیا عزت رہ جاتی۔

ہم جواباً مسکرائے تو وہ گھائل ہو گئی۔ ہم نے پرس کھولا تو وہ پائیل ہو گئی۔ یعنی ہمارے قدموں میں بیٹھ گئی.... گوری موم ہو جاتی ہے اگر آپ کے پاس رقم کی آگ ہو۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہم نے سوچا خوشبوئیں خرید لیں۔ خوشبو ہماری کمزوری ہے۔

پھول کی ہو ——

گفتگو کی یا ——

شخصیت کی ——

خوشبو بیچنے کے بہانے وہ ہمارے قدموں میں بیٹھی ہماری "خوبصورت گفتگو" سے لطف اٹھاتی رہی.... ہم نے محبت اور شادی کے موضوع کو شروع کر کے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا اور کامیاب ازدواجی زندگی کے چند ٹوٹکے بتانے کی جسارت کی تھی اور ساتھ ہی حضرت آدم کے ابلیلے سپوت کی جبلتوں پر روشنی ڈالنے کی سعی کی تھی....

بس اس نے تو ہمارے "گوڈے" پکڑ لیے۔

تب ہمیں احساس ہوا کہ وہ محض ایک عورت ہے... عورت، عورت ہی ہوتی ہے۔ فضاؤں میں میزبانی کرے یا تنور میں روٹیاں لگائے.... سی این ٹاور پر ملازمت کرے یا چکی میں آٹا پیس رہی ہو.... اس کی منزل گھر ہے۔ وہ کسی وفا شعار دل میں رہنا چاہتی ہے..... اور اس دل سے صبح و شام یقین دہانی کی تمنا ہوتی ہے... اس کے دل میں بھی کہیں اپنے گھر اور اپنے بچے کی آرزو پڑی لوَدے رہی تھی....

اس غریب نے ہمارے ساتھ بہت وقت ضائع کیا تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا صاحبِ عالم کے لیے تمباکو کے ڈبے اور خوشبوئیں خرید لیں۔ اسی تمباکو کے سہارے انھوں نے ہجر و فراق کی لمبی گھڑیاں گزاری ہوں گی۔ اور اگلے سفر کا سامان ہم ابھی سے انھیں دے دیں جا کر..... جب تک رسمِ شناسائی مکمل ہوتی، جہاز میں اعلان ہو گیا کہ تھوڑی دیر بعد ہم عمان کے ہوائی اڈے پر

اترنے والے ہیں.... مسافروں نے پیٹیاں کس لیں۔ بتیاں جل اٹھیں۔

عمان کے ہوائی اڈے پر مسافروں کو اترنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر جہاز اپنے مقررہ وقت سے زیادہ دیر وہاں کھڑا رہا۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ ہمارا اچینی بھائی اتر کر جا رہا تھا۔ افسوس اس سے گفتگو کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ مرحوم اللہ کا نیک بندہ تھا... اچھی خاصی خاتون ساتھ بیٹھی رہی۔ مگر نظر اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ نہ کر سکا.... اللہ اس کے درجے بلند کرے آمین! اور تو اور۔ ہمارے آگے بیٹھا ہوا عرب جوڑا بھی اتر گیا۔ یعنی اس نیم تاریک فضا میں جو فلم چل رہی تھی، وہ بھی ٹوٹ گئی۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ پچھلی تین راتوں سے ہم بالکل نہیں سوئے تھے اور اب بھی سونے کی کوشش کرنا لاحاصل تھا۔ جب ہم نے اس چنبیلی کی کلی کو بتایا تو جلدی سے سر درد کی ایک گولی اور پانی لے آئی۔ پھر ایک کالی پٹی دے کر بولی "آنکھوں پر چڑھا کر آرام کیجیے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اور اب لکھنا بند کر دیجیے۔"

ہم اس کی میٹھی باتوں اور ہوش رُبا مسکراہٹ سے اتنے سرشار ہوئے کہ واقعی گولی کھا کر آنکھوں پر پٹی چڑھا لی..... اور سر کرسی کی پشت سے لگا لیا.... بس وہی غفلت کی گھڑی تھی.... وہی.....

نگاہِ بد تاک میں کھڑی تھی تیری محبت کا درد چھینے!
ذرا جو غفلت میں آنکھ جھپکوں تو لے اُڑے یاد کے نگینے

ذرا سی دیر کو آنکھیں بند کرنے سے سر کا درد جاتا رہا۔ اسی وقت جہاز نے پرواز کے لیے پر پھیلائے۔ ہم نے جلدی سے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا.... تھوڑے سے مسافر اترے تھے مگر جہاز کا سارا "کرو" بدل گیا تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

موٹے سٹیورڈ کی جگہ دبلا پتلا سا سٹیورڈ ناشتے کی ٹرالی لا رہا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھیں زبردستی کھول کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ارے بھائی۔ ہمارا وہ تھیلا تو لا دینا۔۔۔"

"کون سا تھیلا۔۔۔۔؟"

"تجھ سے پہلے تیرے ہم زاد نے یہاں سے اٹھایا تھا اور ہمارے سامنے وہاں آگے کیبن میں رکھ دیا تھا۔ کہتا تھا جاتے ہوئے دے کر جاؤں گا۔ شاید بھول گیا۔ اب تو لا دے کہ ہم یہ خوشبوئیں، تمباکو اور ڈائری اس میں رکھ کے اس کو پھر سینے سے لگا لیں کہ ہمیں آس پاس بچوں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔"

ہمارے ہوش اُڑنے کا وہ منظر بھی دیدنی تھا۔ جب اس نے آ کر بتایا کہ جہاز میں ہمارا تھیلا نہیں ہے۔

"تو کہاں گیا۔۔۔۔؟ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ جہاز کے اندر سے کوئی سامان اُٹھا کر لے جائے۔"

"ہوا تو کبھی نہیں۔۔۔۔" اس نے کہا۔

"پھر آج ایسا کیوں ہوا ہے۔ کیا "کرو" اترتے وقت سارا سامان آپ کے حوالے نہیں کرتا۔۔۔"

"کرتا ہے۔"

"پھر کون لے گیا وہ تھیلا۔۔۔۔؟"

ہمیں چلاتے دیکھ کر اس نے ٹارچ اٹھائی اور جہاز کا کونا کونا دیکھنا شروع کر دیا۔

یہ دنیا کی مشہور و معروف ایر لائن ہے اور اس طرح مسافروں کے سامان کی حفاظت کرتی ہے۔

اور سامان بھی کیا۔۔۔۔ ماں کی دعائیں، بچوں کی آرزوئیں، راتوں کا سوز، دنوں کا گداز۔۔۔۔۔ یہ کرشمہ سازی کچھ برٹش ایئر ویز والے ہی کر سکتے ہیں کہ ہاتھ سے سامان کا تھیلا لیکر صاف مکر جائیں اور بے مروتی سے کہہ دیں کہ "آپ اپنا سامان ساتھ نہ لائی ہوں گی۔" وہ کسی مجبور ماں کے دُکھ اور کرب کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ہم نے گھڑیاں گن گن کر دن بتائے تھے۔ ایک ہی جست میں واپس پلٹ جانے کو جی چاہ رہا تھا۔۔۔۔ اپنے بچوں کی خوشیاں دوبارہ خریدنے کے لیے۔۔۔۔ اپنی کتابوں کے صفحے کھوجنے کے لیے۔۔۔۔۔

جہاز اپنی پوری رفتار سے راولپنڈی کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد راولپنڈی ایر پورٹ پر ایک دل گرفتہ، اداس اور تھکی تھکی ماں برٹش ایئر ویز والوں سے کہہ رہی تھی ؎

مسرتوں کی طلب میں جو گھر سے نکلا تھا
اسی کے حصے میں آئیں اداسیاں بھی بہت

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM